ہماری آزادی

ابوالکلام آزاد
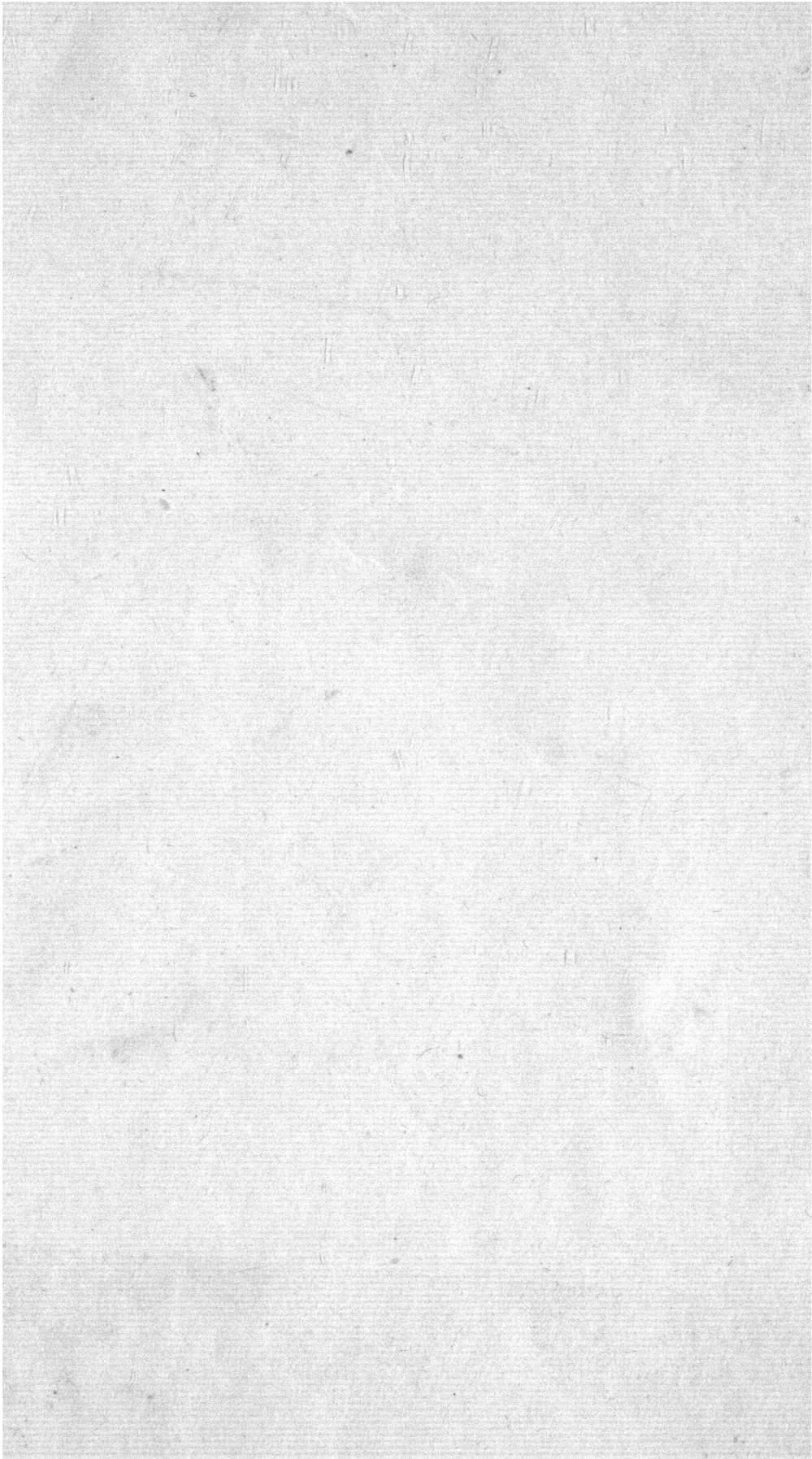
ہماری آزادی

ایک تاریخ جو آپ بیتی بھی ہے

ابُوالکلام آزاد

مترجمہ

محمّد مُجیبؔ

اورینٹ لونگ مینس

بمبئی ، کلکتہ ، مدراس ، نئی دہلی ،
حیدرآباد ، پونہ ، احمد آباد ، بنگلور
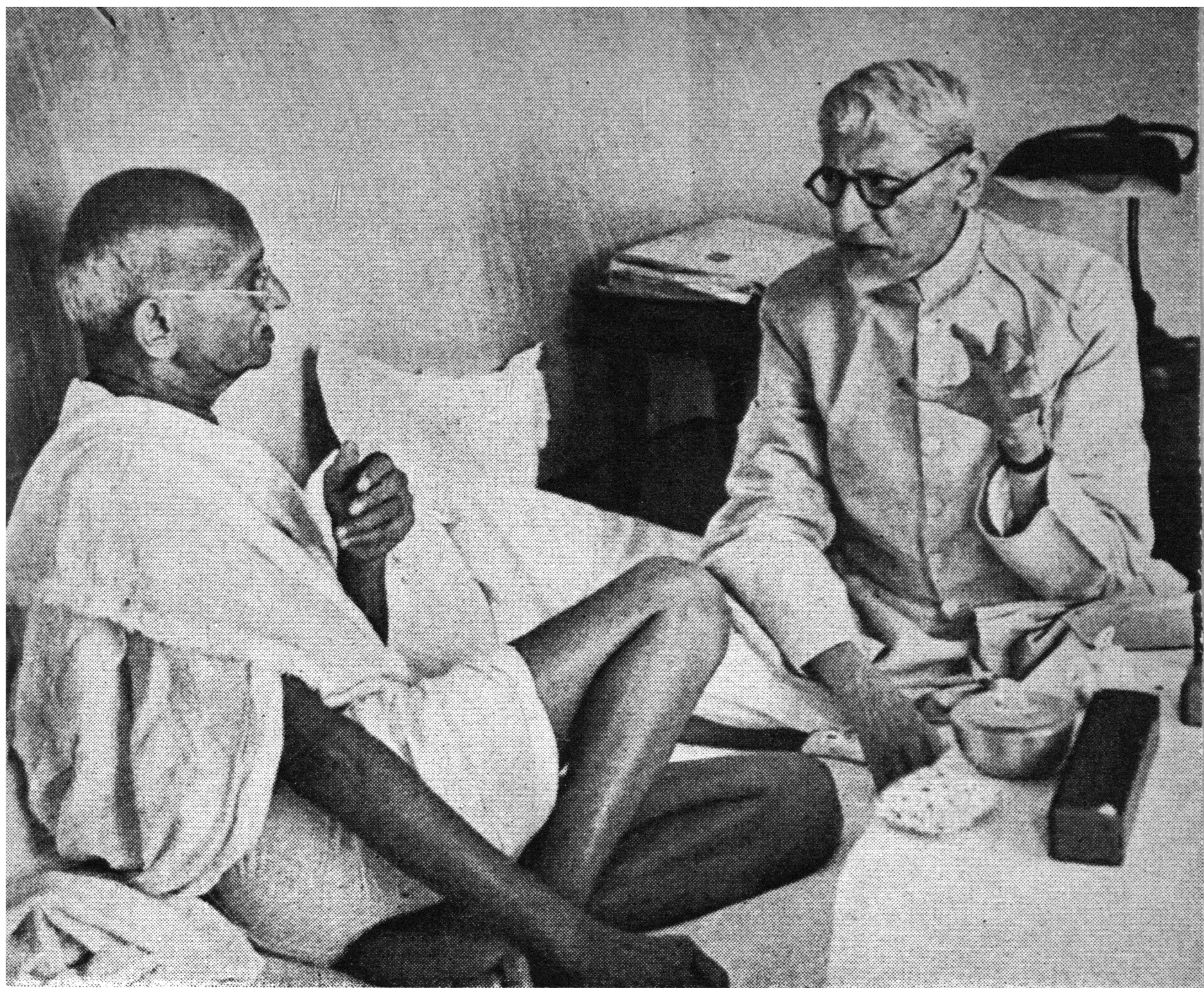
گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۴۶ء).

دوست اور ساتھی

جَوَاہِرلال نہرو

کے لئے

اورینٹ لونگ مینس پرائیویٹ لمیٹیڈ
۱۷ چترنجن اوینیو ، کلکتہ ۱۳
نکل روڈ ، بیلارڈ اسٹیٹ ، بمبئی ۱
۳٦ A ماؤنٹ روڈ ، مدراس ۲
کینسس ہاؤس ، ۲٤/۱ آصف علی روڈ ، نئی دہلی ۱
گن فاونڈری روڈ ، حیدر آباد ۱
۱۷ ناظم الدین روڈ ، ڈھاکہ
۳۷۳_۳۷٤ نارائن پیٹھ روڈ ، پونا ۲
شاہ پور روڈ ، احمد آباد ۱
۱۷ووڈ اسٹریٹ ، شولے ، بنگلور

لونگ مینس گرین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ
٦ اور ۷ کلی فورڈ اسٹریٹ ، لندن ، ڈبلو ۱
اور
نیو یارک ، ٹورنٹو ، کیپ ٹاؤن ، اور میلبورن

طباعت
انگریزی ایڈیشن پہلی بار جنوری ۱۹۵۹
اردو ترجمہ پہلی بار فروری ۱۹٦۱

ایس ایچ موڈک بی. ای (آنرز) نے ادبی پرنٹنگ پریس ، ۸ شیمرڈ روڈ ، بمبئی ۸ میں چھاپا اور جی. ڈی. اسٹھلیکر ، مینجر اورینٹ لونگ مینس پرائیویٹ لمیٹیڈ نکل روڈ ، بیلارڈ اسٹیٹ ، بمبئی ۱ نے شائع کیا

فہرست مضامین

دیباچہ

کچھ اوپر دو سال ہوئے، جب میں نے مولانا آزاد کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ وہ اپنی سوانح عمری لکھیں، تو مجھے اس کا بالکل گمان نہیں تھا کہ ایک دن مجھے دکھ بھرے دل کے ساتھ اس سوانح عمری کا دیباچہ لکھنا ہوگا. مولانا اپنی ذاتی زندگی کے حالات کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور پہلے انہوں نے ان کو بیان کرنے میں بہت تکلف کیا انہوں نے اس بات کو بڑی مشکل سے مانا کہ انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات کی منتقلی کی جو کارروائی ہوئی، اس میں ان کا بہت ممتاز حصہ تھا اور اس لحاظ سے ان کا فرض ہے کہ آنے والی نسلوں کے سامنے وہ اس یادگار زمانے کے متعلق اپنے تاثرات پیش کریں ان کے تکلف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی صحت برباد ہوچکی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اب انہیں اپنی ساری طاقت ان ناگزیر سیاسی اور انتظامی کاموں پر قابو پانے کے لئے وقف کردینا چاہئے، جن کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈالا گیا ہے. آخر میں جب میں نے ان کو یقین دلا دیا کہ میں حتی الامکان انہیں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی زحمت سے بچاؤنگا، تو وہ راضی ہوگئے. اس میں بے شک یہ نقصان ہے کہ ہندوستانی ان کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی سوانح عمری کو پڑھنے

کا پہلا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حب پوری کتاب مولانا آزاد کے ہاتھ میں آگئی، تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے قریب تیس صفحے، حن میں ایسے مسائل اور ایسے تاثرات پر بحث کی گئی تھی، جو بڑی حد تک ذاتی اور شخصی تھے، فی الحال شائع نہ کیے جائیں۔ انہوں نے ہدایت کی کہ پوری کتاب کے دو نسخے تیار کئے جائیں اور ان میں سے ایک کلکتہ کی نیشنل لائبریری اور ایک نئی دہلی کے نیشنل آرکائیز میں مہر لگا کر محفوظ کر دیا جائے۔ لیکن انہیں اس کی فکر تھی کہ تیس صفحوں کی اس عبارت کو خارج کردینے سے واقعات کی جو تصویر انہوں نے پیش کی تھی، وہ نہ بگڑنے پائے اور جو نتیجے انھوں نے نکالے تھے، ان میں فرق نہ آئے۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق تبدیلیاں کردیں۔ اور نومبر سنہ ۵۷ء کے آخر میں کتاب کا مسودہ نظر ثانی اور کاٹ چھانٹ کے بعد مولانا آزاد کی خدمت میں پیش کردیا۔

جس زمانے میں، میں آسٹریلیا گیا ہوا تھا، انہوں نے مسودے کو پھر ایک بار دیکھا، جب میں واپس آیا، تو ہم دونوں نے مسودے کے صرف ہر ایک باب کو نہیں بلکہ ہر ایک جملہ کو دوبارہ پڑھا مولانا نے ادھر ادھر کچھ ترمیمیں کیں، مگر کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی گئی۔ بعض باب ایسے تھے، جو تین چار مرتبہ اس طرح سے دیکھے گئے۔ اس سال یوم جمہوریہ کے موقع پر مولانا آزاد نے فرمایا کہ اب وہ مسودے سے مطمئن ہیں اور اسے طباعت کے لئے بھیجا جاسکتا ہے۔ اس وقت کتاب جس شکل

کے شرف سے محروم رہیں گے اور ہندوستانی ادب اور خاص طور سے اردو ادب میں یہ ایک بڑی کمی رہ جائیگی، لیکن کچھ نہ ہونے سے تو یہی بہتر ہے کہ ان کی ہدایت اور نگرانی میں لکھی ہوئی انگریزی کتاب تیار ہوجائے۔

میں یہ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ کتاب کس طرح سے مرتب ہوئی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میرا یہ دستور رہا ہے کہ جب میں دورے پر نہ ہوتا تو مولانا آزاد کی صحبت میں شام کا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذارتا۔ وہ گفتگو کے فن میں عجیب ملکہ رکھتے تھے اور اپنی سرگذشت کو ایک جیتی جاگتی تصویر سا دیا کرتے تھے۔ میں ساتھ ساتھ خاصے مفصل نوٹ لیتا رہتا تھا اور جب کسی معاملے میں وضاحت یا مزید معلومات کی ضرورت ہوتی، تو سوال پوچھ لیا کرتا تھا۔ مولانا اپنی وضع کے مطابق اپنے ذاتی معاملوں کا ذکر کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کرتے رہتے، لیکن تمام پبلک مسئلوں پر انھوں نے کھلے دل اور مخلصانہ انداز سے گفتگو کی۔ جب میرے پاس کتاب کے ایک باب کے لئے مواد جمع ہوجاتا، تو میں انگریزی میں اس کا مسودہ تیار کرکے ان کی خدمت میں جلد سے جلد پیش کردیتا وہ ہر باب کو پہلے خود دیکھتے اور پھر ہم دونوں مل کر اسے پڑھتے۔ اس منزل پر انھوں نے کبھی کچھ بڑھا کر، کبھی کچھ بدل کر، کبھی کچھ خارج کرکے مسودے میں بہت سی ترمیمیں کیں۔ ہم اس طرح کام کرتے رہے، یہاں تک کہ ستمبر سنہ ۱۹۵۷ء میں، میں نے پوری کتاب

سے عزیز تھا۔ یہ مقصد تھا ہندوستان کی مختلف دینی جماعتوں میں مفاہمت پیدا کرنا اور اسے فروغ دینا اور دنیا کی قوموں میں بہتر مفاہمت پیدا کرنے کی راہ میں اس قومی منصوبے کو پہلا قدم بنانا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستانی اور پاکستانی ایک دوسرے کو دوست اور پڑوسی سمجھیں۔ وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز[1] کو اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تصور کرتے تھے اور اس کونسل کے خطبۂ صدارت میں، جو ان کی آخری تیار کی ہوئی اور مطبوعہ تقریر تھی، انھوں نے ان دونوں ریاستوں کی آبادی کے درمیان، جو دس برس پہلے تک ایک ملک کی حیثیت رکھتی تھیں، مفاہمت اور ہمدردی کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے ولولہ انگیز اپیل کی تھی میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب سے جو آمدنی ہو، اسکا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کونسل کو اس مقصد سے دے دی جائے کہ وہ ان مختلف مذہبی جماعتوں کو جو ہندوستان اور پاکستان میں آباد ہیں، دل سے ایک دوسرے کے قریب لائے اس لئے ایک حصہ کو چھوڑ کر، جو مولانا کے قریبی وارثوں کو دیا جائیگا، اس کتاب کی رائلٹی کونسل کو ادا کی جائیگی، تاکہ وہ اس رقم سے ہر سال دو انعام دے سکے، ایک ایسے غیر مسلم کو جو اسلام پر اور ایک ہندوستان یا پاکستان کے ایسے مسلمان شہری کو جو ہندو مذہب پر بہترین مضمون لکھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ مولانا آزاد کے دل میں نوجوانوں کی کتنی محبت اور کتنا لحاظ تھا، اس مقابلے میں صرف وہی شریک

1 Indian Council for Cultural Relations

میں شائع ہوئی ہے، وہ ان کے منظور کئے ہوئے مسودے کے بالکل مطابق ہے

مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر سنہ ۵۸ ء میں ان کی سترویں سالگرہ کے دن شائع ہو مشیت الہی کچھ اور تھی اور اب جو کتاب شائع ہوگی تو وہ ہم میں موجود نہ ہونگے.

جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں، مولانا آزاد شروع میں اس طرح کی کتاب تیار کرنے پر کچھ بہت آمادہ نہ تھے لیکن جیسے جیسے کام آگے بڑھا، ان کی دلچسپی بڑھتی گئی. آخری چھ سات مہینے میں تو بہت کم ایسا ہوا کہ انہوں نے کسی شام کو کتاب کی ترتیب کے کام میں ناغہ کیا ہو اپنی ذاتی زندگی کے حالات بیان کرنے سے وہ بہت پرہیز کیا کرتے تھے، لیکن آخر میں وہ خود ہی اس پر تیار ہوگئے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب لکھدیں، جس میں ان کی زندگی کے ابتدائی دور آجائیں اور سنہ ۱۹۳۷ ء تک کے حالات بیان ہوجائیں. انہوں نے اس کتاب کے خاکہ کا مسودہ پسند بھی کرلیا اور یہ ان کی خواہش کے مطابق اس کتاب میں پہلے باب کی حیثیت سے شامل کرلیا گیا ہے. ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ تیسری جلد میں سنہ ۱۹٤۸ ء کے بعد کے واقعات پر بحث کریں. ہماری بدقسمتی ہے کہ اب یہ کتابیں کبھی نہ لکھی جاسکیں گی

میں نے اس کتاب کے سلسلے میں جو کچھ کیا ہے، شوق اور محبت میں کیا ہے اور مجھے خوشی ہوگی اگر یہ کسی قدر بھی اُس مقصد کو حاصل کرنے میں مدد دے، جو مولانا آزاد کو دل

دیباچـــہ

انگریزی کے مزاج میں جو فرق ہے، اس سے مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی اور بھی مشکل ہوجاتی ہے. ہـــندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی الفاظ اور محاوروں کی دولت ہے، اس میں رنگینی ہے، جوش ہے اس کے برخلاف انگریزی کی موزونیت بات کو اصل سے کچھ کم کر کے بیان کرنے کے لئے ہے اور جب بات کہنے والا اردو زبان میں وہ ملکہ رکھتا ہو، جو مولانا آزاد کو حاصل تھا تو یہ بخوبی تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس شخص پر کیا گذرے گی، جو ان کے خیالات کو انگریزی میں بیان کرنے کا حوصلہ کرے. ان دقتوں کے باوجود میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی تحریر میں مولانا آزاد کے خیالات کا عکس اتار لوں اور یہ بات کہ انہوں نے میرے بیان کو پسند کیا، میری محنت کا بہت ہی قیمتی معاوضہ ہے.

نئی دہلی ـــ ہمــایوں کبیر

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۵۸ء

ہوسکیں گے، جن کی عمر اس سال ۲۲ فروری کو تیس برس کی یا اس سے کم ہوگی.

ختم کرنے سے پہلے میں ایک بات کو بالکل صاف کردینا چاہتا ہوں. اس کتاب میں ایسے خیالات بیان کئے گئے ہیں اور رائیں دی گئی ہیں، جن سے مجھے اتفاق نہیں ہے. میرا کام صرف یہ تھا کہ مولانا آزاد نے جو نتیجے نکالے تھے، انہیں ضبط تحریر میں لے آؤں اور یہ بہت ہی نامناسب ہوتا، اگر حالات کو بیان کرنے کے انداز میں میرے اپنے خیالات کا اثر آجاتا. جب وہ زندہ تھے تو اکثر میں ان پر ظاہر کرتا رہتا تھا کہ کن باتوں میں مجھے ان سے اختلاف ہے اور چونکہ کشادہ دلی ان کی طبیعت کی ایک ممتاز خصوصیت تھی، انہوں نے کبھی کبھی اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے میرے اعتراضوں کا لحاظ رکھا، کبھی کبھی وہ اپنے خاص طریقے سے مسکرائے اور کہا کہ یہ میرے خیالات ہیں اور میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کا حق ہے کہ انہیں جس طرح چاہوں بیان کروں. اب وہ انتقال کر گئے ہیں اسلئے یہ ضروری ہے کہ ہر بات اسی شکل میں بیان کی جائے، جو انہوں نے اسے دی ہے.

ایک شخص کے لئے کسی دوسرے کے خیال یا رائے کو بالکل صحیح صحیح پیش کرنا دشوار ہوتا ہے. دونوں کی زبان ایک ہی ہو تب بھی مطلب میں بارک سا فرق ہوجاتا ہے اگر ایک لفظ کی جگہ دوسرا رکھ دیا جائے، اور اس طرح بات کے ایک پہلو کے بجائے کسی دوسرے پر زیادہ زور دے دیا جائے. اردو اور

بچے ہی تھے ، اس لئے ان کے نانا نے ان کی پرورش کی غدر سے دو سال پہلے مولانا منور الدین نے ہندوستان کے حالات سے دل برداشتہ ہوکر مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا ، مگر سلطان جہاں بیگم نے بھوپال میں انہیں روک لیا اور وہ بھوپال ہی میں تھے جب غدر شروع ہوگیا۔ دو سال تک وہ وہاں سے نکل نہ سکے ، پھر بمبئی پہنچے ، یہاں انہیں موت نے آگھیرا اور مکہ معظمہ جانا انہیں نصیب نہ ہوا

اس وقت میرے والد قریب پچیس سال کے تھے وہ مکہ معظمہ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی انہوں نے اپنے لئے مکان بنوایا اور شیخ محمد طاہر وتری کی لڑکی سے عقد کرلیا شیخ محمد طاہر مدینہ منورہ کے ایک بڑے عالم تھے ، جن کی شہرت عرب کے باہر بھی پہنچ چکی تھی۔ میرے والد بھی پوری اسلامی دنیا میں معروف ہوگئے جب مصر سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی جو عربی زبان میں تھی اور دس جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ وہ کئی بار بمبئی اور ایک مرتبہ کلکتہ آئے اور دونوں جگہ بہت سے لوگ ان کے مداح اور مرید ہو گئے۔ عراق ، ترکی اور شام کے بھی انہوں نے کئی دورے کئے اور ان کے متعلق وسیع معلومات حاصل کیں مکہ معظمہ کی آبادی کے لئے نہر زبیدہ ، پانی حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے اسے خلیفہ ہارون رشید کی بیگم زبیدہ خاتون نے بنوایا تھا وقت کے ساتھ اس کو نقصان پہنچا تھا اور شہر میں پانی کی بہت کمی رہا کرتی تھی۔ خاص طور پر حج کے زمانے میں یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی اور حاجیوں کو بہت تکلیف

پہلی جلد کا خلاصہ

میرے آباو اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے انہوں نے آگرہ کو اپنا مسکن بنایا، بعد میں دہلی منتقل ہوگئے وہ علمی ذوق رکھنے والے لوگ تھے۔ اکبر کے زمانے میں مولانا جمال الدین نے اپنے علم کی بدولت شہرت پائی۔ پھر اس خاندان کے لوگ دنیا کی طرف جھک گئے اور کئی ایک نے بڑے بڑے سرکاری عہدے حاصل کئے۔ شاہ جہاں کے زمانے میں محمد ہادی آگرہ کے قلعہ دار مقرر ہوئے۔

مولانا منور الدین میرے والد کے نانا تھے۔ مغل عہد کے وہ آخری شخص تھے، جسے رکن المدرسین کا خطاب دیا گیا۔ یہ عہدہ شاہ جہاں کے زمانے میں قائم ہوا تھا اور اس کے قیام میں مدنظر یہ تھا کہ علم و فضل کی پرورش اور فروغ کے لئے حکومت جو کچھ کرتی تھی، اس کی نگرانی کی جائے۔ رکن المدرسین کا فرض یہ تھا کہ عالموں اور مدرسوں کو معافیاں، حقوق و مراعات اور وظیفے دینے کا انتظام کرے اور اس لحاظ سے اگر اسے دور جدید کے ڈائرکٹر تعلیمات کی طرح کا عہدہ دار سمجھا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس وقت تک مغلوں کے اقتدار کو زوال ہوچکا تھا، مگر رکن المدرسین جیسے اہم عہدے باقی تھے۔

میرے دادا کا جب انتقال ہوا، تو میرے والد مولانا خیرالدین

ہوجاتی تو انہیں فلسفہ، اقلیدس، ریاضی اور الجبرا کا عربی میں درس دیا جاتا دینیات کی تعلیم بھی اس نظام کا ایک لازمی جزو تھی میرے والد نے میری تعلیم کا انتظام گھر پر کیا، اس لئے کہ وہ مجھے کسی مدرسے میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے. یوں تو کلکتہ مدرسہ بھی تھا، مگر میرے والد اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے پہلے انہوں نے خود مجھے پڑھایا، اس کے بعد ہر مضمون کے لئے الگ استاد مقرر کئے، وہ چاہتے تھے کہ علم کے ہر شعبے میں ممتاز عالم میری رہنمائی کریں.

روایتی طریقے پر تعلیم پانے والے طالب‌علم عموماً بیس پچیس سال کی عمر تک فارغ ہو جایا کرتے تھے اس میں وہ مدت بھی شامل تھی، جب طالب علم مبتدیوں کو درس دے کر ثابت کرتا تھا کہ اس کا اپنا علم پختہ ہوگیا ہے. میں جب فارغ ہوا، تو میری عمر سولہ سال کی تھی. میرے والد نے قریب پندرہ طالب علم جمع کئے، جنہیں میں فلسفہ، ریاضی اور منطق کی اعلیٰ تعلیم دیتا تھا. اس کے تھوڑے ہی دن بعد سر سید احمد خاں کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا. جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات کا میرے اوپر بہت اثر ہوا. اور میں نے محسوس کیا کہ جب تک کوئی شخص جدید سائنس، فلسفہ اور ادب کا اچھا مطالعہ نہ کرے، وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتا. میں نے طے کیا کہ میرے لئے انگریزی پڑھنا ضروری ہے. مولوی محمد یوسف جعفری سے میں نے اس کا ذکر کیا. وہ اس زمانے میں مشرقی علوم کے صدر ممتحن تھے، انہوں نے مجھے انگریزی کی ابجد سکھائی اور

اٹھانی پڑتی تھی۔ میرے والد ہے اس بہر کی مرمت کرائی۔ انہوں نے ہندوستاں، مصر، شام اور ترکی میں بیس لاکھ کا فنڈ حمع کیا اور بہر کے کنارے کو ایسا مصبوط کر دیا کہ بدو انہیں توڑ پھوڑ نہیں سکتے تھے۔ سلطاں عبدالمجید اس وقت ترکی کے شہنشاہ تھے۔ انہوں ہے اس خدمت کے صلے میں میرے والد کو مجیدی تمعہ قسم اول عطا کیا۔

میں مکہ معظمہ میں سنہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا۔ دو سال بعد میرے والد پورے خاندان کو لے کر کلکتہ آئے۔ کچھ عرصہ پہلے جدہ میں وہ گر پڑے تھے اور ان کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ہڈی بٹھا تو دی گئی تھی، مگر وہ اچھی طرح سے نہیں بیٹھی تھی اور لوگوں ہے انہیں مشورہ دیا تھا کہ کلکتہ کے سرجن اسے ٹھیک کردیں گے۔ ان کا ارادہ تھا کہ صرف چند دن قیام کریں گے، مگر ان کے مریدوں اور مداحوں ہے انہیں جانے نہیں دیا۔ ہمارے کلکتہ آنے کے ایک سال بعد میری والدہ ہے وفات پائی، اور انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

میرے والد زندگی کے روایتی طریقے کو پسند کرتے تھے۔ انہیں مغربی تعلیم پر ذرا بھی اعتقاد نہیں تھا اور انہیں کبھی اس کا خیال نہیں ہوا کہ مجھے جدید طرز کی تعلیم دلوائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جدید تعلیم عقیدے کو کمزور کر دیگی۔ اس لئے انہوں نے میری تعلیم کا پرانے دستور کے مطابق انتظام کیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ رواج تھا کہ پہلے فارسی اور پھر عربی کی تعلیم دی جاتی۔ جب انہیں زبان میں کسی قدر مہارت

بالکل قاصر تھا کہ جب وہ ایک ہی سرچشمے سے روحانی سرمایۂ حیات حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، تو ان میں یہ مخالفت و عداوت کیوں ہے۔ ہر فرقہ جس قطعی اعتماد و یقین کے ساتھ دوسروں کو گمراہی اور بدعت کا شکار ٹھہراتا تھا، اسے صحیح اور حق بجانب تصور کرنے پر بھی میں اپنے دل کو آمادہ نہ کرسکا. راسخ العقیدہ جماعتوں اور فرقوں کے ان اختلافات نے میرے دل میں ایسے شکوک و شبہات پیدا کئے جن سے خود مذہب کو ٹھیس لگتی تھی اگر مذہب ایک عالمی حقیقت کا عکس اور مظہر ہے، تو پھر مختلف مذاہب کے پیروؤں کے درمیان اختلاف و آویزش کے کیا معنی؟ اور ہر مذہب کی طرف سے دعویٰ کیوں کیا جائے کہ وہی اور صرف وہی حقیقت کا محرم اور حق کا آئینہ ہے اور وہ دوسرے مذاہب کو باطل اور گمراہی کی مثال کیوں قرار دے؟

دو تین سال تک میرے دل میں شدید بےچینی رہی اور میں اپنے شکوک کو دور کرنے کی آرزو میں تڑپتا رہا کبھی کوئی کیفیت طاری ہوتی کبھی کوئی اور بالآخر میں ایک منزل پر پہنچا جب کہ وہ تمام بندشیں ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو گئیں، جومیرے خاندان اور خاندان کی فضا میں تربیت نے میرے ذہن پر لگائی تھیں. مجھے محسوس ہوا کہ میں تمام رسمی اور مصنوعی رشتوں اور پابندیوں سے آزاد ہوگیا ہوں اور میں نے فیصلہ کیا کہ آگے قدم بڑھاؤنگا تو اسی راہ پر جو میں نے اپنے لئے انتخاب کی ہو. یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے «آزاد» کا عرف اختیار کیا، جس کا

پیارے چند سرکار کی « پہلی کتاب » پڑھنے کو دی. جیسے ہی مجھے زبان کی کچھ شد بد ہوگئی، میں نے انجیل پڑھنا شروع کر دیا. میں نے اس کے انگریزی، فارسی اور اردو کے نسخے حاصل کئے اور تینوں کو سامنے رکھ کر پڑھتا تھا. اس سے مجھے عبارت کو سمجھنے میں بہت مدد ملی میں نے انگریزی لغت کی مدد سے اخبار پڑھنا بھی شروع کر دیا اور بہت جلد اس قابل ہوگیا کہ انگریزی کتابیں پڑھ سکوں میں تاریخ اور فلسفے کا خاص طور سے مطالعہ کرتا رہا.

میرے لئے یہ شدید ذہنی ہیجان کا دور تھا جس خاندان میں پیدا ہوا، وہ مذہبی روایات کے بہت گہرے رنگ میں رنگا ہوا تھا. اس میں روایتی زندگی کا ہر دستور اور قاعدہ بغیر چوں چرا کے مانا جاتا تھا اور مانے ہوئے اور مستند طریقوں سے بال برابر ہٹنا بھی ناپسند کیا جاتا تھا میں اپنے آپ کو رائج رسموں اور عقیدوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ کرسکا. میرا دل بغاوت کے ایک نئے احساس سے لبریز تھا مجھے اب وہ تصورات مطمئن نہیں رکھ سکتے تھے، جو مجھے اپنے خاندان سے یا دینی تربیت کے ابتدائی دور میں حاصل ہوئے تھے میں یہ محسوس کرتا تھا کہ حق تک پہنچنے کی سبیل مجھے خود نکالنی ہوگی اور کوئی دانستہ کوشش کئے بغیر میں اپنے خاندان کے دائرے سے باہر نکلنے اور اپنے لئے اپنی الگ راہ تلاش کرنے لگا.

پہلی بات جس سے مجھے تکلیف ہوئی، وہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بغض وعناد کا مظاہرہ تھا. میں یہ سمجھنے سے

ہوا. یہ اس دور کے انقلابیوں میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے. ان کی وساطت سے میں اور انقلابیوں سے ملا. مجھے یاد ہے کہ شری آرسدو گھوش سے میری دو تین موقعوں پر ملاقات ہوئی. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلابی سیاست میں میرے دل کے لئے ایک کشش پیدا ہوگئی اور میں ان کے ایک گروپ میں شامل ہوگیا.

ان دنوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں. وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلۂ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشاروں پر چلتے ہیں. مشرقی بنگال ایک الگ صوبہ قرار دیا گیا تھا اور بیم فیلڈ فلر، جو اس وقت اس صوبہ کا لفٹننٹ گورنر تھا، علانیہ کہتا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی جماعت کو اسی نظر سے دیکھتی ہے، جیسے کوئی شوہر اپنے حرم کی محبوب بیوی کو. انقلابی محسوس کرتے تھے کہ مسلمان حصول آزادی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہیں اور انہیں ایک رکاوٹ مان کر راستے سے ہٹا دینا چاہئے.

انقلابیوں کو مسلمانوں سے جو نفرت تھی اس کا ایک اور سبب بھی تھا. حکومت محسوس کرتی تھی کہ بنگال کے ہندو اس درجہ بیدار ہوگئے ہیں کہ کسی ہندو افسر پر انقلابیوں کے خلاف کارروائی کرنے کے معاملے میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا. اس لئے انہوں نے پولیس کے خفیہ محکمے میں یو. پی. کے مسلمانوں کو بلا کر رکھا،

مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں روایتی اور موروثی عقائد کی قید سے آزاد ہوگیا ہوں۔ ان ذہنی انقلابوں کا مفصل ذکر میں اپنی سوانح عمری کی پہلی جلد میں کروں گا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب میرے سیاسی خیالات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے ان کے تحکمانہ انداز اور انتظامی اقدامات نے ملک کی سیاسی بےچینی میں ایک نئی شدت پیدا کر دی تھی۔ لارڈ کرزن نے بنگال کو خاص طور پر اپنی توجہ کا سزاوار سمجھا تھا اس لئے شورش بھی یہیں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ یہ صوبہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے ترقی یافتہ حصہ تھا اور ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بنگال کے ہندو پیش پیش رہے تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے فیصلہ کیا کہ بنگال کو تقسیم کر دیا جائے۔ ان کو خیال تھا کہ اس طرح ہندو کمزور پڑجائیں گے اور ایک مستقل خلیج ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھے گی۔

بنگال نے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، بلکہ ایک ایسا سیاسی اور انقلابی جوش پیدا اور کارفرما ہوا، جس کی مثال کسی سابق عہد میں نہیں ملتی۔ شری اربندو گھوش بڑودہ سے کلکتہ آگئے، تاکہ اس شہر کو اپنی جد و جہد کا مرکز بنائیں اور ان کا اخبار «کرم یوگی» قومی بیداری اور غیروں کی حکومت کے خلاف جنگ کا جھنڈا بن کر لہرانے لگا۔

اسی زمانے میں میرا شری شیام سندر چکرورتی سے تعارف

سیاسی تشخیص صحیح ہے . مگر وقت کے ساتھ ان میں سے بعض میرے ہم خیال ہوگئے اسی درمیان میں میں نے مسلمانوں میں کام شروع کردیا تھا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت ہے، جو نئے سیاسی منصوبوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کو تیار ہے .

جب میں انقلابیوں میں شامل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان کی سرگرمیاں بنگال اور بہار تک محدود ہیں یاد رہے کہ بہار اس وقت صوبۂ بنگال کا ایک حصہ تھا میں نے اپنے دوستوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ ہمیں اپنا میدان زیادہ وسیع کرنا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اپنی سرگرمیاں شروع کرنا چاہئیے . پہلے انہیں تامل ہوا، انہوں نے کہا کہ ہمارے کام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر کیا جائے، تعلقات کا سلسلہ پھیلانے میں خطرے ہیں اور اگر دوسرے صوبوں میں شاخیں کھولی گئیں تو ہوسکتا ہے کہ کام اس کے لئے جو اخفا لازمی ہے، اسے قائم رکھنا دشوار ہوجائے . مگر میں نے انہیں اس پر آمادہ کرلیا کہ میری رائے پر عمل کریں اور میرے انقلابی جماعت میں شامل ہونے کے دو برس کے اندر شمالی ہندوستان کے کئی بڑے شہروں اور بمبئی میں انقلابیوں کی خفیہ انجمنیں بن گئیں یہ انجمنیں کیسے قائم ہوئیں اور نئے ممبر کیسے بھرتی کئے گئے، اس کے بارے میں میں بہت سے دلچسپ اور مضحکہ خیز قصے سنا سکتا ہوں، لیکن یہ تفصیلات میری سوانح عمری کی پہلی جلد میں بیان کی جائیں گی اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اس کا انتظار کرنا ہوگا .

اسی زمانے میں مجھے ہندوستان سے باہر جانے اور عراق،

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے ہندو یہ محسوس کرنے لگے کہ مسلمان سیاسی آزادی اور ہندوؤں کی جماعت کے مخالف ہیں۔

جب شیام سندر چکرورتی نے دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کرایا اور ان دوستوں نے دیکھا کہ میں خوشی سے ان کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہوں تو انہیں بہت حیرت ہوئی۔ شروع میں ان کو میرے اوپر بھروسہ نہیں تھا اور انہوں نے مجھے اپنی مخصوص محفلوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی رفتہ رفتہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہوگیا میں نے بحث کرکے انہیں یقین دلانا چاہا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے ان سے دشمنی رکھتے ہیں اور یہ مناسب نہیں ہے کہ بنگال کے چند مسلمان سرکاری ملازموں کے رویہ کا جو انہیں تجربہ ہوا ہے، اسے وہ ایک عام حقیقت سمجھ بیٹھیں۔ مصر، ایران اور ترکی میں مسلمان جمہوریت اور آزادی کے حاصل کرنے کے لئے انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا رہے ہیں ہندوستان کے مسلمان بھی سیاسی جد و جہد میں شریک ہوجائیں گے اگر ہم ان میں کام کریں اور انہیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر مسلمان مخالفت میں سرگرم یا سیاسی تحریک سے بے تعلق بھی رہے تو آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت زیادہ دشوار ہوجائیگی، اس لئے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔

پہلے تو میں اپنے انقلابی دوستوں کو یقین نہ دلا سکا کہ میری

پڑھا ہے، تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں نے جامعہ ازہر سے سند حاصل کی ہوگی۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں جب میں قاہرہ گیا تو الازہر کا نظام تعلیم اس قدر ناقص تھا کہ اس سے نہ تو ذہن کی کوئی تربیت ہوتی تھی اور نہ قدیم اسلامی علوم اور فلسفے پر کافی عبور حاصل ہوتا تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے اس نظام کی اصلاح کرنا چاہی تھی، مگر بوڑھے، قدامت پسند علما نے ان کی تمام تدبیروں کو الٹ دیا۔ جب انہیں الازہر کی اصلاح کی کوئی امید نہ رہی، تو انہوں نے قاہرہ میں دار العلوم کے نام سے ایک نئے کالج کی بنیاد رکھی، جو اس وقت تک قائم ہے۔ جب الازہر کی یہ حالت تھی تو میں وہاں اکتساب علم کی خاطر کیوں جاتا۔

مصر سے میں ترکی اور فرانس گیا۔ ارادہ تھا کہ آگے لندن تک جاؤں یہ میں نہ کرسکا، اس لئے کہ مجھے خبر ملی کہ میرے والد بیمار ہیں میں پیرس سے ہندوستان واپس آگیا لندن جانے کی نوبت کئی سال بعد تک نہیں آئی۔

یہ میں بیان کرچکا ہوں کہ سنہ ۱۹۰۸ء میں کلکتہ چھوڑنے سے پہلےمیں سیاسی خیالات کے اعتبار سے انقلابی سرگرمیوں کی طرف مائل ہوچکا تھا۔ جب میں عراق گیا، تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے پیرووؤں سے کچھ تعلقات پیدا ہوئے۔ میں ینگ ٹرکس کے گروپ سے بھی ملا، جس نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتا تھا۔ جب میں ترکی گیا تو ینگ ٹرکس

مصر، شام اور ترکی کے سفر کرنے کا اتفاق ہوا. ان تمام ملکوں میں میں نے دیکھا کہ لوگ فرانسیسی زبان پسند کرتے ہیں اور اسے سیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، مجھے بھی اس کا ذوق ہوا اور میں نے اسے سیکھنا شروع کردیا، مگر یہ بھی ظاہر تھا کہ انگریزی بہت تیزی کے ساتھ سب سے زیادہ مستعمل بین الاقوامی زبان بنتی جارہی ہے اور میری بیشتر ضرورتوں کو پورا کردیتی ہے.

یہاں میں چاہتا ہوں کہ ایک غلط فہمی کو دور کردوں، جس کا مہادیو ڈیسائی مرحوم کی بدولت بہت چرچا ہوا. وہ جب میری سوانح عمری لکھ رہے تھے، تو انہوں نے بہت سے سوالات قائم بند کئے اور مجھ سے ان کے جواب لکھنے کو کہا. ایک سوال کے جواب میں میں نے لکھا کہ جب میں قریب بیس برس کا تھا تو میں نے مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا اور ایک عرصے تک مصر میں رہا. کسی اور سوال کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ روایتی طریقۂ تعلیم صرف ہندوستان میں ناقابل اطمینان اور بے اثر نہیں ہے، بلکہ مشہور دار العلوم الازہر میں بھی اس کی حالت کچھ بہتر نہیں. مہادیو ڈیسائی نے کسی وجہ سے ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصر گیا تھا. حقیقت یہ ہے کہ میں ایک دن بھی وہاں طالب علم کی حیثیت سے نہیں رہا. شاید اس غلط فہمی کا سبب ان کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی شخص نے کچھ علم حاصل کیا ہے تو اس نے ضرور کسی یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہوگی. جب مہادیو ڈیسائی کو معلوم ہوا کہ میں نے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں نہیں

اور ان کی چھپائی ان کے مضامین کی طرح ناقص ہوتی تھی وہ لیتھو میں چھپتے تھے، اس لئے وہ جدید صحافت کی کوئی خوبی اور خصوصیت اپنے اندر پیدا نہ کرسکتے تھے ان میں ہاف ٹون تصویریں بھی نہیں چھپ سکتی تھیں میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اخبار طباعت کے اعتبار سے دیدہ زیب ہوگا اور اس کی صدا ایسی ہوگی کہ پڑھنے والوں کے دل جوش سے لبریز ہوجائیں میں نے یہ بھی طے کیا کہ وہ لیتھو میں نہیں بلکہ ٹائپ میں چھپے گا، اسی ارادے سے میں نے «الہلال پریس» قائم کیا اور جون سنہ ۱۹۱۲ء میں «الہلال» کا پہلا نمبر شائع ہوا

«الہلال» کی اشاعت سے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہردلعزیزی حاصل ہوئی پبلک کے لئے باعث کشش صرف اس کی اعلیٰ طباعت نہیں تھی، بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ قدیم جذبہ تھا، جس کی یہ دعوت دیتا تھا «الہلال» نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کردی ارر لوگوں کا مطالبہ اتنا شدید تھا کہ پہلے تین مہینوں کے اندر اس کے تمام شروع کے نمبروں کو دوبارہ شائع کرنا پڑا، اس لئے کہ ہر خریدار چاہتا تھا کہ اس کے پاس تمام اشاعتوں کا مکمل سٹ ہو۔

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اس وقت علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی، اس کے رکن اپنے آپ کو سر سید کی پالیسی کا امین سمجھتے تھے ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو برطانوی تاج کا وفادار اور قومی تحریک سے الگ اور بے تعلق رہنا چاہئے۔ جب

تحریک کے چند لیڈروں سے دوستی ہوگئی ہندوستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک ان سے میری خط و کتابت جاری رہی

عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سیاسی عقائد راسخ ہوگئے ان انقلابیوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان قومی مطالبوں کی طرف سے بے اعتنائی اور سرد مہری برتتے ہیں یا ان کی مخالفت کرتے ہیں ان کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی جنگ میں ہراولوں اور رہبروں کا کام کرنا چاہئیے تھا، نہ کہ انگریزوں کے پیچھے گھسٹ کر رہ جانا مجھے اور بھی زیادہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت و معاونت کرنا چاہئیے اور اس کی تدبیر کرنا چاہئیے کہ برطانوی حکومت اپنی اغراض کے لئے انہیں ناجائز طور پر استعمال نہ کرسکے مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی جائے اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جاکر زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی جد و جہد کروں گا

واپسی کے بعد میں کچھ دنوں تک غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا اور کیا پروگرام بنانا چاہئیے. میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمیں اپنے خیالات پبلک تک پہنچا کر اپنی موافقت کے لئے رائے عامہ پیدا کرنا چاہئیے. اور اس کے لئے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا اس زمانے میں پنجاب اور یو پی سے کئی روزانہ اور ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ رسالے شائع ہوتے تھے. مگر ان کا معیار کچھ [illegible] تھا. وہ دیدہ زیب نہیں ہوتے تھے

صرف بہار جا سکتا تھا، اس لئے رانچی چلا گیا. چھ مہینے بعد مجھے رانچی میں نظر بند کردیا گیا اور میں ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء تک یہاں حراست میں رہا. یکم جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو میں دوسرے نظر بندوں اور قیدیوں کے ساتھ شاہ انگلستان کے اعلان کے ماتحت رہا کردیا گیا

اس وقت تک گاندھی جی سیاست کے میدان میں آچکے تھے اور چمپارن کے کسانوں میں وہ جو کام کر رہے تھے، اس کے سلسلے میں اس وقت وہ رانچی آئے تھے، جب میں وہاں نظر بند تھا انہوں نے مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی، مگر حکومت بہار نے اس کی اجازت نہیں دی. اس طرح میں ان سے اپنی رہائی کے بعد دہلی میں جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار مل سکا. اس وقت ایک تجویز زیر غور تھی کہ خلافت اور ترکی کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جو احساسات تھے، ان سے وائسرائے کو مطلع کیا جائے اور اس غرض سے اس کے پاس ایک وفد بھیجا جائے گاندھی جی ان بحثوں میں شریک ہوئے. انہوں نے تجویز سے دلچسپی اور پوری ہمدردی ظاہر کی اور اس کا اعلان کیا کہ وہ اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہیں ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ایک جلسہ ہوا. گاندھی جی کے علاوہ لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کی، جو مسلمانوں نے خلافت کے مسئلے میں اختیار کیا تھا.

وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی. میں نے عرض داشت پر

«الہلال» نے اپنی آواز بلند کی اور دوسری قسم کی دعوت دی، تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کی جاہ و عزت خطرے میں ہے، اس لئے انہوں نے «الہلال» کی مخالفت شروع کی اور اس مخالفت میں یہاں تک شدت برتی کہ اڈیٹر کو قتل کرنے کی دھمکی دی. حتی زیادہ مخالفت مقتدر رہنماؤں نے کی، اتنا ہی زیادہ «الہلال» ہردلعزیز ہوتا گیا. دو سال کے اندر «الہلال» کی اشاعت ۲۶ ہزار فی ہفتہ ہوگئی. اردو صحافت کی تاریخ میں ایسی اشاعت کا امکان وہم و گماں میں بھی نہ تھا.

«الہلال» کی اس کامیابی کو دیکھ کر حکومت کو بھی تشویش ہوئی. اس نے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، اس خیال سے کہ شاید اس طرح «الہلال» کے انداز بیاں میں کچھ فرق پیدا ہوجائے. اس ہلکی سی چبھن کا میری ہمت پر کچھ اثر نہ پڑا. جلد ہی حکومت نے ضمانت ضبط کرلی اور دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا. یہ بھی جلد ضبط ہوگئی. اس دوران میں سنہ ۱۹۱٤ء کی جنگ چھڑ گئی تھی سنہ ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کرلیا گیا. پانچ مہینے بعد میں نے «البلاغ» کے نام سے ایک نیا پریس قائم کیا اور اسی نام کا اخبار جاری کردیا. حکومت کو اب احساس ہوا کہ پریس ایکٹ کے ماتحت کارروائی کرکے میری سرگرمیوں کو بند نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس نے ڈفنس آف انڈیا ریگولیشنز سے کام لے کر مجھے کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا. انہیں ریگولیشنز کے ماتحت پنجاب، دہلی، یو پی اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنی حدود کے اندر داخل ہونے کی ممانعت کردی تھی. اب میں

ایک کھلا خط شائع کیا، جس میں لکھا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی اعتبار سے غلط اور سیاسی نقطۂ نظر سے بے سود ہے اگر ایک شخص قتل کیا گیا، تو ہمیشہ کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے کے لئے مل جائیگا در حقیقت تشدد کا نتیجہ ہمیشہ زیادہ سخت تشدد ہوا کرتا ہے یونانیوں کی ایک داستان میں ہے کہ ہر سپاہی جو مارا جاتا، اس کے خون کے چھینٹوں سے ۹۹۹ سپاہی پیدا ہوتے سیاسی مقصد سے قتل کرنا ایسے دشمنوں کی تعداد کو برابر بڑھاتے رہنا ہے ٹالسٹائی نے مشورہ دیا کہ اگر کسی جابر حکومت کو بے بس کرنا ہو، تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے سے انکار کیا جائے، ملازمتوں سے استعفیٰ دیدیا جائے اور تمام اداروں کو بائیکاٹ کیا جائے، جن سے حکومت کو سہارا مل رہا ہو اسے یقین تھاکہ ایسا پروگرام کسی بھی حکومت کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دے گا. مجھے یاد آیا کہ میں نے بھی «الہلال» کے بعض مضامین میں ایسا ہی پروگرام تجویز کیا تھا

دوسروں پر جو اثر ہوا، وہ انکی طبیعت، عادت اور پچھلے تجربہ کے مطابق تھا. حکیم اجمل خاں نے کہا کہ انہیں تجویز پر غور کرنے کے لئے وقت چاہئے. وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسروں کو پروگرام پر عمل کرنے کا مشورہ دیں، جب تک کہ وہ خود اس پر عمل کرنے کو تیار نہ ہوں. مولوی عبدالباری نے کہا کہ گاندھی جی کی تجویز میں بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں اور وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے جب تک کہ وہ مراقبہ نہ کرلیں اور خدا کی طرف سے انہیں کوئی اشارہ نہ ملے. محمد علی اور شوکت علی

دستخط تو کئے، مگر وفد میں شریک نہیں ہوا۔ میری رائے تھی کہ اب معاملہ عرض داشتوں اور وفدوں کی منزل سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ وائسرائے نے اپنے جواب میں کہا کہ اگر برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے کوئی وفد لندن بھیجا جائے، تو وہ اس کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کر دیں گے۔ خود اپنے متعلق انہوں نے کہا کہ وہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے معذور ہیں۔

اب سوال پیدا ہوا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ ایک جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی موجود تھے گاندھی جی نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا انہوں نے کہا کہ اب عرض داشتوں اور وفدوں کا زمانہ گذر گیا ہے۔ ہمیں حکومت کی تائید کرنے اور تقویت پہنچانے سے ہر طرح پرہیز کرنا چاہئے۔ یہی طریقہ حکومت کو آمادہ کرسکتا ہے کہ وہ ہم سے معاملہ کرے انہوں نے تجویز کیا کہ تمام سرکاری خطابات واپس کر دئے جائیں، عدالتوں اور مدرسوں کو بائیکاٹ کیا جائے، ہندوستانی سرکاری ملازمتوں سے استعفٰی دیدیں اور جو نئی قانون ساز جماعتیں بننے والی ہیں، ان میں ہر طرح سے حصہ لینے سے انکار کریں۔

جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تجویز بیان کی، مجھے یاد آیا کہ یہ وہی پروگرام ہے، جس کا خاکہ ٹالسٹائی نے بہت سال پہلے پیش کیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک انارکسٹ نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ٹالسٹائی نے انارکسٹ جماعت کے نام

اس کے بعد ملک کو عدم تعاون کے پروگرام کے لئے تیار کرنے کی غرض سے جگہ جگہ کے دورے کئے گئے۔ گاندھی جی نے ملک کے طول و عرض کا سفر کیا۔ میں بیشتر وقت ان کے ساتھ رہا۔ محمد علی، شوکت علی اکثر ہمارے ہم سفر ہوتے تھے۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا۔ اس وقت تک ملک کا مزاج بدل چکا تھا۔ سی آر۔ داس اب عدم تعاون کے پروگرام کی علانیہ تائید کرتے تھے لالا لاجپت رائے پہلے کچھ خلاف تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ پنجاب کے تمام ڈیلی گیٹ گاندھی جی کی موافقت کر رہے ہیں تو وہ بھی ہم میں شریک ہوگئے اسی سشن سے مسٹر جناح کانگریس سے قطعی طور پر الگ ہوگئے۔

حکومت نے اس کے جواب میں ملک کے طول و عرض میں لیڈروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ بنگال میں مسٹر سی۔ آر۔ داس اور میں سب سے پہلے گرفتار ہونے والوں میں سے تھے۔ سبھاش چندر بوس اور بریندر ناتھ سسمل بھی جیل میں آکر ہم سے مل گئے ہم علی پور سنٹرل جیل کے یوروپین وارڈ میں رکھے گئے اور یہ وارڈ سیاسی گفتگو کا مرکز بن گیا۔

مسٹر سی۔ آر۔ داس کو چھ مہینے کی سزا ملی تھی۔ میرا مقدمہ بہت دنوں تک چلتا رہا اور آخر میں مجھے ایک سال کی سزا ملی، لیکن میں یکم جنوری ۱۹۲۳ء تک رہا نہیں کیا گیا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس پہلے رہا کر دئے گئے تھے اور انہوں نے کانگریس کے گیا سشن کی صدارت کی۔ اس سشن میں کانگریس کے لیڈروں کے درمیاں

نے کہا کہ وہ مولوی عبدالباری کے فیصلے کا انتظار کریں گے . تب گاندھی جی مجھ سے مخاطب ہوئے . میں نے بغیر ایک لمحہ تامل کئے کہدیا کہ میں اس پروگرام کو کلی طور پر صحیح سمجھتا ہوں. اگر لوگ واقعی چاہتے ہیں کہ ترکی کی مدد کریں تو گاندھی جی کے پیش کئے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں.

چند ہفتے بعد میرٹھ میں ایک خلافت کانفرنس ہوئی. یہی کانفرنس تھی، جس میں گاندھی جی نے پہلی بار ایک پبلک پلیٹ فارم سے عدم تعاون کے پروگرام پر عمل کرنے کی تلقین کی ان کے بعد میں نے تقریر کی، جس میں میں نے ان کی غیر مشروط تائید کی.

ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا ایک خاص جلسہ کلکتہ میں گاندھی جی کے تیار کئے ہوئے عملی پروگرام پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا گاندھی جی نے کہا کہ اگر ہم سوراج حاصل کرنا اور خلافت کے مسئلے کو اطمینان بخش طریقے پر حل کرنا چاہتے ہیں تو عدم تعاون کا پروگرام ضروری ہے اس اجلاس کے صدر لالا لاجپت رائے تھے اور سی آر. داس اس کی ممتاز شخصیتوں میں سے تھے. ان دونوں میں سے کوئی بھی گاندھی جی سے متفق نہ تھا. بپن چندر پال نے بہت پرزور تقریر کی اور کہا کہ برطانوی حکومت سے لڑنے کے لئے سب سے اچھا ہتھیار برطانوی مال کا بائیکاٹ ہے. گاندھی جی کے پروگرام کے اور حصوں کے صحیح ہونے کا انہیں کچھ بھی یقین نہیں تھا. ان لوگوں کی مخالفت کے باوجود عدم تعاون کی تحریک کا رزولیوشن بہت بڑی اکثریت سے منظور کر لیا گیا.

اس کی آمد کے ساتھ سیاسی اشتعال بڑھتا گیا سنہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن منظور کیا اور برطانوی حکومت کو مطلع کیا کہ اگر یہ قومی مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو وہ ایک سال بعد حکومت کے خلاف ایک عوامی تحریک شروع کرے گی انگریزوں نے ہمارے مطالبے کو ماننے سے انکار کیا اور سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے اعلان کیا کہ نمک سازی کے قوانین کی خلاف ورزی کی جائیگی جب نمک کی ستیہ گرہ شروع کی گئی تو بہت سے لوگوں کو اس کی کامیابی میں شبہ تھا، لیکن اس کے انتہائی نے حکومت اور قوم دونوں کو حیرت میں ڈال دیا حکومت نے سختی سے اس کے خلاف کارروائی کی اور کانگریس کو خلاف قانون قرار دے کر اس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی گرفتاری کا حکم دیدیا ہم نے اس وار کا مقابلہ اس طرح کیا کہ ہر صدر کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا اختیار دے دیا میں بھی صدر منتخب کیا گیا اور میں نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو نامزد کیا گرفتاری سے پہلے میں نے ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین مقرر کیا پہلے وہ تحریک میں حصہ لینے پر آمادہ نہیں تھے، مگر میں نے انہیں راضی کرلیا اس طرح ہم نے حکومت کو چکر میں ڈال دیا اور اپنی تحریک کو جاری رکھہ سکے

میری گرفتاری ایک تقریر کی بنا پر ہوئی تھی، جو میں نے میرٹھہ میں کی تھی، اس لئے مجھے میرٹھہ جیل میں تقریباً ڈیڑھہ سال قید رکھا گیا۔

شدید اختلاف رائے رونما ہوا سی آر داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں نے سوراج پارٹی قائم کی اور کونسلوں میں داخل ہونے کا پروگرام پیش کیا. گاندھی جی کے راسخ العقیدہ پیرووں نے اس کی مخالفت کی. اس طرح کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، ایک وہ جو پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا تھا، ایک وہ جو تبدیلی چاہتا تھا. جب میں رہا ہوگیا، تو میں نے ان دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی اور کانگریس کے ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء کے اسپیشل سشن میں ایک سمجھوتا ہو گیا اس وقت میری عمر پینتیس سال کی تھی اور مجھ سے اس اجلاس کی صدارت کرنے کو کہا گیا لوگ کہتے تھے کہ اب تک مجھ سے کم عمر کا کوئی شخص کانگریس کا صدر منتخب نہیں ہوا ہے

سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد کانگریس کی سرگرمیوں کی ذمہ‌داری سوراج پارٹی پر رہی اسے تقریباً تمام قانون ساز اسمبلی مجلسوں میں اکثریت حاصل ہوگئی اور اس نے پارلیمنٹ کے محاذ پر قومی آزادی کی جنگ کو جاری رکھا. جو کانگریسی سوراج پارٹی سے الگ رہے، انہوں نے اپنا تعمیری پروگرام جاری رکھا، لیکن وہ نہ اتنی تائید حاصل کر سکے حتی کہ سوراج پارٹی، نہ قوم کو اس درجہ اپنی طرف متوجہ کرسکے. ایسے کئی واقعات پیش آئے، جن کا ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر اثر پڑا، لیکن اس کتاب کے پڑھنے والوں سے میری درخواست ہے کہ مفصل حالات کے لئے میری سوانح عمری کی پہلی جلد کی اشاعت تک انتظار کریں

سنہ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے تقرر اور ہندوستان میں

کانگریس بر سر اقتدار

قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ء کے مطابق جو پہلے انتخابات ہوئے، ان میں کانگریس کو مخالفوں پر بہت نمایاں فتح نصیب ہوئی۔ پانچ بڑے صوبوں میں اسے کامل اکثریت حاصل ہوئی اور چار صوبوں کی مجلسوں میں وہ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی۔ صرف پنجاب اور سندھ میں کانگریس کو مقابلتاً ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔

کانگریس کی اس فتح کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ شروع میں کانگریس کو اسی میں تامل تھا کہ انتخابات میں دوسری پارٹیوں کا مقابلہ کرے۔ قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ء کے ذریعہ صوبجاتی خود مختاری تو دی گئی تھی، مگر دال میں کچھ کالا بھی تھا۔ گورنروں کو یہ خاص حق دیا گیا تھا کہ صورت حال کے خطرناک ہونے کا اعلان کریں اور جب کوئی گورنر ایسا کرتا تو دستور کو معطل کرکے حکومت کے تمام اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ گویا صوبوں میں جمہوری حکومت کی بقا گورنروں کی صواب دید پر منحصر تھی۔ مرکزی حکومت میں صورت حال اور بھی بدتر تھی۔ یہاں دو عملی کے اصول کو، جو صوبوں میں ناکام اور بدنام ہوچکا تھا، دوبارہ بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مرکزی حکومت کو ایک

حکومت اور قوم کی کشمکش ایک سال سے زیادہ جاری رہ چکی تھی، جب لارڈ ارون نے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو رہا کر دیا۔ ہم پہلے الہ آباد میں جمع ہوئے اور پھر دہلی میں، جہاں گاندھی ارون معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کانگریسی رہا کر دئیے گئے اور کانگریس گول میز کانفرنس میں شریک ہوئی۔ ہم نے گاندھی جی کو اپنا واحد نمائندہ بنا کر بھیجا، مگر گفت و شنید لا حاصل رہی اور گاندھی جی خالی ہاتھ واپس آئے۔ لندن سے واپسی کے بعد گاندھی جی کو پھر گرفتار کرلیا گیا اور حکومت نے جبر و تشدد کی پالیسی پر نئے سرے سے عمل شروع کیا۔ لارڈ ولنگڈن نئے وائسرائے مقرر ہوئے اور انہوں نے تمام کانگریسیوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ میں دہلی میں تھا اور مجھے یہاں ایک سال سے زیادہ حراست میں رکھا گیا۔ اس زمانے میں بھی کئی ایسے واقعات ہوئے، جو ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے مگر ان کی تفصیل کے لئے بھی (میری سوانح عمری کی) پہلی جلد کا انتظار کرنا ہوگا۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں قانون حکومت ہند پاس ہوا، جس میں صوبوں کو خود مختاری دی گئی تھی اور مرکز کے لئے وفاقی حکومت تجویز کی گئی تھی۔ یہاں سے واقعات کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے، جسے میں اس کتاب میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اس رائے کا تھا کہ ایسی صورت میں، جبکہ گورنروں کو خاص اختیارات دئیے گئے ہیں اور صوبجاتی خود مختاری ڈھکوسلا ہے، اس لئے کانگریس کے نمائندوں کو عہدے قبول نہ کرنا چاہئے وزارتیں اس وقت تک کام کرسکیں گی، جب تک کہ گورنر کو منظور ہوگا اگر کانگریس ان وعدوں کو پورا کرنا چاہے گی، جو انتخابات کے سلسلے میں کئے گئے ہیں، تو گورنر سے ٹکر ضرور ہوگی، اس لئے وہ کہتے تھے کہ کانگریس کو قانون ساز مجالس کے لئے منتخب ہوکر دستور کو ناقابل عمل بنا دینا چاہئے اس کے بالکل خلاف میری رائے تھی کہ صوبجاتی حکومتوں کو جو اختیارات دیے گئے ہیں، ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور جب گورنر کے اختیارات سے تصادم ہو تو اس وقت جو مناسب معلوم ہو وہ کرنا چاہئے۔ اختیارات سے کام لئے بغیر، کانگریس کے پروگرام پر عمل نہ کیا جاسکے گا دوسری طرف اگر کانگریسی وزارتوں نے کسی ایسے اختلافی معاملے کی وجہ سے استعفا دیا، جس میں قوم کی ہمدردی ان کے ساتھ ہوئی تو اس سے قوم کے ذہن پر کانگریس کا تسلط اور بڑھ جائے گا۔

گورنروں نے اس بحث کے خاتمے کا انتظار نہیں کیا جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس کو وزارتیں بنانے میں تامل ہے، تو انہوں نے ان پارٹیوں کو دعوت دی، جن کی قانون ساز مجلسوں میں اکثریت تو نہیں تھی مگر جن کی کانگریس کے بعد سب سے زیادہ تعداد تھی یہ انٹرم وزارتیں ان لوگوں نے بنائیں، جو کانگریسی نہیں تھے، بلکہ بعض صورتوں میں کانگریس کے مخالف تھے عہدے قبول

کمزور وفاق کی شکل دی گئی تھی اور اس کے علاوہ اس میں
والیان ریاست کے مستقل مفاد کا پلہ بہت بھاری رکھا گیا تھا
اس سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ معمولاً ملک کے برطانوی
حاکموں کا ساتھ دیں گے

اس وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، اگر کانگریس،
جو ملک کی مکمل آزادی کے لئے لڑ رہی تھی، اس نظام کو
منظور کرنے کے خلاف تھی اس نے وفاق کی اس شکل کو جو
مرکزی حکومت کے لئے تجویز کی جارہی تھی، قطعاً ناقابل قبول
ٹھہرایا اور ایک عرصے تک کانگریس ورکنگ کمیٹی اس اسکیم
کے بھی خلاف تھی جو صوبوں کے لئے تجویز کی گئی تھی
کانگریس کا ایک طاقت ور حصہ انتخاب میں شریک ہونے کے بھی
خلاف تھا۔ میری رائے تھی کہ انتخابات کو بائی کاٹ کرنا غلط ہوگا
میں سمجھتا تھا کہ کانگریس نے ایسا کیا تو مرکزی اور صوبجاتی
اسمبلیوں پر ایسے عناصر کا قبضہ ہوجائے گا، جو اتنے اچھے
نہ ہوں گے اور وہ ہندوستانی قوم کے نمائندے بن بیٹھیں گے اس کے
علاوہ میرا خیال تھا کہ انتخابات عوام کی سیاسی تعلیم اور بنیادی
مسائل کو ان کے ذہن نشین کرنے کا بے مثل موقعہ فراہم کریں گے۔
بالآخر وہ نقطۂ نظر جس کی میں نمایندگی کررہا تھا، غالب رہا اور
کانگریس انتخابات میں شریک ہوئی اس کے نتائج وہ ہوئے جو
میں اوپر بیان کرچکا ہوں۔

اب کانگریس کے رہنماؤں کے درمیان نئے اختلافات رونما
ہوئے انتخابات میں جو لوگ شریک ہوئے تھے، ان کا ایک حصہ

مل کیا تھا اور حکومت کی ذمہ داری لینا منظور نہیں کیا تھا۔
ے پہلی مرتبہ اس نے حکومت کو اپنا کام سمجھا اور اس کی
مہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر رضامند ہوگئی
اسی زمانے میں ایک واقعے کی بدولت صوبجاتی کانگریس کمیٹیوں
کی ذہنیت اور رویہ کا ایک پہلو نظروں کے سامنے آیا، جس نے
بہت ناگواری پیدا کی کانگریس نے ایک قومی جماعت کی حیثیت
سے ترقی پائی تھی اور اس نے مختلف مذہبی جماعتوں کے افراد
کو پیشوائی کرنے کے موقعے دئے تھے مسٹر نریمان بمبئی کی
مقامی کانگریس کے مانے ہوئے لیڈر تھے جب صوبے کی وزارت
بنانے کا سوال اٹھا تو سب کو توقع تھی کہ مسٹر نریمان کی حیثیت
اور ان کی کارگذاری کو دیکھتے ہوئے، ان سے کہا جائے گا کہ
اس کی قیادت کریں مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ سردار پٹیل اور
ان کے ساتھی نریمان کو پسند نہیں کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ مسٹر بی جی کھیر بمبئی کے پہلے چیف منسٹر بنے چونکہ
نریمان پارسی اور کھیر ہندو تھے، اس لئے بہت سے لوگوں کو
یہ خیال ہوا کہ نریمان کو فرقہ وارانہ تعصب کی وجہ سے نظر انداز
کیا گیا ہے ایسا الزام صحیح نہ ہو تب بھی اسے غلط ثابت
کرنا مشکل ہوتا ہے۔
مسٹر نریمان قدرتی طور پر اس فیصلے کی وجہ سے بہت پریشان
ہوئے۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس سوال کو
اٹھایا جواہر لال اب بھی صدر تھے اور چونکہ ان کا اپنا دل
فرقہ وارانہ تعصب سے پاک تھا، بہت سے لوگ امید کرتے تھے کہ

کرنے کے معاملے میں کانگریس کے تذبذب نے صرف یہی نہیں ظاہر کیا کہ اس میں اندرونی اختلافات ہیں، اس سے زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ ان قدامت پرست طاقتوں کو جنھوں نے عام انتخابات میں شکست کھائی تھی، سنبھل جانے اور اپنے نقصان کی تلافی کرنے کا موقع مل گیا۔ وائسرائے سے جو طویل گفت و شنید ہوئی، اس کے دوران میں اس سے زبردستی اس کا وعدہ لینے کی کوشش کی گئی کہ گورنر وزارتوں کے کام میں دخل انداز نہ ہوں گے۔ جب وائسرائے نے صورتِ حال واضح کی تو ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں نے اپنی رائے بدل دی اور عہدے قبول کرنے کے موافق ہوگئے، لیکن کانگریس نے قانون حکومت ہند کی اس شدت اور اصرار کیساتھ مخالفت کی تھی کہ اب کوئی پالیسی بدلنے کی تجویز علانیہ پیش کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا، اگرچہ یہ احساس بڑھتا جارہا تھا کہ پالیسی بدلنے کی ضرورت ہے۔ جواہر لال اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ انھوں نے عہدے قبول کرنے کے خلاف ایسا قطعی طور پر اظہار خیال کیا تھا کہ اب ان کے لئے یہ کہنا مشکل ہوگیا تھا کہ عہدے قبول کرلینا چاہئے۔ جب وردھا میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا، تو میں نے دیکھا کہ حقیقت کا اعتراف کرنے میں عجیب سا پس و پیش ہے۔ اس لئے میں نے صاف الفاظ میں تجویز کیا کہ کانگریس کو عہدے قبول کرلینا چاہئے۔ کچھ گفتگو کے بعد گاندھی جی نے میرے نقطۂ نظر کی تائید کی اور کانگریس نے فیصلہ کرلیا کہ صوبوں میں وزارتیں بنائی جائیں، یہ ایک یادگار فیصلہ تھا، اس لئے کہ اب کانگریس نے انکار اور تردید کی پالیسی پر

حب میں سوچتا ہوں کہ برہماں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، میرا ذہن مسٹر سی آر داس کی طرف جاتا ہے یہ ان بہت زبردست شخصیتوں میں سے تھے، جو عدم تعاون کی تحریک کی بدولت منظر عام پر آئیں اور ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ میں ان کی حیثیت خاص اور الگ تھی، ان کی نظر بہت بلند تھی، ان کے عمل میں بڑی وسعت بھی اسی کے ساتھ وہ معاملہ فہم تھے اور مسئلے پر حقیقت بین کے انداز سے غور کرتے تھے وہ جو کچھ جانتے تھے، اسے ظاہر کرنے کی ہمت بھی رکھتے تھے اور اگر وہ کسی معاملے میں سمجھتے کہ انہوں نے جو پوزیشن اختیار کی ہے وہ صحیح ہے تو بغیر کسی خوف اور بیجا لحاظ کے اپنی بات پر قائم رہتے تھے حب گاندھی جی نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا تو پہلے پہل مسٹر داس نے کلکتہ کے سنہ ۱۹۲۰ء کے خاص اجلاس میں اس کی مخالفت کی ایک سال بعد، حب کانگریس کا ناگپور میں اجلاس ہوا تو ہم میں شامل ہوگئے اور عدم تعاون کے پروگرام پر عمل شروع ہوگیا مسٹر داس کی کلکتہ بار میں شاندار پریکٹس تھی اور وہ ملک کے سب سے کامیاب وکیلوں میں تھے، آسائش و آرام کا انہیں جو شوق تھا، وہ بھی مشہور تھا، مگر انہوں نے ایک لمحہ پس و پیش کئے بغیر اپنی پریکٹس چھوڑ دی، کھدر کو زیب تن کیا اور دل و جان سے کانگریس کی تحریک میں شریک ہوگئے. میرے دل پر ان کا بہت اثر پڑا.

جیسا کہ بیان کرچکا ہوں، مسٹر داس معاملہ فہم تھے، سیاسی مسائل کو وہ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ اچھا اور قابل عمل کیا

نریمان کی جو حق تلفی ہوئی ہے، اس کا وہ تدارک کریں گے
بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا جواہر لال بہت سے مسئلوں میں
سردار پٹیل سے اختلاف کرتے تھے، دوسری طرف وہ نہیں
سمجھتے تھے کہ سردار پٹیل محض فرقہ وارانہ مصلحتوں کی بنیاد
پر کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں. نریمان کی معروضات کا ان پر اچھا
اثر نہیں پڑا اور انہوں نے ان کی اپیل کو نامنظور کردیا.

نریمان کو جواہر لال کے رویہ پر بہت حیرت ہوئی. اس کے
بعد انہوں نے گاندھی جی کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ اپنے
معاملے کو ان کے اوپر چھوڑ دیں گے گاندھی جی نے ان کے
بیان کو صبر کے ساتھ سنا اور ہدایت دی کہ سردار پٹیل پر جو
الزام لگایا گیا ہے، اس کی تحقیق کسی غیر جانب دار شخص
کے ذریعے کرائی جائے

چونکہ نریمان خود پارسی تھے، سردار پٹیل اور ان کے دوستوں
نے تجویز کیا کہ تحقیقات کسی پارسی کے سپرد کی جائے. انہوں نے
یہ چال بہت سوچ کر چلی تھی اور مقدمہ کو اس طرح تیار کیا
تھا کہ اصل معاملے نظر سے چھپے رہیں اس کے علاوہ انہوں نے
مختلف طریقوں سے اپنا اثر اس طرح ڈالا کہ تحقیقات شروع ہونے
سے پہلے ہی بیچارے نریمان مقدمہ ہار گئے. یہ بہرحال قطعی طور
پر ثابت کرنا دشوار تھا کہ نریمان کو صرف ان کے پارسی ہونے
کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا ہے، اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ
سردار پٹیل کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہے بیچارے نریمان کا
دل ٹوٹ گیا اور ان کی پبلک زندگی ختم ہو گئی.

بغیر کسی جوش اور مسرت کے کیا گیا. کلکتہ اس کے قیام کا
آخری مقام تھا، جو اس وقت ہندوستان کے شہروں میں سب سے
زیادہ اہمیت رکھتا تھا دارالسلطنت دہلی کو بنا دیا گیا تھا، لیکن
وائسرائے ہر سال کرسمس منانے کے لئے کلکتہ جاتا. اس موقعے پر
ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا گیا اور ولی عہد برطانیہ وکٹوریہ
میموریل ہال کا افتتاح کرنے والا تھا، اس لئے اس کے استقبال
کے لئے بہت پرتکلف انتظام کیا گیا. حکومت نے اس کے کلکتہ
کے قیام کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا.

اس وقت ہم سب علی پور جیل میں تھے. پنڈت مدن موہن مالویہ
کوشش کر رہے تھے کہ کانگریس اور حکومت کے درمیان
سمجھوتا ہوجائے. انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اس سے
یہ اثر لیکر آئے کہ اگر ہم کلکتہ میں ولی عہد کا بائیکاٹ نہ کریں
تو حکومت کانگریس سے کوئی معاملہ کرلے گی پنڈت مدن موہن
مالویہ، مسٹر داس سے اور مجھ سے اس تجویز پر گفتگو کرنے
کے لئے علی پور جیل آئے. تجویز کی بنیاد اس پر تھی کہ ہندوستان
کے سیاسی مستقبل کو طے کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس
بلائی جائے. ہم نے پنڈت مالویہ کو قطعی جواب نہیں دیا، اس
لئے کہ ہم پہلے آپس میں گفتگو کر لینا چاہتے تھے. مسٹر داس
اور میں دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ حکومت ہند سمجھوتا کرنے
پر اس وجہ سے مجبور ہوئی ہے کہ ہم ولی عہد برطانیہ کا بائیکاٹ کر
رہے ہیں. ہمیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر گول میز کانفرنس کی
تجویز کو منظور کر لینا چاہئے. یہ بات تو ظاہر تھی کہ اس کی

ہے ان کی رائے تھی کہ اگر ہندوستان کو گفت و شنید کے ذریعے آرادی حاصل کرنا ہے، تو ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ ایک ایک قدم آگے بڑھیں، کیونکہ بحث کرنے اور سمجھانے کا طریقہ اختیار کیا گیا، تو آرادی اچانک گود میں نہ ٹپک پڑے گی انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ آرادی کی راہ میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ ہم صوبجاتی خود مختاری حاصل کریں گے. انہیں یقین تھا کہ محدود اختیارات سے کام لینا بھی ہندوستان کو آراد کرانے کے مقصد میں مددگار ثابت ہوگا اور ہندوستانی جیسے جیسے نئے اختیارات حاصل کریں گے، ویسے ہی وہ دمہداریوں کو پورا کرنے کے لئے تیار بھی ہوتے جائیں گے مسٹر داس کی دور اندیشی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے انتقال کے قریب دس سال بعد قانون حکومت ہند اسی نہج پر مرتب اور منظور کیا گیا.

سنہ ۱۹۲۱ء میں مانٹیگو چیمز فورڈ اسکیم کے مطابق شاہ برطانیہ کے ولی عہد اصلاحات کا افتتاح کرنے کے سلسلے میں ہندوستان آئے کانگریس نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کے استقبال کے لئے جتنے جلسے وغیرہ ہوں گے، ان کا وہ بائیکاٹ کرے گی اس سے حکومت ہند بڑی مشکل میں پڑ گئی وائسرائے نے برطانوی حکومت کو یقین دلایا تھا کہ ملک میں شہرادے کا پرجوش استقبال کیا جائیگا. جب انہیں کانگریس کے فیصلے کی خبر ہوئی، تو انہوں نے بائیکاٹ کو ناکام کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی. یہ تدبیریں کارگر نہیں ہوئیں اور تقریباً ہر شہر میں جہاں شہرادہ گیا، اس کا استقبال

کرنا غلط ہے جب حکومت اس پر راضی تھی کہ کانگریسی لیڈر گول میز کانفرنس سے پہلے رہا کر دئیے جائیں گے، تو اس اصرار سے کوئی مطلب نہیں نکلتا تھا پنڈت مالویہ نے پھر گاندھی جی کے پاس جاکر ہماری رائے بیان کی، مگر انہوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ وائسرائے نے اپنی تجویز و گفتگو کا سلسلہ بند کر دیا اس نے خاص طور پر تجویز اس لئے پیش کی تھی کہ ولی عہد کا کلکتہ میں بائیکاٹ نہ ہو چونکہ کوئی سمجھوتا نہیں کیا گیا تھا، اس لئے بائیکاٹ بہت کامیاب رہا، لیکن ہم نے سمجھوتا کرنے کا بہت ہی اچھا موقعہ ہاتھ سے جانے دیا مسٹر داس نے اپنی ناپسندیدگی اور مایوسی کو ظاہر کرنے میں تکلف نہیں کیا

اس کے بعد گاندھی جی نے بمبئی میں کانفرنس بلائی جس کے صدر سی شنکر نایر تھے اس کانفرنس میں خود گاندھی جی نے گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی. ان کی شرطیں تقریباً وہی تھیں، جو پنڈت مالویہ (وائسرائے کی طرف سے) لیکر آئے تھے. لیکن اس دوران میں ولی عہد برطانیہ ہندوستان سے جا چکے تھے اور حکومت کو اس معاملے سے دلچسپی نہیں رہی تھی. اس نے گاندھی جی کی تجویز پر بالکل غور ہی نہیں کیا اور اسے قطعی طور پر نامنظور کر دیا مسٹر داس کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے کہا کہ گاندھی جی نے سخت غلطی کی ہے مجھے بھی ماننا پڑا یہ کہ رائے صحیح ہے.

اس کے بعد پھر گاندھی جی نے چوری چورہ کے حادثے کی وجہ سے عدم تعاون کی تحریک کو معطل کر دیا. سیاسی حلقوں

بدولت ہمارا اصل اور آخری مقصد حاصل نہ ہوگا، پھر بھی ہم اپنی سیاسی جدو جہد میں بہت آگے بڑھ جائیں گے گاندھی جی کے کے سوا باقی تمام کانگریسی لیڈر جیل میں تھے ہم نے تجویز کیا کہ ہمیں برطانوی پیش کش کو قبول کر لینا چاہئے. مگر ہم نے اسی کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ گول میز کانفرس کے اجلاس سے پہلے تمام کانگریسی لیڈر رہا کر دئے جائیں

دوسرے دن جب پنڈت مالویہ ہم سے ملنے آئے تو ہم نے اپنی رائے بیان کی ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ انہیں گاندھی جی سے مل کر ان کی رضا مندی حاصل کر لینا چاہئے پنڈت مالویہ نے وائسرائے سے ملاقات کرکے ہماری گفتگو بیان کی اور پھر دو دن بعد ہم سے جیل میں ملے انہوں نے ہمیں بتایا کہ حکومت ہند ان تمام سیاسی لیڈروں کو رہا کرنے پر تیار ہے، جو گفتگو میں حصہ لینے والے ہوں ان میں علی برادران اور بہت سے کانگریس لیڈر شامل تھے ہم نے ایک بیان تیار کیا، جس میں ہمارے خیالات وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے تھے. پنڈت مالویہ اس بیان کو لیکر گاندھی جی سے ملنے کے لئے بمبئی گئے

ہمیں یہ معلوم کرکے حیرت اور افسوس ہوا کہ گاندھی جی نے ہماری تجویز کو منظور نہیں کیا انہیں اصرار تھا کہ پہلے تمام سیاسی لیڈر اور خاص طور سے علی برادران بغیر کسی شرط کے رہا کر دئے جائیں. انہوں نے کہا کہ وہ گول میز کانفرس کی تجویز پر اسی وقت غور کریں گے، جب تمام لیڈر رہا کئے جا چکے ہوں گے مسٹر داس اور مجھے دونوں کو محسوس ہوا کہ یہ مطالبہ

کرنے کا ذریعہ بنانا چاہئے۔ مسٹر داس کو امید تھی کہ کانگریس کے تمام مستعد لیڈران کی تشخیص اور علاج کو تسلیم کرلیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ حد سے زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں، مگر اس بات سے مجھے اتفاق تھا کہ جب وہ قید سے چھوٹیں تو دوستوں سے مشورہ کرکے ملک کے لئے ایک نیا پروگرام بنائیں۔

مسٹر داس اس وقت رہا ہوئے، جب گیا گانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا رسپشن کمیٹی نے ان کو اپنا صدر منتخب کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ ملک کو اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کر لیں گے۔ ان کی ہمت اور بڑھ گئی جب انہوں نے دیکھا کہ حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو اور وٹھل بھائی پٹیل ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہیں۔ اپنے خطبۂ صدارت میں مسٹر داس نے تجویز کیا کہ کانگریس کونسلوں میں داخل ہونے کے پروگرام کو منظور کر لے اور سیاسی جنگ، قانون ساز مجلسوں کے اندر جاری کرے۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ کانگریس کے ایک حصہ نے شری راج گوپال اچاری کی سرکردگی میں مسٹر داس کی مخالفت کی انہیں اندیشہ تھا کہ عملی احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیا گیا اور مسٹر داس کا پروگرام اختیار کیا گیا، تو حکومت اس سے یہ نتیجہ نکالے گی کہ گاندھی جی کی قیادت سے انحراف کیا گیا ہے۔

میرے خیال میں شری راج گوپال اچاری کا استدلال صحیح نہیں تھا۔ مسٹر داس حکومت سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست
کی وصا پیدا ہو گئی. حکومت ے اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا
اور گاندھی حی کو گرفتار کرلیا. اہیں چھ برس قید کی سرا دی
گئی اور عدم تعاون کی تحریک دم توڑ کر ختم ہو گئی

مسٹر داس تقریباً روزانہ مجھ سے صورت حال پر گفتگو کیا
کرتے تھے اہیں یقین تھا کہ تحریک بند کرے میں گاندھی حی
ے ایسی غلطی کی ہے، حس سے شدید نقصان ہوگا اس ے
سیاسی کام کرے والوں کی ہمتیں اتی پست کر دی ہیں کہ اب
پبلک میں برسوں تک حوش دوبارہ پیدا نہ کیا حاسکے گا. اس کے
علاوہ مسٹر داس کی رائے تھی کہ مقصد کو براہ راست حاصل
کرے کی کوشش حو گاندھی حی ے کی تھی، صحیح طریقہ نہیں ہے.
ان کا حیال تھا کہ اب ہمیں پبلک کی ہمت اور حوش کو بحال
کرے کے لئے نئی تدبیریں کرنی چاہئیں وہ ایسی پالیسی کی
موافقت میں نہیں تھے کہ بیٹھ کر انتظار کیا حائے اور دیکھا
حائے کہ حالات کب بہتر ہوتے ہیں. وہ سمجھتے تھے کہ پرانے
پروگرام کے بجائے کوئی دوسرا راستہ احتیار کرنا چاہئے اور اس
وقت حو صورت حال تھی، اس کے پیش نظر عملی احتجاج کے طریقے
کو چھوڑ کر قانون ساز مجلسوں کو سیاسی جنگ کا میدان بنانا
چاہئے. گاندھی جی کے کہنے سے کانگریس ے سنہ ۱۹۲۱ء کے
انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا مسٹر داس ے یہ رائے ظاہر کی کہ
کانگریس کو سنہ ۱۹۲٤ء میں قانون ساز مجلسوں پر قبضہ کرے کی
تیاری کرنا چاہئے اور انہیں ملک کے سیاسی مقاصد کو حاصل

جدوجہد کی طرف پوری طرح متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا مجھے خوشی ہے میری کوششیں بار آور ہوئیں۔ دہلی میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس ہوا اور دونوں فریقوں کی رضامندی سے میں اس کا صدر منتخب کیا گیا

میں نے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ ہمارا اصل مقصد ملک کو آزاد کرنا ہے سنہ ۱۹۱۹ء سے ہم عملی احتجاج کے پروگرام پر عمل کرتے رہے تھے اور اس سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوا اب اگر ہم میں سے بعض کو یہ محسوس ہوا تھا کہ قانون ساز اسمبلی کو جدوجہد کا میدان بنانا چاہئیے، تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم کٹرپن کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہیں جب تک اس کا اطمینان رہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین ایک ہی ہے، تب تک ہر گروپ کو اختیار ہونا چاہئیے کہ جس پروگرام کو وہ سب سے زیادہ مفید اور موثر سمجھتا ہو اس پر عمل کرے۔

دہلی کانگریس کا فیصلہ میری توقعات کے مطابق ہوا اور یہ طے ہو گیا کہ "پروچینجر" اور "نو چینجر" دونوں آزادی کے ساتھ اپنے پروگرام پر عمل کر سکیں گے ڈاکٹر راجندر پرشاد، سری راج گوپال اچاری اور ان کے ساتھیوں نے اپنے تعمیری پروگرام کو اٹھایا مسٹر سی۔ آر داس، پنڈت موتی لال اور حکیم اجمل خان نے سوراج پارٹی قائم کی اور انتخابات میں مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ان کی اس تحریک نے پورے ملک میں بہت جوش پیدا کیا اور مرکزی اور صوبجاتی اسمبلیوں میں بہت سے لوگ سوراج پارٹی کے ساتھ ہو گئے

ان کے مدنظر صرف نہ تھا کہ سیاسی جدوجہد کو کسی دوسرے میدان میں جاری کیا جائے انہوں نے یہ بات وضاحت اور تفصیل سے سمجھائی، مگر کانگریس کے عام ممبروں کو قائل نہ کر سکے شری راج گوپال اچاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تجویز کو نامنظور کرا دیا گیا۔ کانگریس دو مخالف حصوں میں تقسیم ہوگئی اور مسٹر داس نے استعفا دیدیا اب کانگریس کی ساری طاقت دو فریقوں کی باہمی جنگ میں صرف ہونے لگی، جن میں سے ایک «نوچینجرس [1]» اور دوسرا «پروچینجرس [2]» کہلاتا تھا

کوئی چھ مہینے بعد میں بھی قید سے چھوٹا میں نے دیکھا کہ کانگریس کے لئے بہت سخت خطرہ درپیش ہے اور تمام کانگریسیوں کی قوت انگریزوں کے خلاف لڑنے کے بجائے خانہ جنگی میں صرف ہو رہی ہے مسٹر داس، پنڈت موتی لال اور حکیم اجمل خاں «پروچینجر» گروہ کے سردار تھے راجا جی، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد «نو چینجر» جماعت کی وکالت کر رہے تھے دونوں نے مجھے اپنی طرف لانے کی کوشش کی، مگر میں قطعی طور پر کسی فریق کی طرف ہو جانے سے انکار کرتا رہا مجھے یہ اندرونی اختلافات بہت خطرناک معلوم ہو رہے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ اگر انہیں بروقت دور نہ کیا گیا تو کانگریس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اس لئے میں نے طے کیا کہ دونوں مخالف فریقوں سے الگ رہوں گا اور ملک کو سیاسی

سے وہ تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ تھے۔ اگرچہ آبادی میں ان کی تعداد پچاس فیصدی سے زیادہ تھی، ایک سرکاری ملازمتوں میں ان کو تیس فی صدی عہدے بھی نہیں ملے تھے۔ مسٹر سی آر۔ داس بڑے حقیقت شناس تھے اور انھوں نے فوراً محسوس کیا کہ مسئلہ دراصل معاشی ہے انھوں نے صاف طور پر دیکھا کہ جب تک مسلمانوں کو ان کے مستقبل کے بارے میں یقین نہیں دلایا جائے گا، تب تک اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ دل سے کانگریس کے ساتھ ہوں گے۔ اس لئے انھوں نے ایک اعلان کیا، جس سے صرف بنگال نہیں بلکہ پورا ہندوستان بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جب بنگال میں حکومت کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھوں میں آجائے گی، تو وہ تمام نئے تقررات میں ساٹھ فیصدی عہدے مسلمانوں کے لئے مخصوص کردے گی، جب تک کہ آبادی کی نسبت سے انہیں صحیح نمائندگی حاصل نہ ہو جائے۔ کلکتہ کارپوریشن کے معاملے میں وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور کہا کہ وہ انہیں شرطوں کے ساتھ اسی فی‌صدی تقررات مخصوص کر دیں گے۔ انہوں نے اس طرف توجہ دلائی کہ جب تک مسلمانوں کی پبلک زندگی اور ملازمتوں میں مناسب نمائندگی نہ ہوگی، بنگال میں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم نہ کی جا سکے گی۔ جب ایک مرتبہ عدم مساوات کے اثرات مٹا دیے جائیں گے، تو مسلمان دوسری مذہبی جماعتوں سے برابر کا مقابلہ کر سکیں گے اور ان کے لئے خاص طور سے ملازمتوں اور عہدوں کو مخصوص کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

نو "چینجروں" کا ایک بہت بڑا اعتراض یہ تھا کہ کونسلوں میں داخل ہونے کا پروگرام گاندھی جی کی قیادت کو کمزور کر دے گا. واقعات نے ان کی رائے کو غلط ثابت کیا مرکزی مجلس میں سوراج پارٹی نے یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ گاندھی جی کو فوراً رہا کر دیا جائے ریزولیوشن کے منظور ہونے سے پہلے ہی گاندھی جی رہا کر دئے گئے

میں نے یہ کہا ہے کہ مرکزی اور صوبجاتی مجلسوں میں بہت سے لوگ سوراج پارٹی میں شامل ہو گئے. شاید اس پارٹی کی سب سے نمایاں کامیابی یہ تھی کہ اس نے وہ نشستیں حاصل کرلیں جو مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں. بڑی حد تک یہ مسٹر داس کی اس سیاسی حقیقت شناسی کا نتیجہ تھا، جس کی طرف میں اوپر اشارہ کرچکا ہوں. انتخابات کے حلقے فرقہ وارانہ تھے اور صرف مسلمان ووٹر مسلمان نمائندوں کو منتخب کرسکتے تھے اس طرح سے مسلم لیگ اور دوسری فرقہ پرست پارٹیوں کو اس کا موقعہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں خوف پیدا کرکے اپنا کام نکالیں اور وہ عام طور سے ایسے امیدواروں کو منتخب کرا لیتی تھیں، جن کا رجحان فرقہ پرستی کی طرف تھا. مسٹر داس بنگالی مسلمانوں کی تشویش کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے علانیہ ان کو اپنا رہنما مان لیا. جس طریقے سے مسٹر داس نے بنگال کے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کیا وہ ایک یادگار ہے اور اسے آج کل بھی ایک اچھی نظیر سمجھنا چاہئے.

بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، مگر بعض اسباب کی وجہ

ذمہ داری لی یہ اس کے لئے ایک آزمائش تھی اور لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ کس طرح سے اور کس حد تک اپنے عمل سے اپنی قومی حیثیت ظاہر کرتی ہے مسلم لیگ کانگریس کے خلاف یہ پروپگنڈا کررہی تھی کہ وہ صرف دکھانے کے لئے قومی حیثیت رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس نے اصولی طور پر کانگریس کو بدنام کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ ظاہر کیا کہ کانگریسی وزارتیں اقلیتوں پر ظلم اور زیادتی کررہی ہیں اس نے ایک کمیٹی مقرر کی، جس نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کے الزامات لگائے میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ الزام بالکل بے بنیاد تھے، یہی رائے وائسرائے اور مختلف صوبوں کے گورنروں کی تھی اس طرح لیگ کی تیار کی ہوئی رپورٹ کا سمجھدار لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا

کانگریس نے عہدے قبول کئے تو وزارتوں کے کام کی نگرانی کرنے اور انہیں عام ہدایتیں دینے کی غرض سے ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا یہ بورڈ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مجھ پر مشتمل تھا اس طرح کئی صوبوں یعنی بنگال، بہار، یو پی، پنجاب، سندھ اور سرحد کے پارلیمنٹری معاملات میرے سپرد تھے ہر واقعہ جس میں کوئی فرقہ وارانہ رنگ یا مسئلہ ہوتا میرے سامنے پیش ہوا کرتا تھا۔ اس لئے میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ بے انصافی کرنے کے جتنے الزام مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے لگائے وہ بالکل جھوٹے تھے۔ اگر ان میں حقیقت

اس دلیرانہ اعلان نے بنگال کی کانگریس کی بنیادیں ہلا دیں بہت سے کانگریسی لیڈروں نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور مسٹر داس کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کردی ان پر موقعہ پرست، مصلحت پرست اور مسلمانوں کے طرفدار ہونے کا الزام لگایا گیا، لیکن وہ ایک چٹان کی طرح اپنی جگہہ پر قائم رہے انہوں نے پورے صوبے کا دورہ کرکے اپنا نقطۂ نظر سمجھایا اور بنگال کے باہر مسلمانوں پر ان کا بہت زبردست اثر پڑا مجھے یقین ہے کہ ان کا قبل از وقت انتقال نہ ہو جاتا، تو وہ ملک میں ایک نئی فضا پیدا کردیتے یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بعض پیروؤں نے ان کے نظریے پر حملے کئے اور ان کے اعلان کو مسترد کر دیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کانگریس سے الگ ہوگئے اور صوبے کی تقسیم کے لئے زمین تیار ہونے لگی

یہاں پر مجھے ایک بات صاف کر دینا چاہئے بمبئی کی صوبجاتی کانگریس کمیٹی کا مسٹر نریمان کو مقامی قیادت سے محروم کرنا غلط تھا اور ورکنگ کمیٹی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس غلطی کا تدارک کرے اس ایک لغزش کے سوا کانگریس نے اپنے اصولوں کے مطابق عمل کرنے کی ہر طرح سے کوشش کی، جب ایک مرتبہ وزارتیں بن گئیں تو اس کا اطمینان کرنے کے لئے کہ ہر اقلیت کے ساتھ انصاف برتا جائے گا. ضروری تدبیریں اختیار کی گئیں.

یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ کانگریس نے اپنے اوپر حکومت کی

کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کس طرح مدد کی۔
اختلاف کی یہ شکل تو اب نہیں رہی تھی، لیکن سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد
کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، جن میں سے ایک قدامت پسند
اور دوسرا ترقی پسند کہلاتا تھا قدامت پسند مستقل حقوق
رکھنے والوں کے حمایتی مانے جاتے تھے، اس کے برخلاف
ترقی پسند اپنے انقلابی جوش کی بدولت پھل پھول رہے تھے
میں نے قدامت پسندوں کے اندیشوں کا پورا لحاظ کیا، مگر اسی
کے ساتھ اصلاحات کے معاملے میں مجھے ترقی پسندوں سے ہمدردی
تھی، اس وجہ سے میرے لئے ممکن تھا کہ انتہا پسندی کی دونوں
شکلوں کے درمیان بیچ کا راستہ نکالوں اور مجھے امید تھی
کہ کانگریس ثابت قدمی کے ساتھ اور بغیر کسی تصادم کے
اپنے منصوبوں کو پورا کرسکے گی لیکن کانگریس کے الکشن
پروگرام کی تدریجی تکمیل کے تمام منصوبے سنہ ۱۹۳۹ء میں
بین الاقوامی قوتوں کی کشمکش نے معطل کردئے

کا شائبہ بھی ہوتا تو میں ضرور اس کا انتظام کرتا کہ بے انصافی کا تدارک کیا جائے۔ اگر اور کوئی صورت نہ ہوتی تو ایسے معاملہ پر استعفا بھی دے دیتا۔

کانگریسی وزارتیں دو سال سے کچھ کم برسر اقتدار رہیں، مگر اس تھوڑی سی مدت میں بھی کئی مسئلے اصولی طور پر طے ہوگئے۔ زمینداری یا زمین کی ملکیت کے بارے میں قانون، زرعی قرضداری کا خاتمہ اور بچوں اور بالغوں کی تعلیم کا بہت بڑے پیمانے پر انتظام ایسے امور ہیں، جن کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔

زمینداری کا انسداد اور زرعی قرضداری کی منسوخی ایسے مسئلے نہیں تھے کہ آسانی سے طے ہوجاتے۔ ان کے متعلق قانون بنانا قدیمی حقوق پر حملہ کرنا تھا، اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان مستقل حقوق کے حاملوں نے کانگریس کا قدم قدم پر مقابلہ کیا۔ بہار میں زرعی اصلاح کی کارروائیوں کی زور دار مخالفت کی گئی اور اس معاملے کو طے کرنے کے لئے مجھے ذاتی طور پر دخل دینا پڑا۔ زمینداروں سے بہت طویل بحث و گفتگو کے بعد ہم نے ایک ایسا فارمولا بنا لیا، جس سے ان کے وہ اندیشے جو بیجا نہیں ٹھہرائے جاسکتے تھے دور ہوگئے اور کسانوں کو ان کے حقوق کے بارے میں بھی پورا اطمینان دلا دیا گیا۔

ہم ایسے نازک اور پیچیدہ مسئلوں کو بڑی حد تک اس وجہ سے حل کرسکے کہ میں کانگریس کے کسی طرز خیال کے لوگوں کا وکیل یا نمایندہ نہیں مانا جاتا تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ سنہ ۲۴ـ۱۹۲۳ء میں میں نے «پرو چینجر» اور «نو چینجر» فریقوں

« کانگریس اس بات کو ضبط تحریر میں لانا چاہتی ہے کہ وہ برطانیہ کی خارجی پالیسی کو قطعی ناپسند کرتی ہے، جس کا انجام میونچ کا معاہدہ، برطانوی اطالوی معاہدہ اور ہسپانیہ کے باغیوں کی حکومت کو قانوناً تسلیم کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے. یہ پالیسی دوسرا نام ہے جمہوریت کے ساتھ غداری، متواتر عہد شکنی، اجتماعی تحفظ کے نظام کی بیخ کنی اور ایسی حکومتوں سے تعاون کا جو خود اپنے آپ کو جمہوریت اور آزادی کی دشمن ٹھہراتی ہیں. اسی پالیسی کی بدولت دنیا میں بین الاقوامی فساد کی ایک کیفیت پیدا ہورہی ہے، جس میں بیمانہ تشدد کو شاندار کامیابی ہوتی ہے، بغیر کسی رکاوٹ کے پھل پھول رہا ہے اور قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کررہا ہے اور امن قائم رکھنے کے بہانے سے ایک ہیبت ناک جنگ کی تیاری عظیم الشان پیمانے پر کی جارہی ہے وسطی اور جنوب مغربی یورپ میں بین الاقوامی اخلاق اس درجہ گرگئے ہیں کہ دنیا کے سامنے یہودی نسل کے لوگوں کے ساتھ نازسی حکومت کا منظم وحشت انگیز برتاؤ اور ہسپانیہ کی باغی فوجوں کے ہوائی جہازوں کے شہروں اور غیر مسلح آبادی اور بے سہارا پناہ گزینوں پر مسلسل بمباری کرنے کے وحشت ناک منظر پیش کئے گئے.

« کانگریس یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا برطانیہ کی اُس بیرونی پالیسی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، جس نے پابندی کے ساتھ فاشسٹ طاقتوں کو مدد پہنچائی ہے اور جمہوری ملکوں کی تباہی و بربادی میں معاون ہوئی ہے. کانگریس امپیریلزم اور فاشزم

یورپ میں جنگ

پچھلے باب میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کا پس منظر ایک تیرہ و تار فضا تھی اور جنگ کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس پوری مدت میں جو ہماری نظر کے سامنے گذری ہے، بین الاقوامی تعلقات بگڑتے جارہے تھے اور ظاہر ہو رہا تھا کہ جنگ سے بچنے کی کوئی صورت نہ نکلے گی جیسے ہی آسٹریا جرمن ریاست میں شامل ہوا، ویسے ہی جرمنوں نے سوڈٹین لانڈ کے لئے مطالبے کرنا شروع کردیا۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی ہونے ہی کو ہے، جب مسٹر چمبرلین نے ڈرامائی انداز سے میونچ کا سفر کیا۔ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان سمجھوتا ہوگیا، چکوسلوواکیہ کا ایک حصہ بغیر لڑائی کے جرمنی کے قبضہ میں آگیا۔ اس وقت خیال ہوتا تھا کہ بلا ٹل گئی ہے، مگر بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ میونچ کے معاہدے سے امن قائم رکھنے میں کچھ مدد نہیں ملی۔ اس کے برخلاف اس سے جنگ کا امکان اور قوی ہوگیا اور اس کے ایک سال کے اندر ہی برطانیہ، جرمنی سے اعلان جنگ کرنے پر مجبور ہوگیا۔

یورپ میں جو کچھ ہورہا تھا اس پر کانگریس کو افسوس تھا۔ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء میں تری پورہ کے اجلاس میں اس نے مندرجہ ذیل ریزولیوشن منظور کیا تھا۔

نازیزم اور فاشزم کی قوت کا نمائندہ ہے، دوسرا جمہوری طاقت کا. میرے دل میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر ان دونوں میں تصادم ہو تو ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کا ساتھ دینا چاہئیے، بشرطیکہ وہ آزاد ہو. لیکن اگر برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد تسلیم نہ کیا، تو یہ توقع کرنا بہت بیجا ہوگا کہ ہندوستان خود آزادی سے محروم رہ کر دوسری قوموں کی آزادی کے لئے لڑے گا ایسی صورت ہوئی تو ہندوستان کو تعاون نہ کرنا چاہئیے اور جنگ کی سرگرمیوں میں برطانوی حکومت کی مدد نہ کرنا چاہئیے. اور معاملوں کی طرح اس میں بھی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں اختلاف تھا. ان میں سے بعض کے خیالات دراصل صاف نہیں تھے. پنڈت جواہر لال نہرو کو بحیثیت مجموعی مجھ سے اتفاق تھا. مگر ایسے بہت تھے جو محسوس کرتے تھے کہ انہیں گاندھی جی کا ساتھ دینا چاہئیے، لیکن وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ گاندھی جی کی پالیسی پر اس کی انتہا تک عمل کیا گیا، تو وہ ایک بند گلی میں پہنچا دیگی، اس وجہ سے وہ شش و پنج میں تھے، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے معاملے کے ہر پہلو پر غور کیا، مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکی.

اِدھر کانگریس اس طرح پس و پیش کر رہی تھی، اُدھر اعلان جنگ کے فوراً بعد ہندوستان میں ایک غیر معمولی صورت حال پیدا ہو گئی. برطانیہ نے ۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا، تو اس نے کامن ویلتھ کے تمام اراکان سے ایسا ہی کرنے کی درخواست کی. ہر ڈومینین کی پارلیمنٹ

دونوں کے خلاف ہے اور اسے یقین ہے کہ دنیا کے امن اور ترقی کے لئے لازمی ہے کہ ان دونوں کا خاتمہ کر دیا جائے. کانگریس کی رائے میں اس کی انتہائی ضرورت ہے کہ ہندوستانی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی بیرونی پالیسی خود طے کریں اور اس طرح امپیریلیزم اور فاشزم دونوں سے الگ رہتے ہوئے، امن اور آزادی کی راہ پر قدم بڑھائیں.»

جیسے جیسے بین الاقوامی افق پر طوفان گھرتے ہوئے نظر آئے، گاندھی جی کے ذہن پر گہری مایوسی طاری ہوتی گئی اس سارے زمانے میں وہ ایک شدید ذہنی بحران سے گذر رہے تھے. یورپ اور امریکہ کی انجمنیں اور افراد ان سے درخواست کرتے رہتے تھے کہ جنگ کی بلا کو، جو سر پر آن کر کھڑی ہوئی تھی، دفع کرنے کی کوئی تدبیر کریں، اور اس سے ان کا روحانی کرب اور بڑھتا تھا. ساری دنیا کے امن پسند انہیں اپنا قدرتی رہنما مانتے تھے، جس کی مدد سے امن قائم رکھا جا سکتا تھا.

گاندھی جی نے اس مسئلے پر بہت غور کیا اور آخر کار کانگریس ورکنگ کمیٹی سے کہا کہ ہندوستان کو اس خطرناک بین الاقوامی صورت حال کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر دینا چاہئے. ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کو کسی حالت میں بھی اس ہونے والی جنگ میں شریک نہ ہونا چاہئے خواہ شرکت کرنے سے ہندوستان کو آزادی ہی حاصل ہو جائے.

مجھے گاندھی جی سے اس معاملے میں اختلاف تھا مجھے یہ نظر آرہا تھا کہ یورپ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے. ایک

حالات پیدا ہوئے ہیں، ان پر ورکنگ کمیٹی نے پوری توجہ سے غور کیا۔ کانگریس کئی بار بیان کر چکی ہے کہ جنگ چھڑ جانے پر قوم کو کن اصولوں کے مطابق عمل کرنا چاہئے اور ایک ہی مہینہ ہوا اس کمیٹی نے ان اصولوں کو دہرایا تھا اور ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی رائے کی جو تحقیر کی تھی، اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ برطانوی حکومت کی اس پالیسی سے علیحدگی اور بے تعلقی ثابت کرنے کے لئے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ورکنگ کمیٹی نے مرکزی قانون ساز مجلس کے کانگریسی ممبروں کو ہدایت دی کہ وہ مجلس کے اگلے سشن میں شریک نہ ہوں اس کے بعد یہ ہوا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو جنگ میں شریک قرار دیا، آرڈیننس جاری کئے، قانون حکومت ہند کا ترمیمی بل پاس کیا اور ایسی ہی اور دور رس کارروائیاں کیں، جو ہندوستانی قوم کے لئے موت و حیات کا مسئلہ بن سکتی ہیں اور جن سے صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات اور عمل سب محدود اور مختصر ہو جاتے ہیں یہ صرف ہندوستانیوں کی رضامندی حاصل کئے بغیر ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ انہوں نے جو خواہشیں ظاہر کی تھیں، انہیں برطانوی حکومت نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے ورکنگ کمیٹی مجبور ہے کہ ان واقعات کے مضر اثرات و نتائج کی طرف توجہ دلائے۔

«کانگریس نے بار بار اظہار کیا ہے کہ وہ فاشزم اور نازیزم کے فلسفے اور عمل اور ان کے اس طریقے کو کہ جنگ اور تشدد کو آسمان پر چڑھایا جائے اور انسان کے دل و دماغ کو کچلا

نے اپنا اجلاس کیا اور جنگ کا اعلان کر دیا. ہندوستان میں ایسا ہوا کہ وائسرائے نے مرکزی قانون ساز مجلس سے رسمی طور پر بھی مشورہ کئے بغیر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا. اگر مزید ثبوت کی ضرورت تھی، تو وائسرائے کے اس عمل نے ثابت کردیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنا حلقہ بگوش سمجھتی ہے اور یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے کہ اسے جنگ جیسے معاملہ میں بھی اپنا طرز عمل خود طے کرنے کا اختیار ہے

جب ہندوستان کو اس طرح بے تکلفی کے ساتھ جنگ میں شریک کردیا گیا، تو گاندھی جی کی ذہنی تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی. وہ کسی حالت میں بھی اس پر رضامند نہیں ہوسکتے تھے کہ ہندوستان جنگ میں شریک ہو، لیکن ان کے احساسات کچھ بھی ہوں، وائسرائے کے ایک فیصلہ نے، جس میں ہندوستانیوں کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا، ہندوستان کو جنگ میں مبتلا کر دیا

کانگریس نے اپنی رائے وضاحت کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے ایک ریزولیوشن میں بیان کر دی، جو وردھا میں اس کے اجلاس منعقدہ ۱۵ ستمبر میں منظور ہوا میں یہ ریزولیوشن پورا پورا نقل کر رہا ہوں، اس لئے کہ جنگ کے معاملے میں کانگریس کا جو رویہ تھا اور اس کے نزدیک جمہوری ریاستوں کا بین‌الاقوامی سیاست کے میدان میں جو منصب ہے، اس کے متعلق یہ واضح ترین بیانات میں سے ہے. ریزولیوشن حسب ذیل ہے

«یورپ میں جنگ کا اعلان ہونے کی وجہ سے جو تشویش ناک

کرے تعاون ایسے فریقوں کے درمیاں ہونا چاہئے جو حیثیت میں برابر ہوں اور ایسے مقصد کی خاطر جسے دونوں قابل قدر سمجھتے ہوں۔ ہندوستانی قوم نے اس زمانے میں، جو ابھی گذرا ہے اپنی آزادی حاصل کرنے اور ملک میں ایک خود مختار جمہوری حکومت قائم کرنے کے لئے بڑے خطروں کا سامنا کیا ہے اور خوشی کے ساتھ بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اس کی ہمدردی تمام تر جمہوریت اور آزادی چاہنے والوں کے ساتھ ہے۔ مگر ہندوستان ایسی جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا، جو کہنے کو جمہوری آزادی کے لئے ہو، مگر خود اس کو اسی آزادی سے محروم رکھا جائے، بلکہ جو محدود اور مشروط اسے حاصل ہوئی ہو، وہ بھی اس سے چھین لی جائے

«کمیٹی اس سے واقف ہے کہ برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کی حکومتوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کو قائم رکھنے اور جنگ جوئی کا خاتمہ کرنے کے لئے لڑ رہی ہیں۔ لیکن اسی زمانے کی تاریخ میں زبان سے کہی ہوئی باتوں، مشتہر کئے ہوئے نصب العین اور اصلی اغراض و مقاصد میں مسلسل تضاد کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کے دوران میں اعلان کیا گیا تھا کہ جنگ کے مقاصد جمہوریت کے تحفظ، خود مختاری اور چھوٹی قوموں کی آزادی ہیں، لیکن انہی حکومتوں نے جنہوں نے پارسائی کی سی صورت بنا کر ان مقاصد کا اعلان کیا تھا، آپس میں خفیہ معاہدے کئے ہیں جن میں عثمانی سلطنت کو تقسیم کرنے کے امپیریلسٹ منصوبے مضمر تھے۔ جس وقت زبان

جائے قطعی طور پر ناپسند کرتی ہے۔ اس نے اس جارحانہ اعمال کی مذمت کی ہے، جو ان سے بار بار سرزد ہوئی ہیں اور اس بات کی بھی مذمت کی ہے کہ انہوں نے مستقل اصولوں اور مہذب زندگی کے مسلّم معیاروں کو کوڑے کی طرح ہٹا کر الگ کر دیا ہے۔ اسے فاشزم اور نازیزم میں امپیریلزم کے وہی اصول زیادہ شدید شکل میں نظر آئے ہیں، جن کے خلاف ہندوستانی برسوں سے لڑتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ورکنگ کمیٹی اپنا فرض سمجھتی ہے کہ جرمنی کی نازی حکومت نے پولینڈ کے خلاف جو آخری جارحانہ کارروائی کی ہے اس کی مذمت کرے اور ان لوگوں سے ہمدردی کرے جو اس حملہ کا مقابلہ کریں۔

«کانگریس نے اس کے علاوہ طے کر دیا ہے کہ ہندوستان کے جنگ میں شریک ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ایسا ہے، جس کے بارے میں ہندوستانی قوم فیصلہ کر سکتی ہے اور نہ تو کوئی باہر کی طاقت ان پر یہ فیصلہ عائد کرسکتی ہے اور نہ ہندوستانی اس کی اجازت دے سکتے ہیں کہ انکے قدرتی اور معاشی وسائل کو امپیریلسٹ مقاصد کے لئے کام میں لایا جائے وہ لازمی طور پر ایسے فیصلے کی جو ان پر عائد کیا گیا ہو اور ہندوستان کے وسائل کو ایسے کاموں میں لگانے کی مخالفت کریں گے، جنہیں انہوں نے منظور نہ کیا ہو۔ اگر کسی قابل قدر مقصد کی خاطر تعاون کی ضرورت ہو تو وہ جبراً یا فرض کے طور پر عائد کرکے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور یہ کمیٹی اسے منظور نہیں کرسکتی کہ ہندوستانی قوم کسی غیر حکومت کے جاری کئے ہوئے احکامات کی تعمیل

کے نصب العین کا اثر ہے، اس کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں اور اس کے لئے قربانیاں کرنے کو تیار ہیں، لیکن بار بار ایسا ہوچکا ہے کہ عوام کے اور ان لوگوں کے نصب العین اور اعلیٰ جذبات جو جد و جہد میں اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں نظر انداز کئے گئے اور جو وعدے کئے گئے تھے، ان پر عمل نہیں ہوا۔

"اگر جنگ کا مقصد یہ ہے کہ اس سے پہلے جو صورت حال تھی، اس کو اور امپیریلسٹ طاقتوں کے مقبوضات، نو آبادیوں، مستقل حقوق اور مراعات کو بدستور قائم رکھا جائے، تو ہندوستان کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوسکتا، لیکن اگر جنگ کا مقصد جمہوریت اور جمہوریت پر مبنی عالمی نظام ہے، تو ہندوستان کو اس سے انتہائی دلچسپی ہوگی۔ کمیٹی کو یقین ہے کہ ہندوستانی جمہوریت اور برطانوی اور عالمی جمہوریت کے مفاد میں کوئی تضاد نہیں ہے، مگر جمہوریت چاہے ہندوستان کے لئے ہو، یا کسی اور ملک کے لئے، اس کا امپیریلزم اور فاشزم کے درمیان ایسا خلقی تضاد ہے، جو دور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر برطانیہ عظمیٰ کا مقصد جمہوریت کے قیام اور اس کی توسیع کے لئے لڑنا ہے، تو یہ لازمی ہے کہ اپنے مقبوضات میں امپیریلزم کا خاتمہ کردے اور ہندوستان میں مکمل جمہوری نظام قائم کرے۔ ہندوستانی قوم کو خود مختاری کا حق ملنا چاہئے، اس طرح کہ وہ بغیر کسی خارجی طاقت کی دخل اندازی کے ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا دستور مرتب کرے اور اپنی پالیسی کو خود طے کرے۔ آزاد اور جمہوری ہندوستان جارحانہ اقدامات کے خلاف

سے وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ وہ نئے علاقوں پر قبضہ کرنا نہیں چاہتی ہیں، اسی وقت فاتح طاقتوں نے اپنی نو آباد مقبوضات میں نمایاں اضافے کئے. موجودہ یورپی جنگ صلح نامہ ورسائی کی ناکامی اور اسے مرتب کرنے والوں کی قابل تحقیر اخلاقی شکست کی علامت ہے، اس لئے کہ ان لوگوں نے اپنے عہد کو توڑ کر اور وعدوں کو جھٹلا کر ہاری ہوئی قوموں سے زبردستی ایسی صلح کی شرطیں منظور کرائیں، جن کی روح امپیریلسٹ تھی انجمن اقوام اس صلح نامہ کا ایک امید افزا نتیجہ تھا، لیکن شروع ہی سے انہی ریاستوں نے جنہوں نے اسے قائم کیا تھا اس کی زبان بند کردی اور اس کا گلا گھونٹا اور بعد میں اسے جان سے مار دیا.

«اس کے بعد کے واقعات نے ازسرنو ثابت کر دیا کہ وہ لوگ جو ظاہری خلوص کے ساتھ نیک عقیدے رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، آگے چل کر کمینوں کی طرح ان سے منہ پھیر لیتے ہیں. برطانوی حکومت نے مانچوریا میں جارحانہ اقدامات سے چشم پوشی کی. حبش میں جو کچھ ہوا، اسے انہوں نے چپ چاپ مان لیا. چکوسلوواکیہ اور ہسپانیہ میں جمہوریت خطرے میں تھی اور اس کے ساتھ جان بوجھ کر غداری کی گئی اجتماعی تحفظ کے پورے نظام کو انہی طاقتوں نے جو پہلے اس سے گہری عقیدت رکھنے کا اعلان کرتی رہتی تھیں، کمزور اور بیکار کر دیا.

«اب پھر یہ کہا جارہا ہے کہ جمہوریت خطرے میں ہے اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے. کمیٹی کو اس بیان سے پورا اتفاق ہے. کمیٹی یہ مانتی ہے کہ مغربی قوموں کے دل پر جمہوریت

ہے اور دنیا کے نظام کی کوئی ترکیب و ترتیب کامیاب نہیں ہوسکتی، حس میں اس بنیادی مسئلہ کو نظر انداز کیا جائے۔ ہندوستان کے وسائل اتنے زیادہ ہیں کہ دنیا کی جو بھی نئی تنظیم کی جائے گی، اس میں اس کی بڑی اہمیت ہوگی۔ لیکن وہ اپنا حق صرف ایک آزاد قوم کی حیثیت سے حاصل کرکے ادا کرسکے گا، حس کی تمام قوتیں دنیا کی نئی تنظیم کے عظیم الشان مقصد کے لئے وقف کردی گئی ہوں۔ اب آزادی قابل تقسیم نہیں مانی جاسکتی، اور دنیا کے کسی حصے میں امپیریالسٹ تسلط کو باقی رکھنے کی جو بھی کوشش کی جائے گی، اس کا انجام تباہی اور بربادی کی کوئی نئی شکل ہوگی۔

« ورکنگ کمیٹی کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کئی دیسی ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنی خدمات اور اپنے وسائل کو پیش کیا ہے اور یورپ میں جمہوریت کی حمایت کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر یہ ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کے باہر جمہوریت سے عقیدت رکھنے کا دعویٰ کریں، تو کمیٹی ان سے یہ کہنا چاہے گی کہ انہیں پہلے اس کی فکر ہونی چاہئے تھی کہ اپنی ریاستوں میں۔ جہاں اس وقت خالص شخصی حکومت کا دور دورہ ہے، جمہوری طریقے جاری کریں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت خود ان حکمرانوں سے بھی زیادہ اس استبداد کی ذمہ دار ہے، جیسا کہ پچھلے سال کے دوران میں تکلیف دہ صورت میں ظاہر ہوگیا ہے۔ (برطانوی حکومت کی) یہ پالیسی جمہوریت کی قطعی تردید ہے اور اُس نئے عالمی نظام کی، جس کی خاطر

باہمی تحفظ اور معاشی تعاون کی غرض سے دوسری آزاد قوموں کے ساتھ خوشی سے شریک ہوگا اور وہ ایک ایسے عالمی نظام کے لئے جد و جہد کرے گا جو نظام کے اعتبار سے حقیقی ہو، آزادی اور جمہوریت پر مبنی ہو اور دنیا کے علم اور وسائل کو نوع انسانی کی ترقی اور بہبودی کے لئے کام میں لائے۔

« اس وقت جن مصائب نے یورپ کو آ گھیرا ہے، ان کا اثر یورپ تک محدود نہ رہے گا، ساری نوع انسانی ان کی لپیٹ میں آجائے گی۔ پہلے اس طرح کی جو صورتیں پیدا ہوتی تھیں اور جو جنگیں ہوتی تھیں، ان کے باوجود دنیا کے نظام کا ڈھانچا سلامت رہا تھا، اس مرتبہ ایسا نہ ہوگا، بلکہ سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے دنیا کی وضع اور ترتیب بدل جائے گی انجام چاہے اچھا ہو یا نہ ہو، اس وقت کی نازک صورت حال ایک لازمی نتیجہ ہے، اُس سماجی اور سیاسی تخالف اور تضاد کا جو پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے پریشان کن طریقے سے بڑھتا رہا ہے اور یہ صورت قائم رہے گی، جب تک اس تخالف اور تضاد کو دور کرکے ایک نیا توازن نہ پیدا کیا جائے۔ اس توازن کو پیدا کرنے کی یہی تدبیر ہوسکتی ہے کہ ایک ملک کا دوسرے پر حکومت کرنا اور اس کے وسائل کو اپنے صرف میں لانا بند کردیا جائے اور سب کے مفاد کو یکساں طور پر نظر میں رکھ کر معاشی تعلقات کی ایک نئی تنظیم کی جائے، جو انصاف کے بہتر تصور پر مبنی ہو۔ اس نئی تنظیم کا مرکزی مسئلہ ہندوستان ہے۔ اس لئے کہ دور جدید کی امپیریلزم کی سب سے نمایاں مثال یہی

حال اور مستقبل میں ہندوستان کی جو حیثیت ہوگی، وہ پورے طور پر واضح ہوجائے. لیکن فیصلے کو بہت دنوں تک ملتوی نہیں رکھا جاسکتا، اس لئے کہ ہندوستان روز بروز ایک ایسی پالیسی کا پابند کیا جارہا ہے، جس کے طے کرنے میں وہ شریک نہیں ہے اور جسے وہ ناپسند کرتا ہے

"اس لئے ورکنگ کمیٹی برطانوی حکومت کو دعوت دیتی ہے کہ وہ ایسے الفاظ میں، جو ابہام سے پاک ہوں، بیان کردے کہ اس جنگ میں جمہوریت اور امپیریلزم اور اس نئے عالمی نظام کے بارے میں، جو اس وقت ذہن میں ہے، اس کے مقاصد کیا ہیں اور خاص طور پر یہ واضح کرے کہ ان مقاصد کا ہندوستان میں نفاذ کس شکل میں ہوگا اور کس طرح ان پر فوراً عمل کیا جائے گا کیا ان مقاصد میں یہ شامل ہے کہ امپیریلزم کا خاتمہ کردیا جائیگا اور ہندوستان کو ایک آزاد ملک سمجھا جائے گا، جس کی پالیسی اس کے شہریوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتی ہے؟ دنیا کے تمام ملکوں کے لوگ مستقبل کے بارے میں ایسے واضح اعلان کا خیر مقدم کریں گے، جس میں حکومت اس کا عہد کرے کہ وہ امپیریلزم اور فاشزم کا خاتمہ کردے گی، لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ ممکن ہو، اس کے مطابق فوراً عمل کیا جائے، کیونکہ اسی سے لوگوں کو یقین ہوگا کہ عہد کی پابندی کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے کسی بھی اعلان یا اقرار کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ اس کا زمانۂ حال میں نفاذ کیا جائے، اس لئے کہ آج جو عمل ہوگا، وہ اس وقت کے حالات

لڑنے کا دعویٰ برطانیہ عظمیٰ یورپ میں کررہا ہے۔

«ورکنگ کمیٹی جب یورپ، افریقہ اور ایشیا کے گذشتہ واقعات پر، اور خاص طور سے ہندوستان میں جو کچھ ماضی اور حال میں پیش آیا ہے، اس پر نظر ڈالتی ہے، تو اسے نہ تو جمہوریت اور خود مختاری کو فروغ دینے کی کسی کوشش کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور نہ اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ برطانوی حکومت نے جنگ سے متعلق جو اعلانات کئے ہیں ان پر عمل ہو رہا ہے یا آیندہ ہوگا۔ جمہوریت کے ترقی پانے کی اصل پہچان یہ ہے کہ یکساں طور پر امپیریلزم اور فاشزم اور ان جارحانہ اقدامات کا خاتمہ کیا جائے، جو پچھلے زمانے میں اور اس وقت بھی ان کے قدم بہ قدم چلتے رہے ہیں نیا عالمی نظام اسی بنیاد پر قائم کیا جاسکتا ہے کمیٹی اس کی متمنی اور خواہش مند ہے کہ اس نئے نظام کو قائم کرنے کی جد و جہد میں ہر طرح سے مدد کرے، لیکن کمیٹی ایسی جنگ سے نہ تو اپنا کوئی تعلق ظاہر کرسکتی ہے، نہ اسے جاری رکھنے میں کسی صورت سے مدد کرسکتی ہے، جو امپیریلسٹ طریقے پر لڑی جارہی ہو اور جس کا مقصد ہندوستان اور دوسرے ملکوں پر امپیریلسٹ تسلط کو مستحکم کرنا ہو۔

«پھر بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ موقعہ کس قدر اہم ہے اور واقعات کی رفتار پچھلے چند دنوں میں اکثر اتنی تیز رہی ہے کہ انسان کا ذہن ان پر قابو نہیں پاسکتا، کمیٹی اس منزل پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی، تاکہ اس کی گنجائش رہے کہ جو معرض خطر میں ہے، جنگ در اصل جن مقاصد کے لئے لڑی جارہی ہے اور

میں کانگریس کا صدر بنایا گیا

یورپ میں جنگ ۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی پولینڈ جرمن ہتھیاروں کے نیچے بے سکت پڑا ہوا تھا پولستانیوں کی مصیبت میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ سوویٹ یونین نے ملک کے نصف مشرقی حصہ پر قبضہ کرلیا پولینڈ کی مدافعانہ طاقت ختم ہو جانے کے بعد ایک وقفہ ہوا جس میں یورپ پر بے چینی کی کیفیت طاری رہی فرانس اور جرمن اپنی مسلح سرحد پر آمنے سامنے تھے، لیکن بڑے پیمانے پر فوجی کارروائیاں بند تھیں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص اس انتظار میں ہے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے، مگر خوف اور اندیشوں نے ابھی کوئی شکل نہیں پائی تھی بلکہ مبہم اور غیر متعین تھے.

ہندوستان میں انتظار اور خوف کی ایک ملی جلی کیفیت محسوس ہورہی تھی اس حالت میں، جب یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور نامعلوم خطرے گھیرے ہوئے تھے، کانگریس کی صدارت کے مسئلے کو ایک نئی اہمیت حاصل ہوگئی اس سے ایک سال پہلے میرے اوپر زور ڈالا گیا تھا کہ اس عہدہ کو قبول کرلوں، مگر بعض اسباب کی بنا پر میں نے معذرت کردی اس مرتبہ صورت کچھ اور تھی. میں نے محسوس کیا کہ ایسے موقع پر انکار کرنا فرض کی انجام دہی سے گریز کرنا

کے مطابق ہوگا اور اسی عمل سے مستقل کی شکل لے گی ۔

« یورپ میں جنگ شروع ہوگئی ہے اور یہ سوچ کر دل دہل جاتا ہے کہ اب کیا کیا ہونے والا ہے ۔ لیکن حبش ، ہسپانیہ اور چین میں پچھلے برسوں میں جنگ انسانی جانوں کا بھاری خراج وصول کرتی رہی ہے ۔ بے شمار معصوم مرد، عورتیں اور بچے ، غیر مسلح شہروں پر بمباری کرکے ہلاک کردئے گئے ہیں ۔ ان وحشت ناک دنوں میں بیدردانہ قتل عام ، جسمانی اذیت اور انتہائی تذلیل ایک سلسلے سے یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے ہیں یہ وحشت بڑھتی جارہی ہے ۔ دنیا پر تشدد اور تشدد کا خوف چھاتا جارہا ہے اور اگر اس کو روکا اور ختم نہ کیا گیا تو انسانیت کو پچھلی تہذیبوں سے جو قیمتی ورثہ ملا ہے ، وہ برباد ہوجائے گا ۔ اُس وقت کو روکا تو ہے یورپ اور چین میں ، لیکن یہ ختم نہ ہوگی جب تک کہ فاشزم اور امپیریازم جو اس کی جڑیں ہیں ، اکھاڑ کر پھینک نہ دی جائیں اس مقصد کو حاصل کرنے میں ورکنگ کمیٹی پوری طرح سے مدد کرنے کو تیار ہے لیکن یہ بے حد افسوس اور مایوسی کی بات ہوگی ، اگر یہ ہیبت ناک جنگ بھی امپیریلزم کے حوصلے دل میں رکھ کر لڑی گئی اور اس کا مقصد یہ ہوا کہ موجودہ نظام ، جو خود جنگ اور انسان کی ذلت کا سبب ہے ، قائم رکھا جائے ۔ »

جو انہوں نے جنگ کی پیدا کی ہوئی حالت کے سلسلے میں کی ہیں۔ کانگریس کے خیال میں یہ ہندوستانی قوم کی کھلی ہوئی توہین ہے کہ اس کا منشاء معلوم کئے بغیر برطانوی حکومت نے اسے شریک جنگ قرار دیا اور اس کے وسائل کو جنگ کے لئے استعمال کیا۔ کوئی خود دار اور آزادی پسند قوم ایسے برتاؤ کو گوارا یا برداشت نہیں کر سکتی۔ برطانوی حکومت کی طرف سے حال میں ہندوستان کے بارے جو اعلانات کئے گئے ہیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ بنیادی طور پر اِمپیریلسٹ مقاصد کی خاطر اور اپنی سلطنت کو، جو ہندوستان اور دوسرے ایشیائی اور افریقی ملکوں کے وسائل اور آبادی کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے طریقوں پر تعمیر کی گئی ہے، محفوظ رکھنے اور مستحکم کرنے کے لئے یہ لڑائی لڑ رہا ہے۔ ان حالات میں یہ صاف ظاہر ہے کہ کانگریس براہ راست یا بالواسطہ (برطانیہ کی طرف سے) جنگ میں شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ ایسی شرکت کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانوی سلطنت کے موجودہ طریقوں کو جاری رکھا جائے اور ان میں استقلال پیدا کیا جائے۔ اسی وجہ سے کانگریس اس کے سخت خلاف ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو برطانیہ عظمیٰ کی طرف سے لڑایا جائے اور جنگ کے مصرف کے لئے ہندوستان کو آدمیوں اور سامان سے خالی کیا جائے۔ وہ یہ نہیں مان سکتی کہ ہندوستان میں آدمیوں بھرتی کی گئی ہے اور جو روپیہ جمع کیا گیا ہے وہ ہندوستان کا رضا کارانہ عطیہ ہے۔ کانگریس کے ممبر اور وہ لوگ جو کانگریس کے اثر میں ہیں آدمیوں،

ہوگا۔ میں اس طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے معاملے میں گاندھی جی اور میرے درمیان اختلاف رائے تھا۔ اب جو لڑائی شروع ہوگئی تھی تو میرے نزدیک ہندوستان کو بغیر تکلف اور تساہل کے جمہوری طاقتوں کی گروہ بندی میں شامل ہوجانا چاہئے تھا مگر سوال یہ تھا کہ خود غلام ہوتے ہوئے ہندوستان دوسروں کی آزادی کے لئے کیسے لڑ سکتا تھا۔ اگر برطانوی حکومت فوراً ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردیتی تو تمام ہندوستانیوں کا فرض ہوجاتا کہ اس آزادی کے بدلے سب کچھ قربان کر دیں۔ اس لئے میں سمجھتا تھا کہ جنگ نے جو نازک حالات پیدا کردئے ہیں ان میں مجھے جس حیثیت سے بھی کہا جائے خدمت کرنے کو تیار ہونا چاہئے۔ جب گاندھی جی نے پھر مجھ سے صدر بن جانے کو کہا تو میں خوشی سے راضی ہوگیا

دراصل صدر کے انتخاب میں کوئی مقابلہ نہیں ہوا مسٹر ایم. این. رائے، جو میرے خلاف کھڑے ہوئے تھے، بہت سے ووٹوں سے ہار گئے۔ (کانگریس کا) اجلاس رام گڑھ میں ہوا اور اس میں جو ریزولیوشن منظور ہوا اس میں بڑی حد تک ان خیالات کا عکس تھا جو میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کئے تھے ریزولیوشن حسب ذیل تھا۔

«اس پرخطر اور نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے، جو یورپی جنگ اور اس کے متعلق برطانیہ کی پالیسی کا نتیجہ ہے، کانگریس کا یہ جلسہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کی اُن تجویزوں کو منظور اور اُن کارروائیوں کی تصدیق کرتا ہے

ہوسکیں گے۔ ہندوستان کے دستور کی بنیاد خود مختاری، جمہوریت اور قومی اتحاد پر ہونا چاہئے، اور کانگریس ہندوستان اور ہندوستانیوں کو تقسیم کرنے کی کوششوں کی تردید کرتی ہے۔ کانگریس کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ ایسا دستور وضع کیا جائے جس کی بدولت ہر گروپ اور ہر شخص سمجھے کہ اسے پوری آزادی اور ترقی کے موقعے دینے کی ضمانت کی گئی ہے۔ (موجودہ) سماجی بے انصافیوں کی جگہ ایسا سماجی نظام قائم کیا جائے جو عدل و انصاف کا بہتر نمونہ ہو"۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد سے صدارت کا چارج لینے کے بعد میرے پہلے کاموں میں سے ایک یہ تھا کہ ورکنگ کمیٹی کو ازسرنو مرتب کروں پرانی اور نئی کمیٹی میں دس ممبر مشترک تھے، یعنی شریمتی سروجنی نائڈو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، سیٹھ جمنا لال بجاج (خازن)، شری جے بی کرپلانی (جنرل سکریٹری)، خان عبدالغفار خاں، شری بھولا بھائی دیسائی، شری شنکر راؤ دیو، ڈاکٹر پروفلا چندر گھوش، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور میں خود۔

ایک نمایاں شخص جنہیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا جواہر لال نہرو تھے۔ وہ اس وقت سے الگ الگ رہے تھے جب کہ سبھاش بوس نے گاندھی جی سے اختلاف ہونے کی بنا پر کانگریس کی صدارت سے استعفا دیدیا تھا میں جواہر لال کو کمیٹی میں واپس بلا لایا، اور اس کے علاوہ شری سی۔ راج گوپال آچاری، ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی کو بھی شامل کیا۔ پندرھویں ممبر کے بارے میں بعد کو اعلان کیا جانے

روپیہ اور ساماں سے جنگ کو جاری رکھنے میں مدد نہیں کرسکتے.

« کانگریس اس ریزولیوشن کے ذریعے اعلان کرنا چاہتی ہے کہ کامل آزادی سے کوئی کم حیثیت ہندوستانیوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگی. امپیریلزم کے حلقے کے اندر ہندوستان کی آزادی کا وجود ناممکن ہے، اور ڈومینین کی یا برطانوی سلطنت کے اندر کوئی اور حیثیت، ہندوستان کےلئے قطعی نامناسب ہوگی، کیونکہ ایسی حیثیت ایک بڑی قوم کے شایاں شان نہیں ہے، اور اس طرح ہندوستاں کئی طریقوں سے برطانیہ کی سیاست اور معاشی نظام سے وابستہ ہوجائے گا در اصل ہندوستانی قوم ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ، جس کا انتخاب بالغوں کے عام حق رائے دہندگی کی بنا پر کیا گیا ہو، اپنا دستور صحیح طور سے وضع کرسکتی ہے اور دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات قائم کرسکتی ہے

« کانگریس جس طرح پہلے تیار تھی، ہمیشہ اس کے لئے تیار رہے گی کہ ہندوستاں کی مختلف قسم کی مذہبی اور تہذیبی جماعتوں کے درمیاں ہم آہنگی پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے، لیکن اس کی رائے ہے کہ اس مسئلے کا مستقل فیصلہ صرف ایسی دستور ساز اسمبلی کرسکتی ہے جو تمام مسلّمہ اقلیتوں کے حقوق کو پورے طور سے محفوظ کردے. یہ تحفظ جہاں تک ممکن ہوگا مختلف اکثریتوں اور اقلیتوں کے منتخب شدہ نمائندوں کے اتفاق رائے سے ہوگا اور جن معاملوں میں اتفاق رائے نہ ہوسکا وہ ثالثوں کے فیصلے کے مطابق طے ہوگا. کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنے سے معاملات قطعی طور پر طے نہ

کہ اس وقت فرانس شکست کھا چکا تھا اور جرمنی کی طاقت انتہائی عروج پر تھی۔

گاندھی جی کے لئے یہ بڑا مشکل وقت تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ دنیا کو برباد کر رہی ہے اور وہ اس بربادی کو روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے لیکن ان کی اندرونی کشمکش کی یہ کیفیت تھی کہ انہوں نے بعض موقعوں پر خودکشی کا ذکر کیا انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان مصیبتوں اور تکلیفوں کا تدارک کروں جو جنگ کی بدولت لوگوں کو برداشت کرنی پڑ رہی ہیں تو کم ازکم اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے یہ سب کچھ دیکھنے سے تو انکار کر سکتا ہوں انہوں نے بار بار مجھ پر دباؤ ڈالا کہ ان کے خیالات کی تائید کروں۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا، مگر اپنے آپ کو ان سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ میرے لئے عدم تشدد مصلحت کی بات تھی، عقیدے کی نہ تھی میری رائے تھی کہ اگر کوئی چارہ نہ ہوتا تو ہندوستانیوں کو اس کا حق تھا کہ تلوار سے کام لیں لیکن پر امن طریقوں سے آزادی حاصل کرنے میں عظمت اور شرافت زیادہ تھی، اور بہرحال ملک کی جو حالت تھی اسے دیکھتے ہوئے گاندھی جی کا مسلک صحیح تھا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اندر اس بنیادی مسئلے پر اختلاف تھا بحث کی ابتدائی منزلوں میں جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، شری راج گوپال آچاری اور خان عبدالغفار خان میرا ساتھ دیتے تھے۔ مگر ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور شری شنکر راؤ دیو، غالباً گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ اُنہیں اس سے اتفاق تھا کہ اگر

والا تھا، ایکن احلاس کے بہت جلد بعد ہم گرفتار کر لئے گئے اور یہ جگہ خالی رہی کانگریس کی زندگی میں یہ بہت نازک وقت تھا دنیا کو متزلزل کرنے والے واقعات جو ملک کے باہر ہو رہے تھے، ان کا ہمارے اوپر اثر پڑ رہا تھا. اس سے زیادہ پریشان کن ہمارے اندرونی اختلافات تھے میں کانگریس کا صدر تھا، اور میری کوشش یہی کہ ہندوستان جمہوری ریاستوں کے گروہ میں شامل ہو جائے، اگر کسی طرح سے وہ آزاد ہو سکے جمہوریت کو فروغ دینا ایسا مقصد تھا جس سے ہندوستانی شدید ہمدردی رکھتے تھے ہندوستان کی غلامی ہی ہمارے راستے میں ایک رکاوٹ تھی مگر گاندھی جی اس خیال کے نہیں تھے ان کے لئے اصل معاملہ ہندوستان کی آزادی نہیں بلکہ پیس فرم یعنی عدم تشدد پر مبنی امن عالم تھا میں کھلم کھلا کہتا تھا کہ کانگریس پیسی فسٹ ادارہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرنا ہے اس لئے میرے نزدیک وہ سوال جو گاندھی جی نے بحث میں اٹھایا تھا آنا ہی نہیں چاہئے تھا

مگر گاندھی جی اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے انہیں یقین تھا کہ ہندوستان کو ہر حالت میں جنگ سے الگ رہنا چاہئے، انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کرکے اپنے خیالات بیان کئے انہوں نے برطانوی قوم کے نام ایک کھلا خط لکھ کر اس سے التجا کی کہ نازیوں سے لڑنے کے بجائے وہ اس کا روحانی طاقت سے مقابلہ کرے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزوں کے دلوں پر گاندھی جی کی التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا، اس لئے

میں بالآخر منظور ہوئے وہ میرے مسودے کے مطابق تھے۔

جب وہ ریزولیوشن منظور ہوا، جس میں یہ بات دہرائی گئی تھی کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی بنیاد عدم تشدد پر ہے، تو گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مبارکباد کا مجھے ایک تار بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ انہیں اس سے بہت مسرت اور تسلّی ہوئی کہ میں نے ملک کی اندرونی جدو جہد میں عدم تشدد پر قائم رہنے کی استدعا کی تھی وہ سمجھتے تھے کہ ملک کی مزاجی کیفیت کو دیکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میری تجویز کو کہ، اگر ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے تو اسے جنگ میں شرکت کرنا چاہئے، خوشی سے منظور کرلے گی اس بنا پر انہیں شبہ تھا کہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اندرونی جد و جہد میں عدم تشدد پر قائم رہنے کے متعلق ریزولیوشن منظور کرنے پر آمادہ نہ کر سکونگا۔

لیکن جنگ کے معاملے میں ورکنگ کمیٹی کے ممبر پس و پیش کرنے لگے ان میں سے کوئی اس بات کو دل سے نہیں نکال سکتا تھا کہ گاندھی جی اصولاً جنگ میں ہر اعتبار سے شرکت کرنے کے خلاف تھے۔ وہ اس حیثیت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی نے اپنی موجودہ نمایاں حیثیت ان کی رہنمائی میں حاصل کیا تھا۔ اب وہ پہلی بار ان سے ایک بنیادی مسئلے میں اختلاف کر رہے تھے اور انہیں اکیلا چھوڑ رہے تھے۔ گاندھی جی کو جو اہنسا سے پختہ عقیدت تھی وہ ان کی رائے پر اثر انداز ہونے لگی۔ سردار پٹیل نے پونا کے جلسے

یہ ایک مرتبہ مان لیا گیا کہ آزاد ہندوستان جنگ میں شریک ہو سکتا ہے تو ہندوستان کی جنگ آزادی میں عدم تشدد کا دعویٰ بے بنیاد ہو جائیگا۔ اس کے برخلاف میں یہ محسوس کرتا تھا کہ آزادی کے لئے ملک کے اندر جدوجہد کرنا اور ملک کے باہر جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنا ایسی صورتیں ہیں جن کے درمیان فرق کرنا چاہئے۔ ملک کی آزادی کے لئے لڑنا ایک بات تھی، ملک کے آزاد ہونے کے بعد لڑنا دوسری بات اور میرا خیال تھا کہ ان دونوں مسئلوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا چاہئے۔

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جو جلسے پونا میں ہوئے ان میں اس مسئلے کے بارے میں واضح فیصلہ کرنے کی ضرورت پیش آگئی کانگریس کے رام گڑھ کے اجلاس کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا یہ پہلا جلسہ تھا صدر کی حیثیت سے میں نے اپنے خیال کے مطابق جو حقیقی صورتِ حال تھی اُسے بیان کی۔ کمیٹی نے میرے خیالات کی تصدیق کی۔ اس بنا پر ریزولیوشن منظور کئے گئے۔ ایک میں کانگریس کا یہ عقیدہ از سرِ نو بیان کیا گیا کہ عدم تشدد ہندوستان کو آزاد کرانے کا صحیح طریقہ ہے اور اُسے قائم رکھنا لازمی ہے۔ دوسرے ریزولیوشن میں بیان کیا کہ نازیزم اور جمہوریت کے درمیان جنگ ہو تو انصاف کی بات یہ ہے کہ ہندوستان جمہوری طاقتوں کا ساتھ دے لیکن خود آزاد ہو جانے سے پہلے وہ جمہوری طاقتوں کی جنگ سے متعلق سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ ریزولیوشن جس شکل

آصف علی اور سید محمود کے سوا ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں نے دستخط کئے تھے مجھے سخت تکلیف ہوئی عبد الغفار خاں اب تک میرے سب سے مخلص اور قابل اعتبار حامیوں میں سے تھے لیکن اب انہوں نے بھی رائے بدل دی تھی مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ میرے ساتھی مجھے اس طرح کا خط لکھیں گے میں نے فوراً جواب دیا کہ میں ان کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھ گیا ہوں اور ان کی شرطیں مجھے منظور ہیں برطانوی حکومت نے جو رویہ اُس وقت اختیار کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے اس کی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرے گی جب تک کہ انگریزوں کا رویہ نہ بدلے، جنگ میں شرکت محض ایک علمی مسئلہ رہے گی. اس لئے ان سے درخواست کروں گا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کو برقرار رکھیں

اگست سنہ ۱۹٤۰ء میں وائسرائے نے مجھے اس تجویز پر گفتگو کرنے کی دعوت دی کہ ایکزیکیٹو کونسل کے ممبر اور اس کے اختیارات بڑھا دئیے جائیں اور اس طرح کانگریس کو حکومت میں شریک کیا جائے میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کئے بغیر ہی اس پیشکش کو نامنظور کردیا مجھے کانگریس کے آزادی کے مطالبے، اور وائسرائے کی تجویز کے درمیان، کہ ایکزیکیٹو کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا دی جائے، کوئی تعلق نظر نہیں آیا. اس صورت میں وائسرائے سے ملاقات کرنا بے معنی تھا. مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے کانگریسی میرے فیصلے سے متفق

کے ایک مہینے کے اندر اپنی رائے بدل دی اور گاندھی جی کے رویہ کو صحیح تسلیم کر لیا جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور کانگریس کمیٹی کے کئی اور ممبروں نے مجھے خط لکھا کہ جنگ کے بارے میں گاندھی جی کے جو خیالات ہیں ان سے انہیں دلی اتفاق اور عقیدت ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ کانگریس ان کی پیروی کرتی رہے۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ چونکہ میری رائے اس کے خلاف تھی، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے میری تائید کی تھی، اس لئے انہیں یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر نہ رہیں وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر اس لئے بنائے گئے تھے کہ صدر کی امداد کریں لیکن چونکہ ان کے اور صدر کے درمیان ایک بنیادی مسئلے میں اختلاف تھا، اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ انہیں استعفا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں وہ اس معاملے میں ٹھنڈے دل سے غور کرچکے تھے مگر اس خیال سے کہ مجھے پریشانی نہ ہو وہ اس بات پر تیار ہوئے کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہیں جب تک کہ اختلافات کے کسی عملی شکل میں ظاہر ہونے کا سوال نہ ہو، لیکن اگر برطانوی حکومت نے میری شرطوں کو منظور کر لیا اور جنگ میں شرکت کا واقعی سوال پیدا ہوا تو وہ استعفا دینے پر مجبور ہونگے۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ اگر مجھے یہ منظور ہو تو وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہیں گے ورنہ ان کے اسی خط کو ان کا استعفا سمجھا جائے۔

اس خط سے، جس پر جواہر لال، راج گوپال آچاری،

ان کا معمول یہ تھا کہ وہ گھنٹی بجا کر اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو بلاتے اور وہ گاندھی جی کو کار تک پہونچا جاتا۔ اس مرتبہ نہ انھوں نے گھنٹی بجائی اور نہ اے ڈی۔ سی کو بلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی وائسرائے کو کمرے میں خاموش اور بوکھلایا ہوا چھوڑ کر نکلے اور راستہ تلاش کرتے ہوئے کارتک پہونچے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو گاندھی جی نے واقعہ بیان کیا اور اس پر تعجب ظاہر کیا کہ وائسرائے معمولی آداب برتنا بھی بھول گیا۔ میں نے جواب دیا کہ وائسرائے آپ کی تجویز سن کر ایسا حیران ہوا ہوگا کہ اسے اپنا معمول بھی یاد نہ رہا۔ گاندھی جی اس تشریح کو سن کر خوب ہنسے۔

کانگریس کے اندر بحث جاری رہی۔ جہاں تک گاندھی جی کا تعلق تھا، وہ تو سمجھتے تھے کہ کانگریس کو کسی بھی حال میں جنگ میں شریک نہ ہونا چاہئے ہمارے نقطۂ نظر میں بنیادی اختلاف ضرور تھا، مگر اس پر ہم متفق تھے کہ موجودہ صورت حال میں ہم کو کسی طرح سے بھی انگریزوں کی حمایت نہ کرنا چاہئے۔ اس طرح میری پالیسی اور گاندھی جی کے عقیدے میں جو اختلاف تھا وہ فرضی رہا۔ انگریزوں کے رویے نے ہمیں متحد رکھا اگرچہ ہمارے بنیادی نقطۂ نظر میں اختلاف تھا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس صورتِ حال میں کانگریس کو کیا کرنا چاہئے؟ ایک سیاسی جماعت ہوتے ہوئے وہ کیسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہ سکتی تھی، جب ساری دنیا میں ہیبتناک واقعات پیش آ رہے تھے؟ گاندھی جی شروع میں کسی قسم کی بھی تحریک

نہیں تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مجھے بہرحال دعوت کو قبول کرنا اور وائسرائے سے ملاقات کرنا چاہئے تھا لیکن مجھے اس وقت یقین تھا اور اب بھی ہے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔

گاندھی جی پر اس واقعے کا جو اثر ہوا وہ بیشتر کانگریسیوں کے تاثرات سے بالکل مختلف تھا انہوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے میرے فیصلے کی پوری طرح تائید کی تھی۔ ان کے خیال میں میرا وائسرائے سے ملاقات کرنے سے انکار خدا کی رحمت کی علامت تھی۔ خدا کی یہ مرضی نہیں تھی کہ ہندوستان اس جنگ میں شریک ہو۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ میں نے اسی وجہ سے وائسرائے سے ملنے سے انکار کیا ہے۔ اس طرح معاملہ یہیں پر ختم ہوگیا۔ گاندھی جی کو اندیشہ تھا کہ اگر میں وائسرائے سے ملتا تو کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتا ہوسکتا تھا اور اس طرح ہندوستان جنگ میں اُلجھا دیا جاتا۔

اس کے بعد گاندھی جی نے انگریزوں کے نام ایک اور اپیل شائع کی جس میں انہوں نے پھر درخواست کی کہ ہتھیاروں کو الگ رکھ کر ہٹلر کا روحانی طاقت سے مقابلہ کریں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لارڈ لنلتھگو سے ملاقات کی اور ان پر زور ڈالا کہ ان کے نقطۂ نظر کو صحیح مان لیں اور برطانوی حکومت کو اس سے مطلع کریں۔

گاندھی جی نے لارڈ لنلتھگو سے کہا کہ برطانوی قوم کو ہتھیار الگ رکھ کر ہٹلر کا روحانی طاقت سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ یہ ایک ایسی عجیب غریب بات تھی کہ وہ بالکل بھوچکا رہ گئے۔

کرتی تھیں۔ پنجاب کے ایک شخص سمپورن سنگھ تھے جنھوں نے گاندھی جی یا ورکنگ کمیٹی کی اجازت لئے بغیر ستیہ گرہ کی۔ جب وہ گرفتار ہوئے تو کانگریس کی واضح ہدایات کے خلاف اپنی صفائی پیش کی جو مجسٹریٹ مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا اُس نے انہیں مجرم قرار دیکر اُن پر ایک آنہ جرمانہ کیا اور اُسکو اپنی جیب سے ادا کر کے سمپورن سنگھ کو چھوڑ دیا۔ اس سے تحریک کی ایسی ہوا جیری ہوئی کہ مجھے پنجاب جاکر معاملات کو درست کرنا پڑا وہاں سے واپس آتے ہوئے میں الہ آباد میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ واقعہ بھی لطف سے خالی نہ تھا۔ میں صبح کی چائے پینے کے لئے رفرشمنٹ روم جا رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے آداب و تسلیمات کے ساتھ وارنٹ پیش کیا۔ میں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا «آپ نے مجھے یہ خاص امتیاز دے کر بڑی عزت بخشی ہے آپ مجھے گرفتار کر رہے ہیں جب کہ مجھے انفرادی ستیہ گرہ کرنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہے »

مجھے دو برس کی سزا دی گئی اور میں نینی جیل میں رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر کاٹجو بھی میرے پاس وہیں پہنچا دئے گئے۔ لیکن ہم نے سزا کی مدت پوری نہیں کی، اس لئے کہ اس دوران میں دو حادثے ہوئے، جنھوں نے دنیا کو ہلا دیا اور جنگ کی نوعیت کو بالکل بدل دیا پہلا حادثہ تھا جون سنہ ۱۹۴۱ء میں جرمنی کا روس پر حملہ اسی کے چھ مہینے کے اندر جاپان نے پرل ہاربر میں متحدہ ریاستوں (امریکہ) پر وار کیا۔

جرمنی کے سوویٹ روس اور جاپان کے متحدہ ریاستوں پر حملہ

نہیں چاہتے تھے اس لئے کہ تحریک صرف ہندوستان کی آزادی
کے لئے ہو سکتی تھی اور اس میں یہ بات مضمر ہوتی کہ جب آزادی
مل جائے گی تو ہندوستان جنگ میں شریک ہو جائے گا دہلی اور
پونا کے جلسوں کے بعد جب برطانوی حکومت نے کانگریس کی
تعاون کی پیشکش کو نا منظور کر دیا تو گاندھی جی ایک مشروط
اور محدود سِول نافرمانی کی تحریک (شروع کرنے کے مسئلے) پر
غور کرنے لگے انہوں نے تجویز کیا کہ مردوں اور عورتوں کو
انفرادی طور پر اس بات پر احتجاج کرنا چاہئے کہ ہندوستان کو
جنگ میں الجھایا جارہا ہے انہیں علانیہ ظاہر کرنا چاہیے کہ وہ جنگ
سے متعلق سرگرمیوں کے خلاف ہیں اور گرفتار ہوجانے کی کوشش
کرنا چاہئے میری رائے تھی کہ جنگ کے خلاف اس سے زیادہ
وسیع اور زیادہ شدید تحریک ہونی چاہئے لیکن اس پر گاندھی جی
کسی طرح نہ راضی ہوئے اس لئے میں آخر میں اس پر رضامند
ہوگیا کہ کم از کم انفرادی ستیہ گرہ تو شروع ہی ہو جائے ۔

اس تجویز کے مطابق چونا ہوئے پہلے انفرادی ستیہ گرہی یا
جنگ کے پہلے پہلے مخالف منتخب کئے گئے۔ پنڈت نہرو نے اپنے آپ
کو بطور دوسرے رضا کار کے پیش کیا اور گاندھی جی نے ان کو
بھی چن لیا۔ اس کے بعد اور بہت سے آئے اور جلد ہی انفرادی
ستیہ گرہ ایک عام قومی تحریک ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ
عدم تشدد کے مسئلے میں میرے اور گاندھی جی کے بنیادی اختلاف
کے باوجود جو پروگرام عمل میں آیا اس پر ہم دونوں متفق تھے ۔
ایسے انفرادی ستیہ گرہ میں کبھی کبھی مضحک باتیں بھی ہوجایا

کرنے پر آمادہ کریں۔ اُس وقت یہ بات عام طور پر معلوم نہیں ہوئی تھی، لیکن پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے فوراً بعد پریزیڈنٹ روزولٹ نے برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ وہ ہندوستانی لیڈروں کی شکائتوں کو دور کر کے انھیں اپنے ساتھ ملا لے۔ برطانوی حکومت ہند ان درخواستوں کو بالکل نظر انداز نہیں کرسکتی تھی اور اس نے اپنی پالیسی کو ایک حد تک بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔

دسمبر سنہ ۱۹٤۱ء میں وائسرائے نے طئے کیا کہ جواہرلال نہرو کو اور مجھے رہا کر دیا جائے۔ اس اقدام کا مقصد یہ جانچنا تھا کہ جنگ کی بدلی ہوئی صورت حال کا کانگریس پر کیا اثر پڑا ہے۔ حکومت دیکھنا چاہتی تھی کہ ہم کیا کرتے ہیں، اور پھر وہ سوچتی کہ دوسرے لوگ آزاد کئے جائیں یا نہ کئے جائیں بہرحال مجھے رہا کرنا تو ناگزیر تھا اس لئے کہ اس کے بغیر ورکنگ کمیٹی کا جلسہ نہیں ہو سکتا تھا

مجھے رہائی کا حکم ملا تو میں بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دراصل آزاد کئے جانے سے میری خود داری کو صدمہ پہونچا اس سے پہلے ہر موقعہ پر جب میں جیل سے نکلا تو میرے دل میں محدود کامیابی کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اس مرتبہ دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ اگرچہ لڑائی دو برس سے زیادہ جاری رہ چکی تھی، پھر بھی ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے کوئی موثر اقدام نہیں کر سکتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم حالات کے مارے ہوئے لوگ ہیں، اپنی تقدیر کے مالک نہیں ہیں۔

رہا ہونے کے فوراً بعد میں نے ورکنگ کمیٹی کا جلسہ باردولی

کرنے سے جنگ صحیح معنوں میں عالمگیر ہوگئی. جرمنی کے سوویٹ روس پر حملہ کرنے سے پہلے لڑائی صرف مغربی یورپ کی قوموں کے درمیاں ہو رہی تھی جرمن حملے نے جنگ کی حدود کو پھیلا کر ان میں نہایت وسیع علاقے شامل کر لئے جو اب تک لڑائی کے اثرات سے محفوظ تھے. متحدہ ریاستیں (امریکہ)، برطانیہ کو اچھی خاصی مدد پہنچا رہی تھیں مگر ابھی جنگ میں شریک نہیں ہوئی تھیں پرل‌ہاربر پر حملہ کر کے جاپاں، متحدہ ریاستوں کو کھینچ کر ہنگامے میں لے آیا اور جنگ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی

ابتدائی دور میں جاپان کی حیرت انگیز کامیابیوں کی بدولت لڑائی کا گردو غبار ہندوستاں کی سرحد پر نظر آنے لگا. چند ہفتوں کے اندر جاپاں نے ملایا اور سنگاپور کو فتح کر لیا تھا بہت جلد اُنکا برما پر، جو سنہ ۱۹۳۷- سے پہلے ہندوستاں کا ایک حصہ تھا، قبضہ ہو گیا. ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب ہندوستاں پرلشکرکشی کی جائیگی. خلیج بنگال میں جاپانی جہاز دیکھے جا چکے تھے اور تھوڑے دنوں میں اُنکا انڈمن اور نکوبار جزیروں پر قبضہ ہو گیا.

جاپاں جنگ میں شریک ہوا تو ظاہر ہو گیا کہ متحدہ ریاستوں کو متعلق معاملات کی ذمہ داری اپنے اوپر لینا ہوگی اس سے پہلے انکی طرف سے انگریزوں سے کہا گیا تھا کہ ہندوستاں سے سمجھوتا کر لیں. اب انہوں نے برطانیہ پر اور زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ ہندوستاں کے مسئلے کو طئے کریں اور اسے خوشی کے ساتھ تعاون

اپنی پالیسی بدلنے پر تیار ہے یا نہیں تو میں نے جواب دیا کہ یہ برطانوی حکومت کے رویہ پر منحصر ہے۔ اگر حکومت نے اپنا رویہ بدلا تو کانگریس بھی اپنا رویہ بدل دیگی۔ میں نے یہ بات صاف کردی کہ جنگ کے مسئلے میں کانگریس کی جو رائے یا پالیسی ہے، اُس کی حیثیت ایسے عقیدے کی سی نہیں ہے جس میں کبھی کوئی تغیر نہ ہوسکے اس کے علاوہ مجھ سے پوچھا گیا کہ اگر جاپان ملک پر حملہ کرے تو ہندوستانیوں کو کیا کرنا چاہئے؟ میں نے ایک لمحہ تامل یا تکلف کئے بغیر جواب دیا کہ ہر ہندوستانی کو تلوار ہاتھ میں لے کر ملک کا تحفظ کرنا چاہئے۔ اس کے بعد میں نے کہا «ہم یہ اُسی صورت میں کرسکتے ہیں کہ وہ زنجیریں کھول دی جائیں جن میں ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں جب ہاتھ پاؤں بندھے ہوں تو ہم کیسے لڑ سکتے ہیں؟»

لندن کے «ٹائمز» اور «ڈیلی نیوز» اخباروں نے اس پریس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی جی اور کانگریس کے لیڈروں کے درمیان اختلاف ہے گاندھی جی نے جنگ کے بارے میں ایک رائے قائم کرلی ہے جس کو بدلا نہیں جاسکتا، اور جس کی وجہ سے نہ گفت و شنید کی گنجائش رہتی ہے نہ امید۔ دوسری طرف کانگریس کے صدر کے بیان سے توقع ہوتی ہے کہ سمجھوتا کیا جاسکتا ہے۔

جب ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو گاندھی جی نے برطانیہ کے اخباروں کے تبصروں کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس کا اعتراف

میں طلب کیا۔ گاندھی جی وہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انھوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ جلسہ وہیں ہو۔ میں گاندھی جی سے ملنے گیا اور ملتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔ پہلے ہم دونوں کے درمیان صرف اصول کا اختلاف تھا اب میں نے دیکھا کہ حالات کا جائزہ لیکر ہم بنیادی طور پر مختلف نتیجے نکال رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کو اب یقین ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو آزاد تسلیم کرنے پر تیار اور رضامند ہو گئی ہے، بہ شرطیکہ ہندوستان جنگ کی سرگرمیوں میں پوری طرح تعاون کرنے کا وعدہ کرے وہ سمجھتے تھے کہ حکومت کا رجحان قدامت پسندی کی طرف ہے۔ اگرچہ مسٹر چرچل وزیر اعظم ہیں مگر لڑائی ایسی حد پر پہونچی ہے کہ جہاں انگریزوں کے لئے ہندوستان کے تعاون کے بدلے اس کو آزاد تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے میرا اپنا اندازہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ برطانوی حکومت خلوص کے ساتھ چاہتی ہے کہ ہم اس سے تعاون کریں لیکن وہ اب بھی ہندوستان کو آزاد کرنے پر تیار نہیں ہے جنگ کے دوران میں برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ یہ کریگی کہ ایک نئی ایکزیکیٹو کونسل بنائے، جس کے اختیارات زیادہ ہوں، اور کانگریس کو اس میں کافی نمائندگی دے۔ اس مسئلے پر ہمارے درمیان بحثیں ہوئیں، پر میں گاندھی جی کو قائل نہ کر سکا۔

رہائی کے تھوڑے عرصہ بعد میں نے کلکتہ میں پریس کانفرنس کی۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ جنگ کے معاملہ میں کانگریس

کے سامنے ایک ریزولیوشن کا مسودہ پیش کیا جس میں
میرا نقطۂ نظر بالکل صحیح صحیح پیش کیا گیا تھا ۔
اس کے بہت جلد بعد ہندوستان کی سیاسی کیفیت میں ایک
اور اہم تبدیلی ہوئی سبھاش چندر بوس نے جنگ کے چھڑتے ہی
سرگرمی کے ساتھ ایک تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد تھا
کہ جنگ کے لئے تیاری کے انتظامات کی مخالفت کی جائے
ان کی جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قید کر دیے گئے مگر
جب انھوں نے فاقہ شروع کیا تو انھیں چھوڑ دیا گیا ۲٦ جنوری
سنہ ۱۹٤۱ء کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان سے چلے گئے ہیں۔
قریب ایک سال تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی اور کوئی یقین
کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں مارچ
سنہ ۱۹٤۲ء کو تمام شکوک رفع ہوگئے جب برلن ریڈیو سے ان
کی ایک تقریر نشر کی گئی اب یہ بات ظاہر تھی کہ وہ جرمنی
پہنچ گئے ہیں اور وہاں انگریزوں کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے
کی کوشش کررہے ہیں اس دوران میں ہندوستان پر برطانوی
قبضے کے خلاف جاپانی جو پروپیگنڈہ کررہے تھے اس میں اور
شدت پیدا ہوگئی جرمنی اور جاپان سے پروپیگنڈے کا جو دھارا
مسلسل بہتا ہوا ہندوستان آرہا تھا اس کا بہت سے ہندوستانیوں پر
اثر ہوا۔ بہت سے لوگوں کے لئے جاپان کے وعدے میں بہت کشش
تھی، اور وہ سمجھتے تھے کہ جاپان ہندوستان کی آزادی اور
ایشیا کے اتحاد کے لئے کوشاں ہے اُن کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ
جاپان کے حملے نے برطانیہ کو کمزور کر دیا ہے، اس لئے اس

کیا کہ اُن پر ان تصوروں کا ایک حد تک اثر پڑا ہے اور اُن کے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ برطانوی حکومت اپنے رویہ کو بدلنے پر تیار ہوجائیگی اگر کانگریس جنگ میں تعاون کرنے کا وعدہ کرے۔ اس مسئلے پر دو دن تک بحث ہوتی رہی کہ کانگریس کا رویہ کیا ہونا چاہئے مگر کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہوسکا۔ گاندھی جی اپنی اس رائے پر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ عدم تشدد ایک عقیدے کا مرتبہ رکھتا ہے اور اُسے کسی حالت میں ترک نہیں کیا جاسکتا اس سے ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی ہندوستان کا جنگ میں شرکت کرنا پسند نہیں کرسکتے تھے میں نے اپنے خیال کو، جسے میں پہلے بھی بیان کرچکا تھا، دہرایا کہ کانگریس کو ہندوستان کی آزادی پر زیادہ زور دینا چاہئے اور عدم تشدد کے مسئلے پر مقابلتاً کم

گاندھی جی میں مشکل سے مشکل مسئلوں کا حل تلاش کرلینے کی جو صلاحیت تھی، اس کا ایک نمایاں ثبوت اس طرح ملا کہ انھوں نے اس بند گلی سے نکلنے کے لئے ایک فارمولا تجویز کیا، جس سے دونوں مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے مطمئن ہوسکتے تھے۔ ان میں اس کی بھی حیرت انگیز صلاحیت تھی کہ اپنے مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھیں اور اسے منصفانہ طریقہ پر بیان کریں جب انھوں نے دیکھا کہ میں ہندوستان کی جنگ میں شرکت کے معاملے میں سختی سے اپنی رائے پر قائم ہوں تو اُنھوں نے میرے اوپر دباؤ ڈالنا چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس انھوں نے ورکنگ کمیٹی

حس کی وحه سے ہم نے اُسے نامنظور کیا، تفصیل کے ساتھ بحث کرونگا یہاں مں ایک افواہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں حو ِ کرپس کی آمد کے وقت گشت کر رہی تھی. یہ حبر گرم تھی کہ سبھاش بوس ایک ہوائی حادثہ میں مر گئے. اس سے ہندوستان میں ایک سنسنی سی پھیلی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی گاندھی حی کو بھی اس سے صدمہ پہونچا انہوں نے سبھاش بوس کی والدہ کو ایک تعزیتی پیغام بھیحا حس میں انہوں نے اُن کے لڑکے اور لڑکے کی قومی حدمات کا بہت پُرحوش انداز میں ذکر کیا. بعد کو معلوم ہوا کہ حبر علط ہے. ِ کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ گاندھی حی ایسے شخص، سبھاش بوس کے بارے میں حدبات کے اس حوش کے ساتھ بات کرینگے ' گاندھی حی عدم تشدد کے اصول سے پختہ عقیدت رکھتے تھے، اور سبھاش بوس نے محوری طاقتوں کا کھلم کھلا ساتھ دیا تھا اور میدان حنگ میں اتحادیوں کی شکست کے لئے پُرزور پروپگنڈا کر رہے تھے.

سے ہم کو اپنی آزادی کی جد و جہد میں مدد ملی ہے، اور ہمیں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ ملک میں اس خیال کے جو لوگ تھے، اُن کی جاپان کے ساتھ ہمدردی بڑھتی رہی

گاندھی جی نے اور میں نے جو حالات کا اندازہ لگایا تھا، اس میں ایک اور اختلاف تھا۔ گاندھی جی اس وقت تک اس خیال کی طرف مائل ہوچکے تھے کہ جنگ میں اتحادی کامیاب نہ ہوسکیں گے انہیں اندیشہ تھا کہ جرمنی اور جاپان کی فتح ہوگی اور اگر یہ نہ ہوا تو دونوں فریق زچ ہوکر رہ جائنگے

جنگ کے انجام کے بارے میں گاندھی جی نے اپنے اس خیال کو صاف صاف بیان نہیں کیا، مگر ان سے جو بحثیں ہوئیں، ان سے مجھے اندازہ ہوا کہ اتحادیوں کی فتح میں ان کا یقین کم ہوتا جارہا ہے میں نے یہ بھی دیکھا کہ سبھاش بوس کے ہندوستان سے بچ نکلنے اور جرمنی پہنچ جانے کا گاندھی جی پر بہت اثر ہوا ہے۔ ان کی بعض ادھر اُدھر کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اُس ہمت اور جوش تدبیری کو قابل تعریف سمجھتے ہیں، جس کا سبھاش بوس نے ہندوستان سے نکل بھاگنے میں ثبوت دیا تھا سبھاش بوس کے لئے ان کے دل میں جو قدر پیدا ہو گئی تھی، اس نے غیر محسوس طریقہ پر جنگ کی ساری کیفیت کو اُن کی نظروں میں ایک اور رنگ دیدیا

یہی جذبہ اُن اثرات میں سے تھا جنہوں نے ان گفتگوؤں کی صفائی میں فرق ڈالدیا جو کرپس مشن سے ہوئیں۔ میں بعد کے ایک باب میں اس تجویز پر جو کرپس لائے تھے اور اُن اسباب پر

جواہر لال کے چین جانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ چیانگ کائی شک نے ایک مشن ہندوستان بھیجا، اور مجھے اس حیثیت سے کہ میں کانگریس کا صدر تھا، ایک خط لکھا اپنے خط میں انہوں نے ہندوستانیوں کے حوصلوں اور تمناؤں سے پوری ہمدردی اور ہندوستان کی بہبودی کے بارے میں اپنی فکرمندی ظاہر کی. اب انہوں نے طئے کیا کہ وہ خود ہندوستان آئیں اور وائسرائے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملاقات کرکے دیکھیں کہ مصالحت کی کیا تدبیر کی جاسکتی ہے؟ انہیں امید تھی کہ اس طرح ہندوستان کے قومی لیڈروں کو جنگ کی سرگرمیوں میں شریک کرنے کی کوئی صورت نکل آئے گی.

میں دہلی میں تھا، اور آصف علی کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، جب مجھے معلوم ہوا کہ چیانگ کائی شک فروری سنہ ۱۹۴۲ء کے نصف اول میں ہندوستان آنے والے ہیں مجھے میڈم چیانگ کائی شک کا پیغام ملا کہ وہ بھی ساتھ آئیں گی اُسی کے تھوڑے دن بعد حکومت کی طرف سے اعلان شائع ہوا کہ سپہ سالار آعظم اور میڈم چیانگ کائی شک دہلی آرہے ہیں اور وہ حکومت ہند کے مہمان ہوں گے.

سپہ سالار آعظم اور میڈم چیانگ کائی شک ۹ فروری سنہ ۱۹۴۲ء کو دہلی پہونچے. ان کے آنے کے دو دن بعد جواہرلال اور میں دونوں ان سے ملاقات کے لئے گئے. ان سے بات کرنے میں ایک دشواری یہ تھی کہ وہ چینی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتے تھے، ان کے ساتھ ایک ترجمان تو تھا، مگر ظاہر ہے کہ اسکی وجہ

چین کی طرف گریز

پریذیڈنٹ روزویلٹ کو جو فکر تھی کہ ہندوستان جنگ میں شریک ہو اُس کا میں ذکر کر چکا ہوں ویسا ہی خیال سپہ سالار اعظم چیانگ کائی شک برابر پیش کرتے رہے تھے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی وہ اصرار کرنے لگے کہ انگریزوں کو ہندوستان کے ساتھ سمجھوتا کر لینا چاہئیے، اور جاپان کے پرل ہاربر پر حملہ کرنے کے بعد یہ اصرار اور بڑھ گیا جاپان کی مداخلت کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ چیانگ کائی شک اور چینی حکومت کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوگیا متحدہ ریاستوں، برطانیہ، سوویٹ یونین اور فرانس کی طرح چین کا بھی دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہونے لگا چیانگ کائی شک برابر برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالتے رہتے تھے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لے اُن کی رائے تھی کہ اگر ہندوستان اپنی مرضی سے جنگ میں شریک نہ ہوا تو وہ مدد نہ مل سکے گی جسے فراہم کرنے کی وہ قدرت رکھتا ہے۔

جنگ شروع ہونے سے کچھ پہلے جواہر لال نہرو جنوبی چین گئے تھے، چیانگ کائی شک اُن کے میزبان تھے، اور اس طرح ان سے قریبی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی سیاسی کیفیت کے بارے میں براہ راست معلومات بھی حاصل کر لیں۔

یقین ہے کہ اگر ہندوستانیوں نے دانشمندی اور تدبر سے کام لیا تو وہ جنگ کے موقع سے پورا فائدہ اٹھا کر آزاد ہو سکینگے۔

پھر چیانگ کائی شک نے مجھ سے پوچھا کہ ہندوستان کا صحیح مقام کہاں ہے؟ کیا اسے نازی جرمن کے ساتھ ہونا چاہئے، یا جمہوری ریاستوں کے؟

میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں ہے کہ اگر ہمارے راستے سے رکاوٹیں ہٹادی جائیں تو میں ہر ممکن کوشش کرونگا کہ ہندوستان جمہوری ریاستوں کے ساتھ مل جائے۔

اس کے بعد چیانگ کائی شک نے خطیبانہ انداز اختیار کرکے ہم سے ایک سوال پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ عالمگیر جنگ جس بات کا فیصلہ کریگی وہ یہ ہے کہ بے شمار انسان آزاد ہونگے یا غلام رہینگے یہ دیکھتے ہوئے کہ کیا کچھ داؤں پر لگا ہے۔ کیا ہندوستانیوں کا یہ فرض نہیں ہوجاتا ہے کہ وہ بغیر کوئی شرط لگائے ہوئے برطانیہ اور چین کا ساتھ دیں؟

میں نے جواب دیا کہ ہم جمہوری ریاستوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں مگر یہ ضروری ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اپنے اختیار اور ارادے سے جمہوری ریاستوں کے ساتھ شریک ہوں۔

چیانگ کائی شک نے پھر کہا کہ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے، اُن کی رائے میں ڈومینین اسٹیٹس اور کامل آزادی میں کوئی اہم فرق نہیں ہے، انھوں نے اس نکتہ کو بہت تفصیل سے سمجھایا اور کہا کہ اگر برطانوی حکومت سوراج کے ساتھ ڈومینین اسٹیٹس دینے کی تجویز پیش کرے، تو دانشمندی کی

سے ہماری گفتگو سست اور کسی قدر رسمی ہو گئی. چیانگ کائی شک نے تمہید کے طور پر ایک لمبی تقریر کی، جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ایک ماتحت قوم دو طریقوں میں سے ایک اختیار کر کے آزادی حاصل کر سکتی ہے؟ یا تو وہ غیر ملکی عنصر کو بزور شمشیر ملک سے باہر نکال دے یا اپنی آزادی پُرامن طریقے سے حاصل کرے اس دوسرے طریقہ کو اختیار کیا جائے تو آزادی کی منزل تک صرف بتدریج پہنچا جا سکتا ہے سوراج کی منزل کی طرف صرف ایک ایک قدم اُٹھایا جا سکتا ہے؟ یہاں تک کہ ہم اپنا مقصود حاصل کر لیں یہی دو طریقے ہیں جنھیں کوئی قوم غیر ملکی یا ملکی مستبد حکمراں کے خلاف لڑنے میں اختیار کر سکتی ہے.

چیانگ کائی شک نے کہا کہ چین اس اصول کے مستند ہونے کی ایک واضح مثال ہے. چین کی قومی تحریک سنہ ۱۹۱۱ء میں ہوئی لیکن آزادی حاصل ہونے تک اسے کئی منزلوں سے گزرنا پڑا. ہندوستان کو اسی رستے پر چلنا ہوگا ظاہر ہے یہ فیصلہ تو ہندوستانی ہی کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کو کس طرح حاصل کریں. چیانگ کائی شک کا کہنا یہ تھا کہ اگر آزادی ایک ہلّہ میں حاصل نہ ہو سکتی ہو تو اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان اسے بتدریج حاصل کرے. پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اس سارے زمانے میں برطانوی حکومت سے خط و کتابت کرتے رہے ہیں اور برطانوی وزیر اعظم کو مفصل پیغامات بھیج چکے ہیں. انہیں وزیر اعظم کا ایک جواب بھی ملا ہے اور انہیں

عد ہندوستان کے مسئلے کو کس طرح طئے کیا جائے گا؟ جیسے ہی برطانوی حکومت اس کا یقین دلا دیگی کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا، ہمارے اور اُس کے درمیاں سمجھوتا ہوسکتا ہے

مڈم چیانگ کائی شک نے مجھ سے پوچھا کہ ہندیں اعتراض تو نہ ہو گا اگر برطانوی حکومت کو ہماری گفتگو کے بارے میں مطلع کیا گیا

میں نے جواب دیا کہ پبلک میں کانگرس نے یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ ہمارے خیالات چاہے جس سے بھی بیان کئے جائیں اس میں کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا.

جتنے دن سپہ سالار اعظم چیانگ کائی شک ہندوستان میں رہے، حکومت ہند شش و پنج کی حالت میں تھی وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُن کے اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان ایسے قریبی تعلقات ہوں۔ اس سے ملک کے اندر اور باہر یہ خیال ہوسکتا تھا کہ وہ ہم سے ملنے آئے ہیں دوسری طرف چیانگ کائی شک نے یہ بات صاف کردی تھی کہ وہ جنگ کے حالات پر صرف وائسرائے اور کمانڈر انچیف سے نہیں بلکہ وہ کانگریس کے لیڈروں سے تبادلۂ خیال کرنے بھی آئے ہیں۔ اس وجہ سے حکومت اُن کو ہم سے تعلقات قائم کرنے سے روک نہیں سکتی تھی۔

چیانگ کائی شک نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی حکومت نے ایک سرکاری قسم کی سیر کا پروگرام بنایا تھا جس کے مطابق حکومت کے چنے ہوئے لوگ ساتھ جانے والے

بات یہ ہوگی کہ ہندوستان اُسے منظور کرلے. انھوں نے اسی کے ساتھ کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ جواہر لال نہرو اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے اور کامل آزادی چاہتے ہیں مگر میں ہندوستان کا خیرخواہ ہوں اور اس وجہ سے میں یہ مشورہ دونگا کہ ہندوستان ایسی پیشکش کو نامنظور نہ کرے

جواہر لال نے مجھ سے کہا کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اس کا جواب مجھ کو دینا چاہئے. میں نے چیانگ کائی شک سے کہا کہ اگر جنگ کے دوران میں برطانوی حکومت ڈومینین اسٹیٹس پیش کرے اور اس پر راضی ہو کہ ہندوستان کے نمائندے آزادی اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ کام کرسکیں تو کانگریس اس پیشکش کو نامنظور نہ کریگی

اسی وقت میڈم چیانگ کائی شک بھی آگئیں اور ہمیں چائے پینے کی دعوت دیں ان کی موجودگی میں گفتگو کرنا آسان ہوگیا اس لئے کہ انھوں نے متحدہ ریاستوں (امریکہ) میں تعلیم پائی تھی اور انگریزی بے تکلف بولتی تھیں.

چیانگ کائی شک نے کہا یہ بدیہی بات ہے کہ جنگ کا بوجھ برطانوی حکومت کو اُٹھانا پڑیگا. یہ توقع رکھنا انصاف کی بات نہ ہوگی کہ جنگ کے دوران میں وہ پوری ذمہ داری ہندوستانیوں کو سونپ دینگے.

میں نے جواب دیا کہ دوران جنگ کے لئے ایسی تجویز مرتب کی جاسکتی ہے جو ہندوستان کے لیڈروں اور برطانوی حکومت دونوں کے لئے قابل قبول ہو. اصل مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کے

لیکن یہ واقعی تعجب کی بات ہوگی اگر ان پر گاندھی جی کی اس جاذبیت کا اثر نہ پڑا ہو جسے ہر غیر ملکی آدمی محسوس کرتا تھا۔

راونگی سے پہلے چیانگ کائی شک نے برطانیہ سے پُر جوش اپیل کی کہ جس قدر جلد ہوسکے ہندوستان کو حقیقی معنوں میں سیاسی اختیارات دے۔ مگر یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ وائسرائے اور برطانوی حکومت کو اس کا یقین نہیں دلا سکتے تھے کہ ہندوستان کو فوراً ایک ڈومینین کی حیثیت دینا ضروری ہے۔

تھے . لیکن میڈم چیانگ کائی شک نے کہا کہ جواہر لال نہرو کو اُن کے ساتھ آگرہ جانا چاہئے اس لئے وہ بھی پارٹی میں شامل ہوگئے یہ بات بھی حکومت کو سخت ناگوار گذری.

دہلی سے چیانگ کائی شک کلکتہ گئے حکومت بنگال نے اُن کے ٹھہرنے کے لئے پرانے گورنمنٹ ہاؤس میں انتظام کیا تھا. چیانگ کائی شک نے جواہر لال کو اس کی اطلاع دی اور کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ آپ سے کلکتہ میں پھر ملاقات ہوگی. جواہر لال کلکتہ گئے اور وہاں پھر دونوں میں باتیں ہوئیں. گاندھی جی اس وقت برلاپارک میں ٹھہرے تھے، اور چیانگ کائی شک وہاں ان سے ملنے آئے وہ قریب دو گھنٹے گفتگو کرتے رہے میڈم چیانگ کائی شک نے ترجمان کے فرائض انجام دئے. گاندھی جی نے انہیں سنایا کہ انہوں نے کس طرح جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ شروع کی تھی، اور کس طرح ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے بے تشدد عدم تعاون کے فن کو برتا اور مقصد کے مطابق ڈھالا تھا.

جب چیانگ کائی شک کلکتہ گئے تو میں وہاں نہیں تھا. جواہر لال نے بعد میں مجھے ملاقات کے بارے میں بتایا. اُس زمانے میں وہ ہر معاملے میں گاندھی جی سے اتفاق نہیں کرتے تھے، اور انہوں نے محسوس کیا تھا کہ جس طریقہ سے گاندھی جی نے گفتگو کی تھی اس کا چیانگ کائی شک پر بہت اچھا اثر نہیں پڑا. اس بارے میں میرے لئے کوئی رائے دینا مشکل ہے. ممکن ہے کہ گاندھی جی کی دلیلیں چیانگ کائی شک کو قائل نہ کر سکی ہوں

کو مان لیا تو ہندوستانی قوم گاندھی جی کی رائے کے مقابلے میں میری رائے پر چلنا زیادہ پسند کرے گی؟ میں نے کہا کہ ہم سب گاندھی جی کی انتہائی عزت اور قدر کرتے ہیں، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کا انتہائی لحاظ کرتے ہیں، مگر مجھے اطمینان ہے کہ اس خاص مسئلے میں کانگریس اور ملک کی اکثریت میری ہم خیال ہے۔ اس لئے میں ان کو یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ہندوستان آزاد ہوگیا تو سارا ملک دل و جان سے جنگ کے کاموں میں مدد کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ ایسی صورت میں ہندوستان کے لوگ لازمی خدمت کے لئے تیار ہوں گے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ ہم اس پر خوشی سے راضی ہو جائیں گے اور اس کا خیال رکھیںگے کہ جنگ کے سلسلے میں ہندوستان کی جد و جہد ہمہ گیر ہوتی ہے۔

سر سٹیفرڈ نے مجھے ایک یادداشت تیار کرکے بھیجی جس میں ہماری گفتگوؤں کا خلاصہ اور برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کے درمیان مفاہمت کے متعلق تجویزیں درج تھیں۔ ان کی تجویز تھی کہ برطانوی حکومت اس کا فوراً اعلان کرے کہ لڑائی بند ہوتے ہی ہندوستان کو آزاد قرار دے دیا جائے گا۔ اس اعلان میں ایک دفعہ یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا کہ وہ برطانوی کامن ولتھ میں شامل رہے گا یا نہیں۔ جنگ کے دوران کے لئے (وائسرائے کی) ایکزیکیوٹو کاؤنسل دوبارہ مرتب کی جائے، اور اس کے ممبروں کو وزیروں کا مرتبہ حاصل ہو۔ وائسرائے کی حیثیت ایک دستوری افسر اعلیٰ کی سی ہوگی۔ اس طرح عملاً حکومت کا اختیار منتقل کر دیا جائے گا، مگر اسے

کرپس مشن

جیسے جیسے جنگ کے حالات تاریک ہوتے گئے، لوگوں کو یہ توقع ہوئی کہ ہندوستان کے معاملے میں برطانوی حکومت کا رویہ بدلے گا. یہ واقعی ہوا بھی، اور اس کا نتیجہ سنہ ۱۹۴۲ء کا کرپس مشن تھا. مشن کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ایک گذشتہ موقع کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جب جنگ چھڑنے کے فوراً بعد سر سٹیفرڈ کرپس ہندوستان آئے تھے. ہندوستان کے اس سفر کے دوران میں ان کی کئی بار مجھ سے گفتگو ہوئی، بلکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسے کے دوران میں وہ کئی دن وردھا میں رہے. ظاہر ہے ہندوستان کی جنگ کی سرگرمیوں میں شرکت ایک مسئلہ تھا جس پر ہم اکثر گفتگو کرتے تھے.

اس سفر کے دوران میں سر سٹیفرڈ کرپس نے متعدد بار کہا کہ جنگ کے متعلق گاندھی جی کے خیالات معلوم ہیں اور انہیں دیکھتے ہوئے اس کی بہت کم اُمید کی جاسکتی ہے کہ برطانوی حکومت سے ان کا سمجھوتا ہوسکے گا. میرے خیالات بھی بہت سے لوگوں کو معلوم تھے اور ان کو گفتگو کی بنیاد بنایا جاسکتا تھا. انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں ان کو یقین دلا سکتا ہوں یا نہیں کہ اگر برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کے مطالبے

کو طے کریں۔ پرل ہاربر کے بعد امریکہ کی پبلک اس بات پر اور بھی زیادہ اصرار کرنے لگی کہ جنگ کی سرگرمیوں میں ہندوستان کا آزادانہ تعاون حاصل کیا جائے۔ مسٹر چرچل تک کو التفات کا کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے ایک نیا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور کرپس کو ایک نئی پالیسی کی وکالت کے لئے منتخب کیا۔

سوویٹ یونین سے واپسی کے بعد کرپس کی بڑی شہرت ہوگئی تھی۔ عام رائے یہ تھی کہ ماسکو میں ایک منصوبہ جس کے لئے بہت سلیقے اور موقع شناسی درکار تھی انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا تھا اسلئے ہندوستان سے گفت وشنید کرنے کے لئے وہ موزوں معلوم ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان کے مسئلے میں کئی سال سے دلچسپی لیتے رہے تھے۔ مجھے بعض باتوں کی بنا پر اس کا یقین ہے کہ انھوں نے مسٹر چرچل کے سامنے وہ یادداشت پیش کی جو انھوں نے ہندوستان کے آخری سفر میں وردھا میں تیار کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یادداشت میں جو تجویزیں تھیں انھیں مسٹر چرچل نے منظور نہیں کیا، پھر بھی کرپس نے ان کی باتوں سے یہ اثر لیا کہ ان کی سکیم قابل قبول ہوگی۔ اسلئے وہ خوشی سے ہندوستان آنے پر تیار ہوگئے۔ مجھ سے ان کی جو گفتگو ہو چکی تھی اس سے انھیں اندازہ ہوا تھا کہ کانگریس کی طرف سے ان کی سکیم کے منظور ہو جانے کا خاصا قومی امکان ہے۔

کرپس مشن کے ہندوستان بھیجے جانے کا بی. بی. سی سے اعلان

قانوناً منتقل کرنے کی کارروائی لڑائی ختم ہونے کے بعد ہوگی.

سر سٹیفرڈ نے اپنی تجویز کے بارے میں میری رائے دریافت کی. میں نے جواب دیا کہ ایسے اہم معاملے کی ایک فرضی صورت پیش کی جائے تو میں قطعی طور پر اپنے آپ کو کسی فیصلے کا پابند نہیں کر سکتا ہوں، لیکن میں انہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ایک مرتبہ ہندوستانی قوم کو پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ برطانوی حکومت واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے تو اختلافات کو دور کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالی جا سکے گی.

ہندوستان سے سر سٹیفرڈ ایک غیر سرکاری مہمان کی حیثیت سے روس گئے. اسی کے تھوڑے دن بعد وہ روس میں برطانوی سفیر مقرر کر دئے گئے. کبھی کبھی یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ سوویٹ روس کو اتحادیوں کے قریب لانا انہیں کا کام تھا. آخر میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا تو ہٹلر اور ستالن کے ایک دوسرے سے الگ ہوجانے کا واقعہ بڑی حد تک ان کی کوشش کا نتیجہ سمجھا گیا. اس سے ان کا بڑا نام ہو گیا، اور برطانیہ کی پبلک زندگی میں ان کا مرتبہ بہت بڑھ گیا. مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ واقعی سوویٹ پالیسی پر کچھ گہرا اثر ڈال سکے تھے، لیکن بہرحال ان کی عزت اور شہرت بہت بڑھ گئی. اور جب وہ برطانیہ واپس گئے تو بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مسٹر چرچل کی جگہ وزیر اعظم ہوجائیں گے.

میں اس طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ پریزیڈنٹ روزولٹ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ہندوستان کے مسئلے
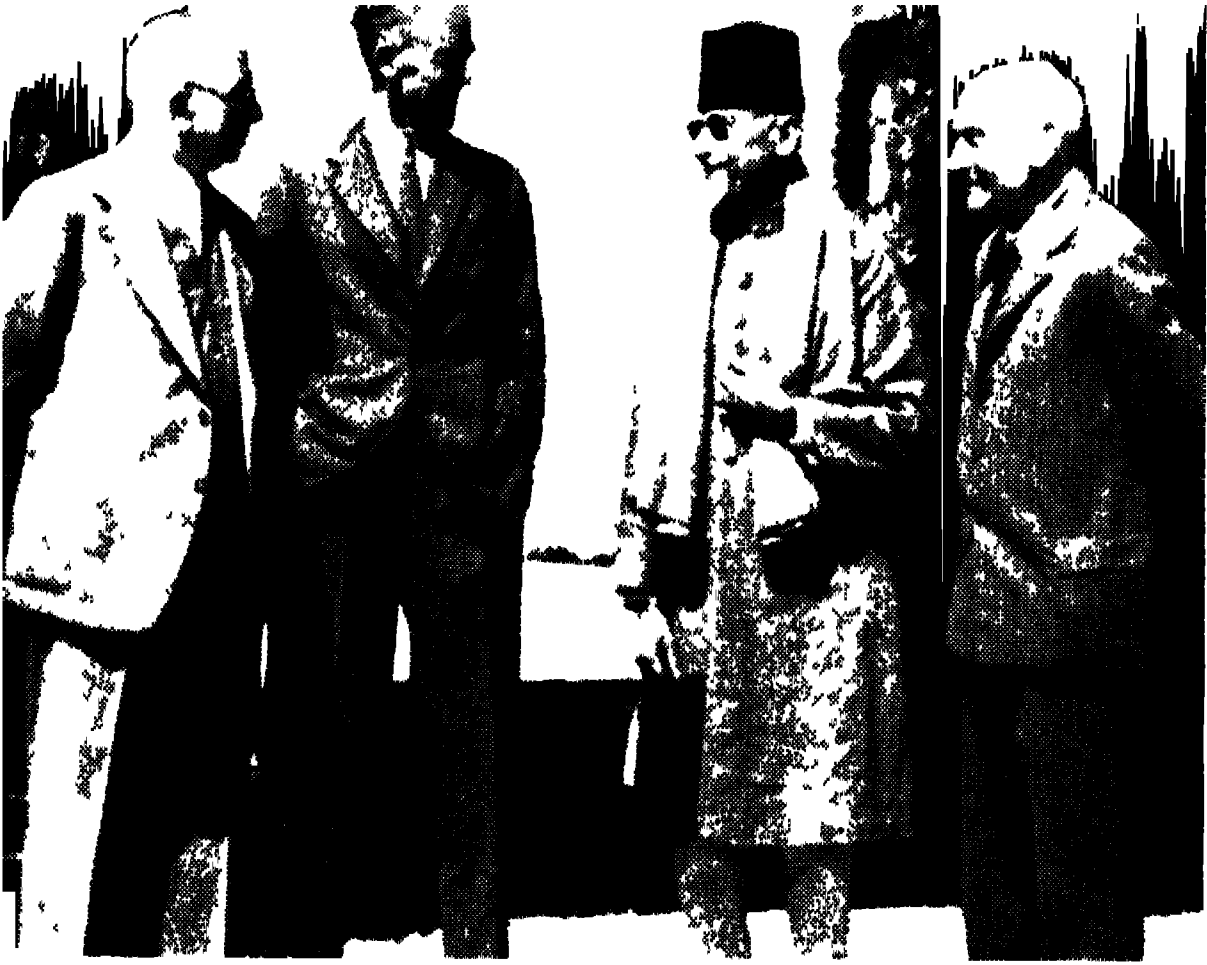
صدر کانگریس مولانا آزاد وائسریگل لاج میں
بائیں سے دائیں اے وی الگزنڈر، سر اسٹیفرڈ کرپس،
مولانا آزاد۔ لارڈ پیتھک لارنس ۔ ۵ مئی ۱۹۴۶ء

صدر کانگریس اور آصف علی صاحب کی کابینہ مشن سے ملاقات
بائیں سے دائیں لارڈ پیتھک لارنس۔ مولانا آزاد آصف علی
صاحب، مسٹر اے وی الگزنڈر، سر اسٹیفرڈ کرپس

ہوا تو اس کا مختلف لوگوں پر مختلف اثر پڑا. ہندوستان میں بے شمار خیال آرائیاں کی گئیں، مگر کسی کو صحیح صحیح معلوم نہ تھا کہ برطانوی حکومت کیا تجویز پیش کرے گی. بی بی. سی کا اعلان ہندوستان میں ۱۱ مارچ کی شام کو ۸ بجے سنا گیا. اس کے ایک گھنٹے کے اندر اخبار والوں نے مجھ سے میری رائے پوچھی. میں نے کہا:

«میں اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتا جب تک کہ مجھے اس تجویز کی صحیح تفصیلات معلوم نہ ہوں جو سرسٹیفرڈ کرپس پیش کرنے کے لئے آرہے ہیں. مگر ایک پرانے دوست کی حیثیت سے میں ان کا خیرمقدم کرونگا اور جہاں تک ممکن ہوگا ان کی رائے کو مان لونگا.»

اگرچہ اخبار والوں نے بہت چاہا کہ میں کچھ اور کہوں لیکن میں نے اپنے آپ پر کوئی مزید رائے دیکر پابندی نہیں لی.

میں وردھا میں تھا جب وائسرائے کا تار آیا کہ برطانوی کابینہ نے سرسٹیفرڈ کرپس کو ایک مشن پر ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، اور مجھے دہلی آکر، ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کی اُن تجویزوں پر گفتگو کرنا چاہئے جو وہ لارہے ہیں. میں نے اس دعوت کو قبول کیا اور وائسرائے کو اس کی اطلاع کردی

ہندوستان آنے سے پہلے سرسٹیفرڈ کرپس نے وائسرائے کو لکھا تھا کہ وہ ہندوستان کی تمام اہم پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں. لیڈروں کی فہرست غالباً حکومت ہند نے مرتب کی، اور طے کیا کہ کانگریسی لیڈروں کے علاوہ لیگ کے

لیڈروں کو بھی دعوت دی جائے۔ مزید برآں، والیان ملک کے نمائندوں، ہندو مہا سبھا اور خان بہادر اللہ بخش کو، جو اس وقت سندھ کے چیف منسٹر تھے، دعوت دی گئی۔ خان بہادر اللہ بخش کو حال میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے کنونشن کی صدارت کرنے کے بعد اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ میں نے اس کنونشن میں شرکت نہیں کی تھی، مگر پس پردہ اس کے انتظامات میں مدد کی تھی۔ کنونشن بہت دھوم دھام سے ہوا تھا اور ہندوستان کے ہر حصے سے ۱۴۰۰ ڈیلیگیٹ اس کے اجلاس میں شریک ہونے کو دہلی آئے تھے۔ اجلاس اس قدر موثر تھا کہ انگریزی اور اینگلو انڈین اخبار، جو معمولاً نیشنلسٹ مسلمانوں کی اہمیت کو کم کرکے دکھانے کی کوشش کرتے تھے، اسے نظر انداز نہ کر سکے۔ وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ کانفرنس اس کا ثبوت ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان ناقابل لحاظ عنصر نہیں ہیں۔

میں سر سٹیفرڈ سے ان کے دہلی پہنچنے کے جلد ہی بعد ملا۔ پہلی ملاقات ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو ہوئی سر سٹیفرڈ نے ایک بیان تیار کیا تھا جس میں ان کی تجویزیں درج تھیں۔ یہ بیان ضمیمہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے یہ بیان مجھے دیا اور کہا کہ وہ اپنی تجویزوں پر مزید گفتگو کرنے اور جوابات واضح نہ ہوں تو اسے سمجھانے کو تیار ہیں۔ میں نے جب بیان کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ وائسرائے کی نئی ایکزیکوٹو کاؤنسل کے بارے میں ایک تجویز ہے۔ کاؤنسل کے موجودہ ممبر سب استعفٰے دے دینگے۔ اس کے بعد کانگریس اور دوسری نمایاں حیثیت رکھنے والی پارٹیوں

مولانا آزاد اور لارڈ پیتھک لارنس سہ جماعتی کانفرنس کے موقع پر
شملہ میں ۔ ۵ مئی ۱۹۴۶ء

ہندوستان کے وائسرے
انڈین نیشنل کانگرس
کے صدر سے افتتاح
کانفرنس کے موقع ۔
مصافحہ کر رہے ہیں

نے اب تک غور نہیں کیا ہے، لیکن وہ مجھے اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں کانگریس کے جو خیالات ہوں گے ان کا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ پھر انھوں نے کچھ سوچ کر کہا کہ انڈیا آفس قائم رہے گا اور وزیر ہند بھی رہے گا، مگر اس کی حیثیت ویسی ہی ہوگی جیسی کہ کسی دوسری ڈومینین کے وزیر نو آبادیات کی ہوتی ہے۔ میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد سے ہندوستان کس طرح جنگ میں شرکت کرنے پر آمادگی ظاہر کرتا رہا، اس شرط پر کہ اس کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ انگریزوں کا قصور تھا کہ انھوں نے اس پیش کش سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں کہ ہندوستان جنگ میں اور زیادہ حصہ نہیں لے سکا، سر سٹیفرڈ نے بار بار کہا کہ انہیں اس کا افسوس ہے کہ اب تک بات بگڑتی رہی، لیکن انہیں یقین ہے کہ اگر وہ پیش کش جو وہ برطانوی کابینہ کی طرف سے لائے ہیں قبول کر لی گئی تو آئندہ ایسا کچھ نہ ہوگا۔

اس طرح ہماری پہلی ملاقات ختم ہوئی تو کیفیت امید افزا تھی۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو طلب کیا گیا اور اس کا سلسلہ ۱۱ اپریل تک جاری رہا۔ شاید اس وقت تک کسی اجلاس نے اتنا طول نہیں کھینچا تھا۔ جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے، تجویزوں پر غور کرتے ہوئے کسی ممبر کی کچھ کیفیت تھی، کسی کی کچھ، اور ہر ایک کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔

گاندھی جی پہلے دن سے تجویزوں کو منظور کرنے کے

سے درخواست کی جائے گی کہ وہ اپنے نامزد کردہ لوگوں کے نام بھیجیں، اور نئی ایکزیکیوٹو کاؤنسل انھیں ممبروں پر مشتمل ہوگی. یہ کاؤنسل جنگ کے دوران میں کام کرے گی. برطانوی حکومت باضابطہ عہد کرے گی کہ لڑائی ختم ہوتے ہی ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں کارروائی کی جائے گی.

تجویز کا خلاصہ گویا یہ تھا کہ موجودہ ایکزیکیوٹو کاؤنسل کے بجائے، جس میں انگریز ممبروں کی اکثریت تھی، ایک نئی ایکزیکیوٹو کاؤنسل بنے گی جس میں سب ہندوستانی ہوں گے. انگریز افسر سکریٹریوں کی حیثیت سے رہیں گے، کاؤنسل کے ممبر نہ ہونگے لیکن نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی.

میں نے سر سٹیفرڈ سے پوچھا کہ کاؤنسل میں وائسرائے کی کیا حیثیت ہوگی؟ سر سٹیفرڈ نے جواب دیا کہ انگلستان کے بادشاہ کی طرح وہ ایک دستوری حکمران اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرے گا. میں نے اس نیت سے کہ شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے ان سے کہا کہ اس کی تصدیق کریں کہ وائسرائے دستوری حکمران اعلیٰ کی طرح کاؤنسل کے مشورہ کے مطابق عمل کرے گا. سر سٹیفرڈ نے کہا کہ منشا یہی ہے. میں نے پھر کہا کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ اختیار کسے حاصل ہوگا، مجوزہ کاؤنسل کو یا وائسرائے کو؟ سر سٹیفرڈ نے پھر کہا کہ اختیار کاؤنسل کو حاصل ہوگا جیسے کہ برطانوی کابینہ کو ہے. تب میں نے پوچھا کہ اس تنظیم میں انڈیا آفس کی کیا حیثیت ہوگی؟ سر سٹیفرڈ نے کہا کہ یہ ایک تفصیل کا معاملہ ہے جس پر انھوں

کرپس یہاں تھے تو ان سے ترکاری کھانے کے فلسفے پر بحثیں ہوئی تھیں۔ کرپس نے کہا کہ انہیں بہت افسوس ہے کہ غذا کے بارے میں جو باتیں ہوئیں وہ تو گاندھی جی کے ذہن میں محفوظ رہیں اور وہ ان تجویزوں کو بھول گئے جو بہت غور کے بعد اور خود ان سے مشورہ کرکے مرتب کی گئی تھیں۔

گفتگو کے دوران میں گاندھی جی اور کرپس ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہے، مگر اسی کے ساتھ کبھی کبھی جھڑپ بھی ہوجایا کرتی تھی، اگرچہ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ گاندھی جی نے کہا کہ (کرپس کی) تجویزیں قطعی اور آخری شکل میں پیش کی گئی ہیں، اور ان میں گفتگو کرکے تبدیلی کرنے کا امکان بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے ہنس کر کرپس کو آگاہ کیا کہ میں ان کو بہت ڈھیل دے رہا ہوں، مگر انہیں ہوشیار رہنا چاہئے۔ کرپس نے الٹ کر جواب دیا کہ انہیں معلوم ہے کہ میں انہیں اتنی ڈھیل دے رہا ہوں کہ ان کی ہلاکت کا سامان ہوجائے۔

جواہر لال ان واقعات کی وجہ سے بہت بے چین تھے جو یورپ اور ایشیا میں رونما ہو رہے تھے، اور انھیں ان جمہوری ریاستوں کے انجام کی بہت فکر تھی۔ ان کی طبیعت انھیں ان سے ہمدردی کرنے پر آمادہ رکھتی تھی، اور وہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ہوسکے ان کی مدد کریں۔ اس لئے ان کا رجحان کرپس کی تجویزوں کو منظور کرنے کی طرف تھا۔ مگر ہندوستان میں انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی بات

خلاف تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا سبب یہی نہیں تھا کہ وہ تجویزوں کو قابل اعتراض سمجھتے تھے بلکہ اس سے زیادہ موثر وجہ جنگ سے نفرت تھی۔ در اصل ایسی ہر بات سے جو ہندوستان کو جنگ میں الجھا دیتی انہیں خلقی اور اٹل عداوت تھی، اور (کرپس کی) تجویز کی خوبی اور خامی پر انہوں نے جو رائے قائم کی وہ اس عداوت سے متاثر تھی۔ اور یہ کیا، ہر تجویز چاہے وہ ہندوستان کے لئے کتنی ہی مفید ہوتی، ان کی طبیعت کے خلاف پڑتی تھی اگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستان جنگ میں شریک ہو ان کو تجویز کا آخری حصہ بھی پسند نہیں تھا جس کے مطابق جنگ کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کو فرقہ واری مسئلے کو طے کرنے کا موقع دیا جاتا۔

اس مشن کے دوران میں جب گاندھی جی پہلی مرتبہ کرپس سے ملے تو کرپس نے انہیں اپنی یادداشت کے بارے میں یاد دلایا جس کا ذکر آچکا ہے۔ کرپس نے کہا کہ یادداشت کانگریسی لیڈروں اور خود گاندھی جی سے مشورہ کرنے کے بعد مرتب کی گئی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دوران جنگ میں ایکزیکیوٹو کاؤنسل کے ممبر سب ہندوستانی ہونگے اور جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردیا جائے گا۔ اس وقت جو تجویزیں وہ پیش کر رہے ہیں در اصل وہی ہیں جو یادداشت میں تھیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ انہیں یادداشت کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا یاد ہے کہ جب پچھلی مرتبہ

واضح طور پر معاہدے کی شرطوں میں شامل کیا جائے۔ اسی نیت سے میں نے یکم اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو کرپس سے دوبارہ ملاقات کی۔

یہ ملاقات فیصلہ کن تھی۔ ہم کوئی تین گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ پہلی ملاقات کے بعد سے اس وقت تک سر سٹیفرڈ کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی ہوگئی ہے۔ اب وہ جو جواب دے رہے تھے ان کی کیفیت پہلی ملاقاتوں کے جوابوں سے بالکل مختلف تھی۔ جب میں نے ان سے ایکزیکیوٹو کاؤنسل کی حیثیت کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا مجھے امید ہے کہ جنگ کے دوران میں بھی وہ ایک کابینہ کے طریقہ پر کام کرے گی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کاؤنسل تمام مسئلے کثرت رائے کے مطابق طے کرے گی اور اس کے فیصلے آخری فیصلے ہوا کریںگے؟ کرپس نے مبہم سا جواب دیا۔ وہ بالکل صاف یہ نہیں کہتے تھے کہ وائسرائے آخری فیصلہ کرے گا، لیکن جو کچھ وہ کہتے تھے اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ کاؤنسل کو فیصلے کرنے کی پوری اور غیر محدود آزادی نہ ہوگی۔ انھوں نے اس کا عذر یہ پیش کیا کہ وائسرائے کی اس وقت جو حیثیت ہے وہ قانون میں تبدیلی کئے بغیر نہیں بدلی جا سکتی۔ لیکن انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ قانون کے اعتبار سے صورت حال کچھ بھی ہو وائسرائے کا عمل ایک دستوری حکمران اعلیٰ کا سا ہوگا۔

میں نے سر سٹیفرڈ کو یاد دلایا کہ پہلی ملاقات کے وقت اس

صاف صاف اور اصرار کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن میں ان کے دل کی بات کو جسے وہ زبان پر نہیں لا سکتے تھے اچھی طرح سمجھتا تھا اور مجموعی طور پر میں ان کا ہمدرد اور ہم خیال تھا۔

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبر جنگ کے بارے میں کوئی پختہ رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان کی نظریں رہنمائی کی تلاش میں گاندھی جی کی طرف اٹھتی تھیں۔ صرف راج گوپال آچاری ان میں شامل نہیں تھے۔ وہ پوری طرح سے کرپس کی تجویزوں کو منظور کرنے کے حامی تھے، مگر ان کی رائے کا کچھ وزن نہیں تھا۔ یہ افسوس کی بات تھی کہ کانگریس کے حلقوں میں سمجھا جاتا تھا کہ ان میں اور کسی موڈریٹ میں تمیز کرنا مشکل ہے

ورکنگ کمیٹی نے تجویزوں پر دو دن تک بحث کی مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ سر سٹیفرڈ سے کئی مسئلوں کی وضاحت کرانے اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی سوال یہ تھا کہ ایگزیکیوٹو کاؤنسل کے اختیارات کیا ہوں گے؟ سر سٹیفرڈ نے تجویز کیا تھا کہ کاؤنسل کو قائم رکھا جائے، لیکن اسے اس طرح مرتب کیا جائے کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے منتخب کئے ہوئے لوگ اس کے ممبر ہوں۔ انھوں نے زبانی مجھے یقین دلایا تھا کہ وائسرائے کی حیثیت ایک دستوری حکمراں اعلیٰ کی سی ہوگی۔ ورکنگ کمیٹی نے خواہش ظاہر کی کہ بات کو

اور ہندوستان کو اس کا موقع ہوگا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دوست کی حیثیت سے مجھے وہ مشورہ دینگے کہ ہم نئے سوالات کرکے نئی دشواریاں پیدا نہ کریں۔ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ ان کی تجویزوں کی ظاہری قدر کا لحاظ کرکے انہیں قبول کرلیں اور آگے بڑھیں۔ ان کے اپنے دل میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر جنگ کے دوران میں ہندوستان نے برطانیہ کے ساتھ پورا تعاون کیا تو جنگ کے بعد اس کی آزادی یقینی ہے۔

ہندوستان میں اور کسی قدر دوسرے ملکوں میں بھی اس بارے میں بہت خیال آرائیاں ہوئی ہیں کہ پہلی اور دوسری ملاقات کے درمیان سر سٹیفرڈ کرپس نے اپنی پوزیشن کیوں بدل دی اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ سر سٹیفرڈ کو امید تھی کہ اپنی دل نشیں باتوں اور خوشگوار انداز سے کانگریس کو راضی کرلینگے چاہے بنیادی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ اُنھوں نے شروع میں قطعیت کے ساتھ بعض باتوں کا یقین دلایا تھا تاکہ پہلا اثر اچھا پڑے۔ مگر جب ان کی تجویزوں کی تفصیلی جانچ اور خود ان سے جرح کی گئی تو اُنہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ احتیاط سے کام لیں اور ایسی اُمیدیں نہ دلائیں جنھیں پورا کرنا ان کے بس میں نہ ہو۔ ایک اور سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ پہلی اور دوسری ملاقات کے درمیان جو وقفہ ہوا اس میں حکومت ہند کے افسران اعلیٰ ان پر اپنا اثر ڈالنے لگے۔ وائسرائے اور اس سے متعلق لوگ ہر وقت انہیں گھیرے رہتے تھے، اور شاید یہ لازمی بھی تھا

معاملے میں ان کی رائے زیادہ واضح اور قطعی تھی وہ مجھ سے بحث کرتے رہے اور یقین دلاتے رہے کہ انہوں نے بنیادی طور پر اپنا رویہ نہیں بدلا ہے. اس وقت وہ جس مفہوم کو بیان کرنا چاہتے تھے وہ وہی تھا جسے وہ اس وقت بیان کر رہے ہیں میں نے انہیں یاد دلایا کہ میرے سوال کے جواب میں انہوں نے قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ ایکزیکیوٹو کاؤنسل کا طریق کار بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا کہ کابینہ کا. مگر آج وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ قانونی صورت حال میں تبدیلی نہ ہوگی. اور وہ یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنا چاہتے تھے کہ انہیں امید ہے کہ کاؤنسل ایک کابینہ کی طرح کام کریگی. میں نے پہلی ملاقات سے جو اثر لیا تھا وہ کچھ اور تھا. میں نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ انڈیا آفس اور وزیر ہند کے بارے میں ہماری کیا گفتگو ہوئی تھی اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ وزیر ہند کا طریق کار وہی ہوگا جو کامن ولتھ کے وزیر کا ہوتا ہے لیکن اب وہ کہہ رہے تھے کہ انڈیا آفس یا وزیر ہند کی حیثیت بدلنے کے لئے پارلیمنٹ کے ایک نئے قانون کی ضرورت ہوگی. کرپس نے کہا کہ ان کا خیال یہ ہے کہ عملاً انڈیا آفس کے طریقِ کار کی بنیاد نئی ہوگی. لیکن ایسا قانون بنانے میں دشواریاں ہیں جو وزیر ہند کی حیثیت کو بدل کر اُسے کامن ولتھ کے وزیر کی سی کردے.

اس کے بعد میں نے اختتام جنگ پر ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کا مسئلہ اٹھایا. کرپس نے کہا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے مسئلے پر ایک نئے زاویہ سے غور کیا جائے گا

انھوں نے پہلی ملاقات میں اشارہ کیا تھا وہ قائم ہوجائیں گی لیکن ظاہر ہے وہ اس کی باضابطہ ذمہ داری نہیں لے سکتے تھے اور جب ہم نے مطالبہ کیا کہ ہمیں اس کا باضابطہ طور پر یقین دلایا جائے تو انہیں اس پوزیشن سے ہٹنا پڑا جسے انھوں نے پہلے اختیار کیا تھا

اس طرح جب ورکنگ کمیٹی کا ۲ اپریل کو دوبارہ جلسہ ہوا کہ سر سٹیفرڈ کرپس سے میری دوسری ملاقات کے نتیجے پر غور کیا جائے تو میں نے حالات کی بالکل ہی نئی تصویر پیش کی۔ میں نے مندرجہ ذیل طریقے پر مسائل زیر بحث کا خلاصہ بیان کیا۔

۱ ۔ مجھے یہ صاف نظر آرہا تھا کہ جنگ کے دوران میں برطانوی حکومت ہندوستان کو اختیارات منتقل کرنے پر تیار نہیں ہے۔ انگریز محسوس کر رہے تھے کہ اس میں بہت بڑا خطرہ ہے، اور وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

۲ ۔ جنگ کے حالات اور خاص طور سے امریکہ کے دباؤ نے انگریزوں کے رویہ میں کسی قدر تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اب چرچل کی حکومت بھی محسوس کر رہی تھی کہ ہندوستان کو اپنی مرضی سے جنگ میں اشتراک عمل کا موقع ملنا چاہئے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خالص ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ایگزیکیوٹو کاؤنسل بنانے اور اس کے اختیارات میں کچھ اضافہ کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ مگر قانونی اعتبار سے کاؤنسل کی حیثیت ایک کابینہ کی سی نہ ہو جاتی، بلکہ وہ کاؤنسل ہی رہتی۔

کہ ان کے خیالات کسی نہ کسی حد تک اسی رنگ میں رنگ جائیں۔ تیسرا امکانی سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقفہ میں دہلی اور لندن کے درمیان تبادلہ خیال ہوا تھا، اور برطانوی وزارت نے ایسی تازہ ہدایات بھیجی تھیں جن سے سر سٹیفرڈ کو محسوس ہوا کہ اگر انھوں نے بہت زیادہ دینے کا وعدہ کرلیا تو ساری کارروائی مسترد کردی جائیگی۔

اصل سبب کیا تھا یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کا صورت حال کو بدلنے میں کچھ نہ کچھ دخل ہو۔ کرپس اصل میں وکیل تھے اور ان کا میلان اس طرف تھا کہ واقعات کو ایسی امید افزا شکل میں پیش کریں جو حقیقت حال کو دیکھتے ہوئے مبالغہ آمیز ہو۔ ان کا میلان اس طرف بھی تھا کہ واقعات کو اپنے شخصی نقطۂ نظر سے دیکھیں، اور اپنے مدمقابل پر اثر ڈالنے کے لئے صورت حال کے بیان کو زیادہ سے زیادہ اپنے مفید مطلب بنائیں۔ جب بعد میں ہم نے انھیں ان کے قول کا پابند کرنا چاہا تو وہ مجبوراً پیچھے ہٹنے لگے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ماسکو میں بھی انھوں نے اسی طرح کبھی کبھی ایسی باتیں کیں جن کا انھیں مجاز نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی ایسی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے جس سے ان پر اتنا الزام نہ آئے۔ وہ انگریز تھے، اور انگریز تحریری معاہدوں سے زیادہ عمل اور رسم پر زور دیتے ہیں۔ غالباً وہ خلوص کے ساتھ سمجھتے تھے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تجویزیں مان لی جائینگی، تو جن دستوری رسموں کی طرف

اس وقت بہ صراحت کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا پہلی ملاقات کے وقت بھی کرپس نے اسی انداز میں گفتگو کی تھی، مگر جیسے جیسے گفت و شنید کا سلسلہ بڑھتا گیا اعتماد اور امید کی کیفیت مٹتی گئی۔

کیفیت اور فضا کی تبدیلی کے اور اسباب بھی ہوئے میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب سر سٹیفرڈ ہندوستان آئے تھے تو انہوں نے وائسرائے سے کئی سیاسی لیڈروں کو گفتگو کے لئے بلانے کو کہا ان میں سے ایک مرحوم مسٹر اللہ بخش بھی تھے ہندوستان میں کچھ وقت گزارنے کے بعد معلوم ہوا کہ غالباً وائسریگل لاج کے اثر کی وجہ سے کرپس نے اپنا نقطۂ نظر بدل دیا ہے وائسرائے کی دعوت بھیجنے پر اللہ بخش دہلی آئے تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے کہ سر سٹیفرڈ سے ملاقات کے لئے وقت مقرر ہو، مگر وقت مقرر نہیں کیا گیا یہ بات بے تکی سی معلوم ہونے لگی، اس لئے میں نے کرپس سے اس کا ذکر کیا اور انہوں نے کہا کہ اللہ بخش سے جلد ملاقات کریں گے اس کے وعدہ کے بعد بھی کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا۔ اس پر اللہ بخش کو غصہ آگیا اور انہوں نے کہا کہ اب وہ دہلی میں زیادہ نہیں ٹھہریںگے۔ جب میں نے یہ سنا تو میں نے سر سٹیفرڈ سے صاف صاف بات کی اور کہا کہ ان کے اس رویے سے صرف اللہ بخش کی توہین نہیں ہوئی ہے بلکہ مسلمانوں کی اس جماعت کی بھی جس کے وہ نمائندے ہیں۔ اگر حکومت کو اس میں شک تھا کہ انہیں

۳ - یہ ممکن تھا کہ عملاً وائسرائے قانون کو برتنے میں رعایت سے کام لیتا، اور معمولاً کاؤنسل کے فیصلوں کو منظور کر لیتا. لیکن کاؤنسل اس کے ماتحت ہی رہتی اور آخری فیصلہ کرنے کی ذمہ‌داری خود اس پر رہتی، کاؤنسل پر نہ رہتی.

٤ - اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ ورکنگ کمیٹی نے جو بنیادی سوال کیا تھا کہ آخری فیصلہ کرنے کا اختیار کس کو ہوگا، اس کا جواب یہ تھا کہ یہ اختیار وائسرائے کو حاصل ہوگا.

٥ - مستقبل کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ برطانوی حکومت، کرپس کے بیان کے مطابق ہندوستان کے مسئلے پر ایک نئے زاویہ سے غور کرسکتی ہے، مگر یہ بات ہرگز یقینی نہیں تھی کہ لڑائی بند ہوتے ہی ہندوستان آزاد ہوجائے گا

٦ - ظاہر ہے اس کا قوی امکان تھا کہ جنگ کے بعد مسٹرچرچل کی کنزرویٹو وزارت کی جگہ کوئی نئی وزارت آجائے گی یہ ممکن تھا کہ نئی وزارت ہندوستان کے مسئلے پرزیادہ سمجھ اور ہمدردی کے ساتھ غور کرے، مگر یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ اس امکانی صورت کو (کرپس کی) تجویز میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا

۷ - اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اگر کانگریس نے کرپس کی پیش‌کش کو منظور کرلیا تو اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کسی بات کا صاف صاف یقین دلایا گیا ہے.

ہم نے ان مسائل پر اس اعلان کی روشنی میں بحث کی جو کرپس مشن کے بھیجنے کے موقعے پر بی. بی. سی. نے کیا تھا

اخبار استعمال کرنے پر بڑی حیرت ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مختلف خیال کے ہندوستانی اخباروں میں اس بنیاد پر امتیاز کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی صرف قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے ان کی تجویزوں پر غور کرے گی اور فیصلہ کرتے ہوئے مختلف خیالات رکھنے والے گروہوں اور جماعتوں کا لحاظ رکھے گی۔

میں ۲۹ مارچ سے ۱۱ اپریل تک لمبے اجلاس میں تقریباً صبح سے شام تک ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ رہتا تھا ۲ اپریل کے بعد سے قریب قریب ہر شام کو میری کرپس سے ملاقات ہوتی تھی، ان ملاقاتوں کے وقت جواہر لال بھی موجود رہتے تھے مجھے جیسے ہی اطلاع ملی کہ کرپس آنے والے ہیں، میں نے ورکنگ کمیٹی کے ارکان کے نام ایک گشتی مراسلہ بھیجا کہ ان سے کسی ممبر کو الگ ملاقات نہ کرنا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسی متفرق ملاقاتوں سے غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں اس کے علاوہ میں نے خط میں لکھا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کا کوئی ممبر کسی خاص مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے یا پرانے تعلقات کی خاطر کرپس سے ملنا چاہتا ہو تو ملنے سے پہلے وہ مجھے اپنے ارادے کی اطلاع کردے۔

کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ اس سے پہلے جب وہ ہندوستان آئے تھے تو ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ممبروں سے ملے تھے، مگر اس مرتبہ انہیں معلوم ہوا کہ میں نے پابندی لگادی

بلانا مناسب ہوگا یا نہ ہوگا تو انھیں ملاقات کی دعوت نہیں دینا چاہئیے تھا۔ لیکن چونکہ ان کے نام دعوت نامہ جا چکا تھا، اس لئے اب ان سے باقاعدہ ملاقات بھی کرنا چاہئیے۔ میری مداخلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن سر سٹیفرڈ اور الہ بخش کی ملاقات ہوگئی۔ مگر گفتگو صرف ایک گھنٹے کے لئے اور عام مسائل پر ہوئی اس واقعے سے مجھے بہت ناگواری ہوئی، مجھے محسوس ہوا کہ مشکل سیاسی مسئلوں کو طے کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے، کرپس کا طرزعمل ایک مدبّر کا سا نہیں تھا۔

ایک اور واقعہ نے بھی میری طبیعت کو مکدر کردیا جیسے ہی برطانوی کابینہ کی تجویزیں تحریری شکل میں شائع کی گئیں، ہندوستان کے اخباروں نے اعتراضات کی بھرمار کردی، اور ان میں وہ اخبارات پیش پیش تھے جن میں عام طور پر کانگریس کا نقطۂ نظر بیان کیا جاتا تھا کرپس نے مجھے اسی زمانے میں جب کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا، ایک خط میں لکھا کہ انہیں امید ہے میں تجویز پر فراخدلی سے غور کرونگا، اگرچہ «ہندو» اخباروں نے اس پیشکش پر خوشی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ مجھے ہندو اخباروں کی طرف یہ اشارہ بہت برا لگا۔ کچھ یہ خیال بھی ہوا کہ انھوں نے اخباروں کو «ہندو» اس لئے کہا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر انہیں تبصرے پسند نہیں آئے تھے تو وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی اخباروں یا ایک خاص خیال رکھنے والے اخباروں کی طرف اشارہ کرسکتے تھے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ مجھے ان کے لفظ «ہندو»

اس لئے کہ اپنی جمہوری ریاستوں سے لگاؤ تھا مارشل چیانگ کائی شک نے ہندوستانیوں سے جو اپیل کی تھی اس کا بھی ان پر اثر تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ تجویزوں کو منظور کرا لیا چاہئے اگر اس سے کسی طرح کانگریس پر اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کا الزام نہ آئے جہاں تک میرا تعلق تھا، میرے پاس تجویزوں کو پرکھنے کے لئے بس ایک کسوٹی تھی، اور وہ یہ کہ برطانوی حکومت کی تجویز ہندوستان کی آزادی کا پیش خیمہ ہوگی یا نہیں؟ اگر وہ ہوگی تو ہمیں بعض محفوظات دینے کے باوجود اسے مان لینا چاہئے، ورنہ اسے قطعاً نامنظور کر دینا چاہئے میرا واحد معیار ہندوستان کی آزادی تھا

میں گفتگو کے دوران میں برابر کوشش کرتا رہا کہ کرپس کی پیش کش کو ایسی شکل دی جائے جو اسے ہمارے لئے قابل قبول بنا دے میں ایسی دستوری رسم قائم کرانا چاہتا تھا جس کے مطابق وائسرائے کی کونسل عملاً ایک کابینہ کی حیثیت سے کام کرتی اور وائسرائے دستوری حکمراں اعلیٰ ہوجاتا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس ایک مسئلے کے بارے میں ہمیں اطمینان ہوجائے تو ہمیں پیش کش کو منظور کرلینا چاہئے اور جنگ کے دوران میں قانون کے ذریعے اختیارات منتقل کئے جانے پر اصرار نہ کرنا چاہئے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کرچکا ہوں، اس گفتگو نے دو ہفتے تک طول کھینچا۔ دن میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا، شام کو میں کرپس سے ملتا، اور اپنی گفتگو کے بارے میں

ہے اور ہر ایک ان سے ملاقات کرنے سے گریز کرتا ہے
اگر کسی محفل میں ان سے مڈ بھیڑ ہوجاتی ہے تب بھی کوئی کسی
معاملے میں رائے نہیں دیتا، اس خیال سے کہ کانگریس کے صدر
کو اس پر اعتراض ہوسکتا ہے۔

میں نے کرپس سے کہا کہ جب کوئی ذمہ دار جماعت حکومت
سے گفتگو کرے تو یہ صرف اس کے مامور کردہ نمائندوں کے
ذریعہ ہونی چاہئے۔ ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ گفتگو
کانگریس کا صدر کرے گا، اس لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ ورکنگ
کمیٹی کے دوسرے ممبر اپنے طور پر گفتگو کریں لیکن اگر
وہ ورکنگ کمیٹی کے کسی ممبر سے کسی وجہ سے بھی ملنا چاہتے
ہوں تو میں خوشی سے اس کا انتظام کردونگا

کرپس نے کہا کہ انھیں بھولا بھائی دیسائی سے ملنے کی بہت
خواہش ہے۔ جب وہ پچھلی دفعہ ہندوستان آئے تھے تو بھولا بھائی
کے یہاں ٹھہرے تھے انھوں نے کھادی کے اس سوٹ کی طرف
جو اس وقت وہ پہنے تھے اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا کہ یہ
کپڑے بھی جو میں پہنے ہوں یہ بھی بھولا بھائی دیسائی کا عطیہ ہے

میں نے بھولا بھائی دیسائی سے کہا کہ وہ سرسٹیفورڈ سے
ملیں اور انھوں نے ان سے ملاقات کی۔ کرپس کی تجویز پر
ورکنگ کمیٹی میں بحث جاری رہی۔ گاندھی جی اسے منظور کرنے
کے خلاف، جواہر لال اس کے موافق تھے۔ مجھے دونوں سے
اختلاف تھا۔ گاندھی جی جنگ کے مخالف تھے، اس لئے وہ
تجویز کے خلاف تھے۔ جواہر لال اسے منظور کرنا چاہتے تھے

خوشی سے راضی ہوگیا تو انہوں نے وقت مقرر کرا دیا .
وہ خود جواہرلال کو اور مجھے ویول کے پاس لے گئے ہمارا رسمی تعارف کرانے کے بعد وہ چلے گئے اور ہم ویول کے ساتھ ایک گھنٹے سے زیادہ باتیں کرتے رہے ، مگر ان سے کوئی ایسا نتیجہ نہ نکلا جسے ہمارے بنیادی سوال کا جواب کہا جا سکتا . اس موقع پر ویول نے سپاہی کے بجائے سیاست داں کے انداز سے گفتگو کی ، اور اصرار کرتے رہے کہ جنگ کے زمانے میں فوجی مصلحتوں کو اور تمام معاملوں پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے میں نے اس سے انکار نہیں کیا ، مگر ساتھ ہی یہ کہا کہ ہمیں اس مسئلے سے خاص مطلب ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں کس کا اختیار کارفرما ہوگا ویول اس مسئلے پر کوئی روشنی نہ ڈال سکے

ہمارے اصرار کی وجہ سے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ جنگ سے متعلق تمام معاملات ایکزیکیوٹو کاؤنسل کے ایک ممبر کے سپرد ہوں گے . کرپس نے ہم کو باور کرانا چاہا کہ اس طرح جنگ کی پالیسی اور انتظام میں ہندوستان کی شرکت یقینی ہو جائے گی ، پھر بھی وہ ہمیں سمجھا نہ سکے کہ ہندوستانی ممبر اور کمانڈرانچیف کا تعلق کیا ہوگا . انہوں نے ویول سے میری ملاقات اسی مسئلے پر بحث کرنے کی غرض سے کرائی تھی ، لیکن میں نے جب ویول سے پوچھا کہ کاؤنسل کے ہندوستانی ممبر کا منصب وہی ہو گا جو کہ ایک ذمہ دار رکن کابینہ کا ، تو وہ کوئی صاف جواب نہ دے سکے . ان سے گفتگو کرکے میں نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ

دوسرے دن ورکنگ کمیٹی میں رپورٹ پیش کرنا. ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے وقت کرپس وائسرائے سے تبادلہ خیال کرتے رہے. بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ اس مدت میں کرپس نے تین مرتبہ جرنیل سے مشورہ کیا ممکن ہے انہوں نے کابینہ کے دوسرے ارکان سے بھی مشورہ کیا ہو.

کرپس برابر اصرار کرتے رہے کہ جنگ کے دوران میں جنگ کے انتظامی لوازمات ہی کو مدنظر رکھ کر فیصلہ ہو جانا چاہئے. جنگ اب ایک منزل پر پہنچ گئی تھی جہاں اور کچھ نہیں تو اس کے جغرافیائی مقام کی بدولت ہندوستان پر بہت بھاری ذمہ داری آجاتی تھی اس لئے یہ ضروری تھا کہ ایکزیکیوٹو کاؤنسل کی رائے طلب کی جائے، اور خود برطانوی کابینہ کو ہندوستان کی ایکزیکیوٹو کاؤنسل کا سہارا لینا پڑے گا ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ایسی حالت میں کاؤنسل کے قانونی اختیارات میں اضافہ کرنے یا اس بات کو واضح طور پر تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آخری فیصلہ کرنے کا اختیار کاؤنسل کو ہوگا حالات کی رو اُن ہندوستانی لیڈروں پر جو کاؤنسل کے ممبر ہوں گے، زور اور ذمہ داریاں ڈالتی رہے گی لارڈ ویول اس زمانے میں ہندوستان کے کمانڈرانچیف تھے. کرپس کی اُن سے کئی بار گفتگو ہوئی اور انہوں نے تجویز کیا کہ میں بھی اُن سے ملوں، اس خیال سے کہ اگر میں اُن سے ملا اور انہوں نے مجھے جنگ کی صورت حال سمجھائی تو اس کا میرے اوپر اچھا اثر پڑے گا اسی بنا پر انہوں نے مجھے لکھا کہ ویول سے ملاقات کروں، اور جب میں

گیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ بڑی رکاوٹ تھا. گاندھی جی اس
سے اور اس کے علاوہ فرقہ واری مسئلے کے اس حل سے جو
کرپس نے پیش کیا تھا بہت پریشان اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے
تھے کرپس سے پہلی ملاقات کے بعد جب میں ان سے ملا تو
مجھے فوراً محسوس ہوا کہ گاندھی جی کرپس کی پیش کش کو
قطعاً ناقابل قبول سمجھتے ہیں ، اس بنا پر اس سے ہماری دشواریاں
بڑھ جائیں گی اور فرقہ واری مسئلے کا تصفیہ ناممکن ہو جائے گا.
میں نے اس خاص نکتہ پر اور ان نتیجوں پر جو اس سے
نکلتے تھے کرپس کے ساتھ مفصل سے گفتگو کی اور ان کی
اور برطانوی کابینہ کی نظر میں جو کچھ تھا اسے صاف صاف
بیان کرنے کو کہا کرپس نے مجھے یقین دلانا چاہا کہ ہندوستان
(کی آزادی) کا سیاسی مسئلہ اس وقت تک طے نہ ہو سکے گا
جب تک کہ فرقہ واری مسئلے کو حل نہ کر لیا جائے. اس کے
لئے دو طریقوں میں سے ایک اختیار کیا جا سکتا ہے. یا تو
اسے فوراً حل کیا جائے ، یا اس کے فیصلے کو جنگ کے بعد
تک کے لئے ملتوی کیا جائے ، جب اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھ
میں ہوگا. کرپس نے کہا کہ ان کی رائے میں اس مسئلے کو
اس وقت اٹھانا غلط ہوگا ، کیونکہ اس سے ہماری دشواریاں اور
بڑھ جائیں گی قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ جنگ کے
خاتمے کا انتظار کیا جائے پھر انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ
اگر ہندو اور مسلمان کسی سمجھوتے پر متفق ہو جائیں تو یہ
معاملہ اب بھی طے ہو سکتا ہے.

تھا کہ ہندوستانی عمر پر ذمہ داریاں تو ہوں گی مگر اسے اختیارات حاصل نہ ہوں گے اس کے سپرد فوجی کینٹینوں، کمسیریٹ اور ٹرمپس پورٹ سے متعلق امور ہوں گے، برّی، بحری اور ہوائی فوجوں کے معاملوں میں اسے بولنے کا حق نہ ہو گا۔

مختصراً صورت حال یہ تھی کرپس کی تجویز میں اس بات پر اصرار کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی خودمختاری تسلیم کرلی جائے گی، لیکن جنگ کے دوران میں صرف اس قدر تبدیلی ہوگی کہ ایگزیکیوٹو کاؤنسل بالکل ہندوستانی ہو جائے گی اور مختلف پارٹیوں کے سیاسی لیڈروں پر مشتمل ہوگی فرقہ واری مسئلے کے بارے میں کرپس نے بس اتنا کہا کہ جنگ کے بعد صوبوں کو یہ طے کرنے کا حق ہوگا کہ وہ یونین میں شامل ہوں یا نہ ہوں

میں نے کرپس کی اس بنیادی تجویز پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ ہندوستان کو جنگ کہ بعد خود مختار تسلیم کیا جائے گا لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر عملاً اختیار اور ذمہ‌داری کو جنگ کے دوران میں منتقل نہ کیا گیا تو جو تبدیلی تجویز کی جا رہی تھی اس کے کچھ معنی نہ ہوں گے پہلی ملاقات میں کرپس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کاؤنسل ایک کابینہ کے طریقے پر کام کرے گی، مگر گفت و شنید کے دوران میں پتہ چل گیا کہ یہ ایک شاعرانہ مبالغہ تھا۔ اور دراصل ان کی تجویز کچھ اور تھی۔

صوبوں کو یونین میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا جو اختیار دیا

تجویز فرقہ واری مسئلے کا بہترین حل ہے ، اور انہیں یقین ہے کہ اگر علیحدگی کے مسئلے پر پنجاب اسمبلی میں ووٹ لئے گئے تو فرقہ واری مصلحت کو نہیں بلکہ قومی مصلحت کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرے گی میں نے جواب دیا کہ میں یہ مان لونگا کہ اگر اسی وقت ووٹ لیا گیا تو غالباً ان کا اندازہ صحیح ثابت ہوگا، مگر یہ بتانا کہ جنگ کے بعد کیا ہوگا ان کے اور میرے بس کی بات نہیں ہے ، اور میں یہ بھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ جنگ کے بعد ان کا اتنا ہی اثر ہوگا جتنا کہ اس وقت ہے ۔

ہندوستانی ریاستوں کے متعلق کرپس کی تجویز یہ تھی کہ ان کے نمائندوں کو اپنی اپنی ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہوگی اس میں صوبوں کی طرح وفاق سے الگ رہنے کا اختیار شامل تھا انصاف کی خاطر مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ریاستوں کے نمائندوں سے گفتگو کرتے وقت کرپس نے صاف اور سیدھی بات کہی ۔ مہاراجہ کشمیر سے انہوں نے کہا کہ ریاستوں کا مستقبل ہندوستان سے وابستہ ہے ۔ کسی ریاست کے حکمراں کو اس مغالطہ میں نہ پڑنا چاہئے کہ اگر اس نے وفاق سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا تو برطانیہ کا بادشاہ اس کی مدد کو پہنچ جائے گا ۔ ان حکمرانوں کو مستقبل کے بارے میں یکسوئی حاصل کرنے کے لئے برطانیہ کے بادشاہ کی طرف نہیں بلکہ حکومت ہند کی طرف رجوع کرنا چاہئیے ۔ مجھے یاد ہے کہ کرپس سے ملاقات کے بعد ریاستوں کے بیشتر نمائندے شکست خوردہ اور شرمندہ معلوم ہو رہے تھے ۔

میں نے کرپس سے کہا کہ صوبوں کو وفاق سے الگ رہنے کا حق دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک کو تقسیم کرنے کی راہ نکالی جاری ہے. کرپس نے اپنی مدافعت کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ یہ حق کسی خاص مذہبی جماعت کو نہیں بلکہ صوبے کو مجموعی طور پر دیا جائیگا، اور انہیں پوری امید ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ صوبوں کو وفاق سے الگ رہنے کا حق ہے تو کوئی صوبہ اس سے فائدہ نہ اٹھانا چاہیگا، اور اگر یہ حق نہ دیا گیا تو اس سے بدگمانیاں پیدا ہونگی. صوبے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے اسی وقت غور کرینگے جب انہیں احساس ہوگا کہ انہیں فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہو گی.

ایک مرتبہ جب ہم صبح کو اس مسئلے پر بحث کرچکے تھے کرپس نے مجھے شام کے وقت ٹیلیفون کیا کہ اگلے دن سر سکندر حیات خاں ان سے ملنے آرہے ہیں. انہیں امید تھی کہ سر سکندر فرقہ واری مسئلے کو حل کرنے میں مفید ثابت ہوں گے، اس لئے کہ پنجاب ایسا صوبہ تھا جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی. اور اگر پنجاب نے ہندوستان میں شامل رہنے کا فیصلہ کرلیا تو مسلم اکثریت رکھنے والے دوسرے صوبےاس کی تقلید کرینگے. میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس کا یقین نہیں ہے کہ سر سکندر اس مسئلے کو طے کرسکیں گے، مگر چونکہ وہ دہلی آرہے ہیں تو میں ان سے خوشی سے ملونگا

دوسرے دن سر سکندر دہلی آئے اور کرپس سے ملاقات کرنے کے بعد وہ مجھ سے ملے. ان کا خیال تھا کہ کرپس کی

چنانچہ ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو میں نے کرپس کو لکھا کہ مسودۂ اعلان میں ہندوستان کے مسائل کے بارے میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے وہ نہ صرف خود غلط ہے بلکہ اس سے مستقبل میں اور بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ انہوں نے ۱۱ اپریل کو اس کے جواب میں ثابت کرنا چاہا کہ ان کی تجویزوں سے بہتر ہندوستان کے مسئلے کا اور کوئی حل ممکن نہیں ہے، اور اصرار کے ساتھ کہا کہ انہوں نے گفتگو کی کسی منزل پر اپنی رائے نہیں بدلی ہے انہوں نے (گفتگو کی ناکامیابی کا) الزام کانگریس پر لگانے کی کوشش کی، اور کہا کہ وہ خط کو شائع کرنا چاہتے ہیں میں نے اسی دن جواب دیا اور ان کے دعووں کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ ہمارے خطوط کو پڑھ کر ہر غیر جانب دار شاہد کو یقین ہو جائے گا کہ ان کے مشن کی ناکامیابی میں قصور ان کا ہے، کانگریس کا نہیں ہے میرے دونوں خطوں میں جو اہم باتیں تھیں وہ میں نیچے درج کر رہا ہوں، لیکن جن پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو وہ پوری خط و کتابت کو ضمیمہ میں دیکھ سکتے ہیں

میں نے اپنے ۱۰ اور ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کے خطوں میں سر سٹیفرڈ کو جو کچھ لکھا وہ مختصراً یہ ہے مسودۂ اعلان میں موجودہ حالات کی بہ نسبت مستقبل پر زیادہ زور دیا گیا تھا، حالانکہ ہندوستان موجودہ نظام میں تبدیلی کا مطالبہ کر رہا تھا مستقبل کے بارے میں جو تجویزیں تھیں ان میں سے بعض پر اعتراض ہونے کے باوجود قومی تحفظ کی خاطر کانگریس حکومت کے سمجھوتا کرنے پر تیار تھی، لیکن جوش اور حملہ آور کا

ورکنگ کمیٹی کرپس کی پیش کردہ تجویزوں کے بارے میں ایک رزولیوشن کا مسودہ منظور کر چکی تھی یہ ان کے پاس ۲ اپریل کو بھیج دیا گیا تھا، لیکن جب تک کہ گفتگو کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا یہ اخباروں کو اشاعت کے لئے نہیں بھیجا گیا. ہندوستان کو اختیارات منتقل کرنے کے مسئلے کے علاوہ ایک بڑا اختلاف کمانڈر انچیف اور اکزیکیوٹو کاؤنسل کے اس ہندوستانی ممبر کے دائرہ عمل کے بارے میں پیدا ہوگیا تھا، جو دفاع کا ذمہ دار ہوتا. کرپس کی تجویز تھی ہندستانی ممبر کے سپرد خاص طور پر پبلک سے تعلقات، فوجی خدمت سے سبکدوشی، جنگ کے بعد تعمیر نو کے کام اور فوجیوں کی آسائش اور تفریح کا انتظام ہو کانگریس کے نزدیک یہ اختیارات بالکل نا کافی تھے اور اس کے جواب میں اس نے یہ تجویز پیش کی کہ دفاع کے ذمہ دار ممبر کو تمام اختیارات حاصل ہوں سوائے اس کے کہ کمانڈر انچیف کو جنگ کی تدابیر و انتظامات کے لئے تفویض کئے گئے ہوں. کرپس نے اس جواب میں چند تجویزیں اور پیش کیں، لیکن چونکہ وہ تمام اہم فرائض کمانڈر انچیف کے سپرد کرنا چاہتے تھے اس لئے یہ بھی ناقابل قبول ثابت ہوئیں.

میری کرپس سے ایک اور ملاقات ۹ اپریل کو شام کے قریب ہوئی اور میں نے ۱۰ اپریل کی صبح کو گفتگو کا نتیجہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے بیان کیا ہم نے افسوس کے ساتھ یہ طے کیا کہ ہم برطانوی حکومت کی تجویزوں کو ان کی موجودہ شکل میں منظور نہیں کرسکتے.

پورا اعتماد ہے کہ جیسے ہی قومی آزادی کا مسئلہ طے ہوجائے گا فرقہ واری اختلافات کو مناسب صورت سے دور کیا جاسکے گا۔

پھر میں نے لکھا کہ مجھے افسوس ہے کہ جیسے جیسے ہم نے اہم معاملوں پر گفتگو اور بحث کی، وہ تصویر جو ابتدائی ملاقاتوں میں میرے ذہن پر نقش ہوگئی تھی دھندلی پڑتی گئی، اور جب میں آخری بار ۹ اپریل کی رات کو ان سے ملا تو صورت حال کچھ اور تھی، اور مفاہمت کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی

چونکہ سر سٹیفرڈ نے لکھا تھا کہ وہ اپنے خط کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے میں نے اپنے جواب میں کہا کہ غالباً انہیں اس پر اعتراض نہ ہوگا اگر میں پوری خط و کتابت اور اس کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کا رزولیوشن شائع کردوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے، چنانچہ یہ سب ۱۱ اپریل کو اخباروں کو بھیج دئے گئے۔

رزولیوشن کی عبارت یہ تھی۔

« ورکنگ کمیٹی نے پوری طرح سے اور خلوص کے ساتھ ان تجویزوں پر غور کیا ہے جو برطانوی کابینہ نے ہندوستان کے بارے میں مرتب کی ہیں اور ان کی اس وضاحت پر جو سر سٹیفرڈ کرپس نے انہیں پیش کرتے ہوئے کی ہے، یہ تجویزیں آخری گھڑی میں اور واقعات اور حالات سے مجبور ہوکر پیش کی گئی ہیں، اور ان پر غور کرتے وقت صرف اس کا لحاظ نہ رکھنا چاہئے کہ ان کا ہندوستان کی آزادی کے مطالبے سے تعلق ہے، بلکہ اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے جو جنگ نے پیدا کی

مقابلہ کرنے کے لئے جذباتی فضا پیدا کرنے کے واسطے ضروری تھا کہ حکومت قومی ہو. لوگوں کو احساس دلانے کی ضرورت تھی کہ وہ آزاد ہیں، تاکہ وہ اپنی اس آزادی اور اپنے ملک کا تحفظ کریں.

میں نے اپنے خطوں میں یہ بھی کہا کہ کانگریس جنگ کے فنی معاملات اور فوجی کارروائیوں میں دخل دینے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتی وہ اس کے لئے بھی تیار ہے کہ جنگ کے دوران میں ہندوستانی وزیر دفاع کے اختیارات کسی قدر محدود کر دئیے جائیں، لیکن ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے کہ ملک کی حفاظت وقت کا اہم ترین تقاضا ہے. یہ لازمی تھا کہ جنگ کے دوران میں نظام حکومت جنگ کی مصلحتوں کا پابند رہے، اور دفاع کے اختیارات کو وائسرائے یا کمانڈر انچیف کے لئے مخصوص کردینے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان ان اختیارات سے بھی محروم رہے گا جنہیں ظاہر منتقل کیا جا رہا تھا.

ایک اور بات جس پر میں نے بہت زور دیا یہ تھی کہ کانگریس فرقہ واری مسئلے کو حل کرنے کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے. ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہندوستانی سیاست کی گتھیوں کو سلجھاتے وقت کسی نہ کسی منزل پر فرقہ واری جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے اور انہیں نپٹانا ہوگا. میں نے سر سٹیفرڈ کو یقین دلایا کہ جیسے ہی ہندوستانی سیاست کے اصل مسئلے میں یکسوئی ہوجائے گی، ہم فرقہ واری اور دوسرے معاملوں کو قابل اطمینان طریقے پر طے کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیں گے. مجھے

میں حکڑ دیا گیا ہے، اور تحویز میں ایسی دفعات شامل کردی
گئی ہیں حس سے ہندوستاں میں ایک آراد اور متحد قوم کی
تشکیل اور ترقی اور ایک جمہوری ریاست کا قیام سخت خطرے
میں پڑ جائے گا. دستور ساز جماعت کی بھی جو ترکیب رکھی
گئی ہے اس سے قوم کا حقِ خود مختاری بے اثر ہو جاتا ہے
کیونکہ اس جماعت میں ایسے عناصر داخل کئے گئے ہیں جن
کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں ہے ہندوستانی قوم نے مجموعی
حیثیت سے صاف الفاظ میں کامل خود مختاری کا مطالبہ کیا ہے.
اور کانگریس نے بارہا اعلان کیا ہے کہ سوائے پورے ملک کی
خود مختاری کے کوئی اور حیثیت اس کے لئے قابل قبول نہ
ہو گی، اور اس کے بغیر موجودہ صورت حال کے لحاظ سے جو
ضرورتیں ہیں وہ انہیں پورا نہ کر سکے گی. کانگریس یہ مانتی ہے
کہ مستقبل میں ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری برطانوی
کابینہ کی تجویزوں سے نتیجے کے طور پر نکلتی ہوگی، لیکن اس
کے ساتھ ایسی شرطیں اور پابندیاں لگا دی گئی ہیں جن کی وجہ
سے حقیقی آزادی ایک سراب بن کر رہ جائے تو تعجب نہ ہوگا.
ہندوستانی ریاستوں کی نو کروڑ آبادی کو قطعاً نظرانداز کرنا،
اسے اس کے حکمرانوں کی ملکیت سمجھنا، جمہوریت اور
خودمختاری دونوں کی تردید کرنا ہے. ایک طرف دستور ساز جماعت
میں ہر ریاست کی نمائندگی آبادی کے لحاظ سے مقرر کی گئی
ہے، دوسری طرف اس آبادی کو اپنے نمائندے منتخب کرنے میں
کوئی دخل نہیں ہے، اور جب ایسے فیصلے کئے جا رہے ہوں گے

ہے ، ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان کا تعلق ان خطروں کا مقابلہ کرنے کی کارگر تدبیروں سے بھی ہے جن میں دنیا اس وقت گھری ہے اور جو ایک بلا کی طرح ہندوستان کے سامنے کھڑے ہیں

« ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء سے ، جب کہ لڑائی شروع ہوئی تھی ، کانگریس نے بار بار بیان کیا ہے کہ ہندوستانی قوم دنیا کی ترقی پسند قوموں کی صف میں کھڑی ہوکر ، جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں انہیں حل کرنے کی پوری ذمہ داری لے گی اور اپنے حصہ کا بوجھ اٹھائے گی ، اور اس نے خواہش کی ہے کہ اس کے لئے مناسب ماحول پیدا کیا جائے لیکن ہندوستان کی آزادی ایک لازمی شرط ہوگی، کیونکہ صرف یہ احساس کہ آزادی مل گئی ہے ، لاکھوں دلوں کو روشن کرنے والے چراغ جلا سکتا ہے اور لوگوں کو عمل کے لئے تیار کرسکتا ہے ۔ بحرالکاہل میں جنگ چھڑنے کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو پچھلا اجلاس ہوا ، اس میں کانگریس کی طرف سے بیان کیا گیا کہ ، صرف آزاد اور خود مختار ہندوستان ملک کی حفاظت کا قومی بنیاد پر انتظام کرسکتا ہے ، اور جنگ کے طوفانوں میں جو نئے اور بڑے مقاصد نظر آنے لگے ہیں انہیں حاصل کرنے میں مدد کرسکتا ہے ۔ ،

« برطانوی کابینہ کی تجویزیں دراصل اس دور کے متعلق ہیں جو جنگ ختم ہونے کے بعد شروع ہوگا ۔ کمیٹی یہ مانتی ہے کہ اصولی طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس غیر متعین مستقبل میں ہندوستانی قوم خود مختار ہو جائے گی ، مگر اسے افسوس ہے کہ یہ خود مختاری محدود کر دی گئی ہے اور اسے بند شوں

حالات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے جس سے ملک کے مختلف واحدوں کو ایک مشترک اور باہمی امداد پر مبنی زندگی کی تشکیل میں مدد ملے، اس اصول کو ماننے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ایسی تبدیلیاں نہ کی جائیں جس سے نئی دشواریاں پیدا ہوں اور علاقے کی آبادی کے دوسرے بڑے حصوں پر جبر کیا جائے۔ یونین کے اندر ہر علاقائی واحدہ کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری جو ایک مضبوط قومی ریاست کے قیام کے ساتھ ممکن ہے حاصل ہونا چاہئے۔ جو تجویز برطانوی کابینہ نے اس وقت کی ہے اس سے یونین کی بنیاد رکھتے وقت ہی علاحدگی اختیار کرنے کے خیال کو تقویت پہنچے گی اور ممکن ہے علاحدگی کی کوششیں بھی شروع ہو جائیں، اگرچہ یہی وہ موقع ہوگا جب کہ باہمی امداد اور رغبت و خیرخواہی کی انتہائی ضرورت ہوگی۔ غالباً یہ تجویز کسی فرقہ واری مطالبے کو پورا کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے، مگر اس سے اور نتیجے بھی نکلیں گے اور مختلف جماعتوں میں، جو سیاسی اعتبار سے قدامت پسند اور اصلاح و ترقی کے مخالف عناصر ہیں، انہیں فساد کرنے اور حقیقی اہمیت رکھنے والے ملکی مسائل سے پبلک کی توجہ ہٹانے کا موقع مل جائے گا۔

«ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں جو تجویز بھی پیش کی جائے وہ توجہ اور تحقیق کی مستحق ہے، مگر آج کل کے نازک حالات میں اصل اہمیت حال کی ہے، اور مستقبل کے بارے میں جو تجویزیں ہوں ان کی جانچ یہ دیکھ کر کی جائے گی کہ ان کا حال پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کمیٹی نے لازمی طور پر معاملہ

جن کا اس کی زندگی پر زبردست اثر پڑے گا تو بھی اس سے کسی موقع اور منزل پر مشورہ نہ کیا جائے گا. ایسی ریاستیں کئی طریقوں سے ہندوستانی آزادی کی نشو و نما میں رکاوٹیں بن سکتی ہیں. وہ ایسے بند علاقے ہو سکتی ہیں جن میں غیروں کا حکم چلے، جہاں، بیان کے مطابق، غیر ملکی فوجوں کے قدم جمائے رہنے کا خاصا امکان ہو، جو ریاست کے بسنے والوں اور ہندوستانی قوم دونوں کی آزادی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہی رہیں.

صوبوں کو وفاق سے الگ رہنے کا اختیار دیا ایک انوکھا اصول ہے جس کو پہلے ہی سے تسلیم کر لینے سے ہندوستان کی وحدت کے تصور کو سخت صدمہ پہنچا ہے یہ فتنہ کا بیج ہے جس سے صوبوں میں فساد پیدا ہوگا اور بڑھے گا، اور ممکن ہے اس کی وجہ سے ریاستوں کے ہندوستانی وفاق میں شامل ہونے میں اور رکاوٹیں اور دشواریاں رونما ہوں. ہندوستان کی آزادی اور وحدت کانگریس کا تاج اور طوق ہے. اس وحدت میں شکست کے آثار نمودار ہوں تو یہ سب کے لئے مضر ہوگا، اور اس کا خیال کرکے بیحد تکلیف ہوتی ہے، خاص طور پر اس لئے کہ موجودہ زمانے میں لوگوں کا ذہن (حالات کی وجہ سے) لازمی طور پر بڑے سے بڑے وفاقوں کی طرف جارہا ہے. پھر بھی کمیٹی یہ تصور نہیں کرتی کہ کسی علاقے کی آبادی کو ہندوستانی وفاق میں شامل رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس آبادی نے علانیہ اور استقلال کے ساتھ الگ رہنے کا ارادہ کر لیا ہو لیکن اس اصول کو مانتے ہوئے بھی کمیٹی کا خیال ہے کہ ایسے

یہی طریقہ ہے جس سے اس نازک وقت میں بھی ہندوستانیوں میں مستعدی اور جانبازی کی ایسی لہر دوڑائی جا سکتی ہے جو انہیں موقع کے مناسب عمل کرنے پر تیار کردے۔ یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ موجودہ حکومتِ ہند اور اس کی صوبجاتی شاخیں کافی استعداد نہیں رکھتی ہیں، اور ہندوستان کے تحفظ کی ذمہ داری کو پورا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس ذمہ داری کا حق صرف ہندوستانی قوم اپنے منتخب اور باا‌ثر نمائندوں کے ذریعہ ادا کرسکتی ہے، جس کی شرط یہ ہے کہ اُسے آج اور ابھی آزادی ملے اور ذمہ داری کا پورا بوجھ اس پر ڈالا جائے

اس وجہ سے کمیٹی ان تجویزوں کو منظور نہیں کرسکتی جو برطانوی کابینہ کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔»

۱۱ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو میں نے ایک پریس کانفرنس بھی بلائی جس میں، میں نے بہت سے نامہ نگاروں سے ملاقات کی اور انہیں کرپس کی پیش کش کو نامنظور کرنے کے اسباب سمجھائے۔ انہیں یہاں تفصیل کے ساتھ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ یہ مندرجہ بالا رزولیوشن اور کرپس کی اور میری خط و کتابت میں بیاں کردئے گئے ہیں۔ میں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ جیسے جیسے گفتگو کا سلسلہ بڑھا حالات کی جو رنگین اور خوش آیند تصویر سر سٹیفرڈ نے پہلے کھینچی تھی دھندلی پڑتی گئی۔ فضا کی اس تبدیلی کا عکس لارڈ ویول سے میری ملاقات میں بھی نظر آیا۔ گفتگو کے دوراں میں سر سٹیفرڈ کرپس نے بار بار ان انتظامی اور فنّی دشواریوں پر زور دیا تھا

کے اس پہلو کو سب سے زیادہ اہم مانا ہے ، اور رہنمائی چاہنے والوں کو وہ جو مشورہ دیگی اس کا انحصار بھی اسی پہلو پر ہوگا. زمانہ حال کے مطابق برطانوی کابینہ کی تجویزیں مبہم اور بالکل نامکمل ہیں. اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس وقت حکومت کی جو ساخت ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی مدنظر نہیں ہے. یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ ہندوستان کا تحفظ بہر حال انگریزوں کے ذمے اور ان کے اختیار میں رہے گا. تحفظ کا مسئلہ ہر زمانے میں بہت اہم ہوتا ہے ، جنگ کے موقع پر اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ زندگی اور حکومت کے تقریباً ہر شعبے پر حاوی ہو جاتا ہے. اس وقت تحفظ کو ہندوستانیوں کے دائرہ اختیار سے خارج کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستانیوں کا اختیار ایک مضحکہ خیز اور بے حقیقت چیز بن کر رہ جائے گا. اس سے یہ مطلب بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران میں ہندوستان کسی اعتبار سے آزاد نہ ہوگا اور اس کی حکومت آزادی اور خودمختاری کے ساتھ کام نہ کرسکے گی. کمیٹی یہاں اس بات پر پھر زور دینا چاہتی ہے کہ ہندوستانیوں کے زمانہ حال میں اختیارات قبول کرنے کی لازمی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انہیں پورا احساس ہو کہ وہ آزاد ہیں اور اپنی آزادی کو قائم اور محفوظ رکھنے کے ذمہ دار ہیں. سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ لوگوں میں جوش اور تعاون کا جذبہ پیدا ہو ، اور یہ پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان پر پورا اعتبار نہ کیا جائے اور تحفظ اور دفاع کے معاملے میں ان پر ذمہ داری نہ ڈالی جائے.

نے محسوس کیا کہ وہ اور زیادہ نہیں ٹھہر سکتے ہیں، اور میری تمام دلیلیں انہیں رائے بدلنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔

میں نے پریس کے نمائندوں سے یہ بھی کہا کہ ہر منزل پر ہمارے فیصلے کامل اتفاق رائے سے ہوئے

آخر میں، میں نے کہا کہ ہم اس مقصود کو حاصل نہ کر سکے جس کی ہم سب کو شدید آرزو تھی، لیکن یہ بیان کرنا اور یاد رکھنا ضروری ہے کہ گفتگو کا انداز دوستانہ رہا۔ ایسے انتہائی اختلافات کے باوجود، جو کبھی کبھی بحث میں گرمی پیدا کر دیتے تھے، ہمارے درمیان صفائی اور بے تکلفی قائم رہی اور ہم دوستوں کی طرح سر سٹیفرڈ سے رخصت ہوئے

کرپس مشن کے متعلق کانگریس کی گفت و شنید اس طرح ختم ہوئی۔ جواہر لال اور راج گوپال آچاری کا معاملہ کچھ اور تھا، اور ہندوستانی آزادی کی جدو جہد کے اگلے دور کا ذکر کرنے سے پہلے میں اس کیفیت کو خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں جو مذکورہ بالا واقعات نے ان دنوں میں پیدا کی۔

کرپس کے جانے کے تھوڑے ہی دن بعد جواہر لال نے «نیوز کرانیکل» کے نمائندے کو اِنٹر ویو دیا اس میں ان کا انداز اور رویہ ایسا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس اور برطانوی قوم کے اختلافات کم سے کم کرکے دکھائے جارہے ہیں، اور اس خیال کی نمائندگی کی جا رہی ہے کہ ہندوستان انگریزوں کی مدد کرنے کو تیار ہے، اگرچہ کانگریس نے کرپس کی پیش کش کو نا منظور کر دیا ہے۔

جو کاؤنسل کے ہندوستانی ممبر کو دفاع کا ذمہ دار بنانے کی وجہ سے پیدا ہونگی۔ انہیں کی تجویز تھی کہ ہم لارڈ ویول سے ملاقات کریں، اس لئے کہ وہ اس مسئلے کے انتظامی اور فنّی نکتوں کو بہت بہتر سمجھا سکتے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ اس ملاقات کے دوران میں، جب کہ کمانڈر انچیف کے علاوہ اور فوجی افسر بھی موجود تھے، کسی انتظامی اور فنّی دشواری کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا گیا۔ ساری گفتگو کا رنگ سیاسی تھا، اور مجھے ایک لمحہ بھر بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ میں جنگ کے ماہر سے ملاقات کر رہا ہوں، اس لئے کہ لارڈ ویول ایک تجربہ کار سیاست داں کی طرح بات کر رہے تھے۔

گفتگو میں گاندھی جی نے جو حصہ لیا تھا اس کے بارے میں بعض اخباروں نے خیال آرائیاں کی تھیں اور میں نے ضروری سمجھا کہ پریس کانفرنس میں اس معاملے کو بھی صاف کردوں۔ کسی طرح کی جنگ میں بھی شرکت کے بارے میں گاندھی جی کے جو خیالات تھے وہ عام طور پر معلوم تھے اور یہ کہنا بالکل غلط تھا کہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں پر ان کا کسی طرح سے اثر پڑا

گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی سے صاف صاف کہدیا تھا کہ وہ تجویزوں کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھ کر بالکل آزادی کے ساتھ جو فیصلے چاہے کرسکتی ہے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے ابتدائی جلسوں میں بھی شریک نہیں ہونا چاہتے تھے اور صرف میرے اصرار کی وجہ سے چند دن ٹھہرنے پر راضی ہوگئے۔ آخر میں انھوں

پر ہندوستان کی آزادی کے بارہ میں کسی قسم کے شک وشبہ کا اثر نہیں تھا، بلکہ وہ بین الاقوامی حالات کے مطالعے کا نتیجہ تھا جواہر لال شروع سے فاشزم کے کٹر مخالف تھے، اور چین کا سفر اور چیانگ کائی شک سے تبادلہ خیال کرنے کے سب سے ان کو فاشزم سے اور بھی نفرت ہوگئی تھی. جاپان کے خلاف چین کی جد و جہد نے ان کو ایسا مرعوب کیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر جمہوری ریاستوں کی مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے انہیں اس کا دلی رنج تھا کہ ہندوستان میدان جنگ میں جمہوری ریاستوں کی طرف سے نہیں لڑ رہا ہے.

میں یہاں پر یہ بھی بتا دوں کہ بیشتر ہندوستانیوں کے مقابلے میں جواہر لال بین‌الاقوامی مصلحتوں سے زیادہ متاثر ہوتے رہے ہیں، اور ہر مسئلے کو وہ جس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں وہ قومی سے زیادہ بین‌الاقوامی ہوتا ہے. بین‌الاقوامی مسائل سے تعلق رکھنے میں میں اُن کے ساتھ شریک تھا، لیکن میرے لئے ہندوستانی آزادی کی اہمیت سب پر حاوی تھی میں جمہوری ریاستوں کو فاشسٹ طاقتوں پر ترجیح دیتا تھا، مگر میں اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا کہ جمہوریت کے اصول پر ہندوستان میں عمل نہ کیا گیا تو جمہوریت کے دعوے سب بے بنیاد اور بناوٹی ہونگے. پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ بھی مجھے یاد تھا. اُس وقت برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ چھوٹی کمزور قوموں کو بچانے کے لئے جرمنی کی اِمپریلزم سے لڑ رہا ہے. جب متحدہ ریاستیں جنگ میں شریک ہوئیں تو پریزیڈنٹ ولسن نے اپنے مشہور چودہ

مجھے ایک تجویز کی بھی اطلاع ملی کہ جواہر لال آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ کریں۔ ان کے نقطۂ نظر سے مجھے جو واقفیت تھی اس کی بنا پر مجھے اندیشہ ہوا کہ اس سے عام لوگوں میں پریشانی پیدا ہوگی۔ جواہر لال الہ آباد جاچکے تھے اور میں بھی کلکتہ جانے کا انتظام کرچکا تھا، میں نے طے کیا کہ جاتے ہوئے ان سے ایک اور گفتگو کرلوں، اور میں نے ان سے صاف صاف کہا کہ اب جو ورکنگ کمیٹی ایک رزولیوشن منظور کرچکی ہے تو انھیں اپنی رائے بہت سوچ سمجھ کر ظاہر کرنا چاہئے۔ اگر ان کے بیان سے لوگوں نے یہ اثر لیا کہ کانگریس جنگ کی سرگرمیوں کی مخالفت نہ کریگی تو ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کا مقصد فوت ہوجائے گا۔ کانگریس کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان برطانیہ کی مدد کرنے کو تیار ہے، مگر صرف ایک آزاد ملک کی حیثیت سے مدد کرسکتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ان کی بھی یہی رائے ہے، لیکن اگر ان کی کسی بات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکا کہ برطانیہ کا رویہ کچھ بھی ہو، ہندوستان جنگ کی سرگرمیوں میں مدد کرے گا، تو اس سے کانگریس کا رزولیوشن بے معنی معلوم ہوگا اس لئے میں نے ان سے درخواست کی کہ کوئی بیان نہ دیں۔ پہلے انھوں نے کچھ حجت کی، پھر میری بات سمجھ گئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی جب انھوں نے کہہ دیا کہ وہ کوئی بیان نہ دینگے اور ریڈیو پر جو تقریر کرنے کا وعدہ کیا تھا اسے نہ کرینگے۔

میں قطعی طور پر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جواہر لال کے رویّے

شریمتی رامیشوری نہرو کے مکاں پر گیا، جہاں جواہرلال ٹھہرے تھے۔ ہم نے ایک گھنٹے سے زیادہ مختلف مسائل پر بحث کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان کے خیالات کا میلان ہمارے اصل مفاد کے خلاف ہے۔ اگر ہندوستان کو حقیقی اختیار منتقل نہ کیا گیا اور صرف ایک نئی ایکزیکیٹو کاؤنسل بنادی گئی تو ہمیں بس کرپس کا وعدہ حاصل ہوگا جس کا ایفا جنگ کے بعد ہوسکے گا۔ موجودہ حالات میں ایسے وعدے کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے۔ یہ کسے معلوم تھا کہ جنگ کا انجام کیا ہوگا؟ ہم ایک آزاد ملک کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہونے کو تیار ہیں۔ اس نکتے کا کرپس کی پیش کش میں ذکر ہی نہیں ہے۔ جنگ میں شرکت کرنے کا فیصلہ ہمارا نہیں تھا، وائسرائے کا تھا، اور اب کرپس ہم کو اپنے طور پر طے کرنے کا موقع دئے بغیر ہم سے وائسرائے کے فیصلے کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں اگر اس کے باوجود ہم پیش کش کو منظور کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب تک ہم نے جو فیصلے کئے ہیں وہ سب غلط تھے

اس کے علاوہ میں نے کہا کہ جنگ کے بعد دنیا کا رنگ بدلنا لازمی ہے، اور کوئی بھی جو بین الاقوامی حالات سے واقف ہے، اس میں شک نہیں کرسکتا کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اس طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ دراصل کرپس ہمیں کچھ دے ہی نہیں رہے ہیں اور اگر ہم نے ان کی پیش کش کو منظور کر لیا تو ممکن ہے بعد کو پچھتائیں اگر انگریزوں نے وعدہ خلافی کی تو ہمارے پاس آزادی کی جدوجہد کو نئے سرے سے

نکات مرتب کئے اور تمام قوموں کو خود مختاری کی وکالت کی۔ پھر بھی ہندوستان کے حقوق کا لحاظ نہیں کیا گیا، اور ہندوستان کے معاملے میں چودہ نکات کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے میں سمجھتا تھا کہ جمہوری ریاستوں کی جتھابندی کا چرچا بے معنی ہے اگر ہندوستان کے معاملے پر سنجیدگی سے غور نہ کیا جائے۔ یہ سب باتیں میں نے ایک انٹرویو میں بیان کر دیں جو میں نے قریب ایک ہفتہ بعد کلکتہ میں «نیوز کرانیکل» کے نمائندے کو دیا

اس ساری مدت میں جواہر لال کی طبیعت پر بہت زبردست بوجھ رہا وہ حال میں چین سے واپس آئے تھے، جہاں ان پر سپہ سالار اعظم اور میڈم چیانگ کائی شک کا بہت اثر پڑا تھا ان کو یقین تھا کہ جاپان کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے واسطے چین کے لئے ہندوستان کی مدد ناگزیر ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے دوران میں ایک مرتبہ شام کو جواہر لال میرے پاس آئے اور اُن سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کرپس کی پیش کش کو منظور کرنے کے موافق ہیں، چاہے برطانیہ کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ کرپس نے جو مفید مطلب وعدے کئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ہمیں پس وپیش نہ کرنا چاہئے۔ انہوں نے یہ بات صاف الفاظ میں نہیں کہی، لیکن ان کی دلیلوں کا رخ اسی طرف تھا۔

اس گفتگو سے میری طبیعت بہت پریشان ہو گئی اور مجھے دو بجے صبح تک نیند نہیں آئی۔ جیسے ہی میری آنکھ کھلی، میں

جس طرح بگڑتے جارہے تھے اس سے انھیں شدید بےچینی ہو رہی تھی. ان کی رائے تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کی وجہ سے ہندوستان کے آزاد ہونے کی نوبت نہیں آ پاتی تھی. میں حالات دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انگریز جنگ کے زمانے میں جوکھوں میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اور فرقہ وارانہ اختلافات سے ان کو حکومت کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا بہانا مل گیا. راج‌گوپال آچاری کو اس رائے سے اتفاق نہیں تھا، اور کرپس کی پیش‌کش کے نامنظور کئے جانے کے تھوڑے دن بعد وہ علانیہ کہنے لگے کہ اگر کانگریس لیگ کے مطالبوں کو مان لے تو ہندوستان کی آزادی کے حصول میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائینگی. انھوں نے اس خیال کو ظاہر کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مدراس کی کانگریس ایجس لیجر پارٹی میں حسب ذیل رزولیوشن پیش کرایا:

«مدراس اسمبلی کی کانگریس پارٹی کو بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں قومی حکومت قائم کرنے کی کوششیں ناکامیاب ہوئی ہیں. قومی حکومت ملک کو اس قابل بنا دیتی کہ وہ ان مسائل کو حل کرسکے جو موجودہ نازک صورت حال نے پیدا کر دئے ہیں، اور اس ناکامیابی نے قوم پرست ہندوستانیوں کو دونوں طرح سے مشکل میں ڈال دیا ہے یہ ناممکن ہے کہ ملک پر کوئی دشمن حملہ کرے تو لوگ سوچیں کہ غیرجانبدار یا تحمل پسند کیسے بنا جائے، اور یہ تدبیر بھی قابل عمل اور موثر نہ ہوگی کہ اپنے طور پر مدافعت کا انتظام کیا جائے جس

شروع کرنے کی معقول وجہ نہ ہوگی. جنگ نے ہندوستان کو آرادی حاصل کرنے کا ایک موقع دیا ہے، اور ہمیں خالی ایک وعدے پر بھروسا کرکے اسے ہاتھ سے نہ دے دینا چاہئے.

دنیا اور ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے جواہرلال بہت افسردہ خاطر تھے، اور یہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی پختہ رائے قائم نہیں کرسکے ہیں. اندورنی کشمکش کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بےبس محسوس کرتے تھے (میری باتیں سنکر) وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر اُنہوں نے کہا، «میں یہ ہرگر نہیں چاہتا کہ اپنے ذاتی رجحانات کے مطابق فیصلہ کروں. اس کے بارے میں آپ کے دل میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہئے میرا فیصلہ وہی ہوگا جو میرے ساتھیوں کا ہو.»

جواہرلال کی طبیعت ایسی ہے کہ جب وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں تو سوتے میں بڑبڑاتے ہیں، اور جن فکروں میں اُن کا دن گذرتا ہے وہ رات کو خواب بن جاتی ہیں. جب میں باہر نکلا تو شریمتی رامیشوری نہرو نے مجھے بتایا کہ پچھلی دو راتوں کو جواہرلال بڑبڑاتے رہے ہیں. کبھی وہ بحث کرتے، کبھی منہ ہی منہ میں بولتے اور کبھی رور رور سے انہوں نے کرپس کا نام لیا تھا، کبھی کبھی گاندھی جی کا ذکر آیا، کبھی میرا نام. جواہرلال کے ذہن پر جو بوجھ تھا اس کا ایک اور ثبوت یہ بھی تھا

شری راجگوپال آچاری دوسرے شخص تھے جن پر کرپس سے گفت و شنید کا بہت گہرا اثر پڑا. ملک میں فرقہ واری تعلقات

رزولیوشن پیش کرانے سے پہلے راج گوپال آچاری نے نہ مجھ سے مشورہ کیا تھا، نہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، ورکنگ کمیٹی کے کسی اور ساتھی سے۔ اخباروں میں رزولیوشن پڑھ کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کے ممبر کانگریس کے فیصلے کے خلاف تقریریں کرتے پھریں گے تو اس سے صرف پارٹی کی ڈسپلن کمزور نہ ہوگی بلکہ عوام کے ذہن میں انتشار پیدا ہوگا اور اِمپریلسٹ طاقت کو ایک اور گرفت مل جائے گی۔ اس لئے مجھے خیال ہوا کہ اس معاملے کو ورکنگ کمیٹی کے سامنے غور کرنے کے لئے پیش کرنا چاہئے

میں نے راج گوپال آچاری سے کہا کہ مدراس کی کانگریس لیجس لیچر پارٹی نے جو رزولیوشن منظور کئے ہیں وہ کانگریس کی معلوم اور معروف پالیسی کے خلاف ہیں۔ چونکہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ایک ذمہ دار رکن ہیں، انھیں ایسی تجویزوں اور تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ اگر وہ اس معاملے میں کوئی قطعی رائے رکھتے تھے، تو اسے ظاہر کرنے سے پہلے انھیں ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں سے اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہئے تھا۔ اگر ورکنگ کمیٹی ان سے اتفاق نہ کرتی تو انھیں اختیار ہوتا کہ اس سے استعفٰے دیکر اپنے خیالات کا پرچار کریں۔

راج گوپال آچاری نے تسلیم کیا کہ مدراس لیجس لیچر کی کانگریس پارٹی کے سامنے رزولیوشن پیش کرنے سے پہلے انھیں ورکنگ کمیٹی میں ان پر گفتگو کرلینی چاہئے تھی۔ لیکن چونکہ رزولیوشن ان کی پختہ رائے کو ظاہر کرتے تھے اس لئے وہ انھیں

کا حکومت کے مدافعانہ انتظامات سے ربط اور تعلق نہ ہو اس خطرے کے وقت میں قومی مفاد کا قطعی تقاضا ہے کہ کانگریس جلد سے جلد ان تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے سب کچھ کرے جو قومی حکومت کے قیام میں حائل ہیں، اس لئے کہ قومی حکومت ہی موجودہ صورت حال پر قابو پا سکتی ہے. مسلم لیگ کو اصرار ہے کہ ملک کے بعض حصوں کا، ان کی آبادی کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ حق تسلیم کر لیا جائے کہ وہ متحد ہندوستان سے الگ رہیں، اور لیگ نے اسے متحد قومی اقدام کی شرط اوّلیں ٹھہرایا ہے اس پارٹی کی رائے ہے اور وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے اس کی منظوری کی سفارش کرتی ہے کہ اس نازک موقع پر یہ بات دانشمندی کے خلاف ہوگی کہ متحد ہندوستان کی بحث کو جاری رکھنے کے غیر یقینی فائدے کی خاطر ایک قومی حکومت کے قیام کے امکانات کو قربان کیا جائے. اب اس کی ضرورت ہے کہ خرابی کی صورتوں میں سے وہ اختیار کی جائے جو کم خرابی کی ہو اور علاحدگی کا جو مطالبہ مسلم لیگ کر رہی ہے اسے منظور کر لیا جائے، اس شرط پر کہ مسلم لیگ کو اس وقت ہی علاحدگی پر اصرار ہو جب دستور مرتب کرنے کا وقت آئے اس طرح لیگ کو اس بارے میں جو شکوک اور اندیشے ہیں وہ دور ہو جائیں گے اسی کے ساتھ لیگ کو مشورہ کرنے کی دعوت دینا چاہئے تاکہ آپس میں معاملات طے ہو سکیں اور اس وقت کے خطروں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک قومی حکومت قائم کی جا سکے.»

خاطر مجھے وہ رزولیوشن پیش کرنے چاہئیں جن کا نوٹس مسٹرستانم
نے دیا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ
میں ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے استعفٰے دیدوں۔

آخر میں اجازت دیجئے کہ اُس خالص اعتماد اور محبت کا
شکریہ ادا کروں جس سے آپنے اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے
ساتھیوں نے اس تمام مدت میں، جب کہ میں کمیٹی کا ممبر رہا ہوں
مجھے نوازا ہے۔

آپ کا مخلص،

سی۔ راج گوپال آچاری

واپس لینے پر تیار نہیں تھے. انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں انھوں نے پریزیڈنٹ سے مشورہ کئے بغیر ایک بہت ہی اختلافی مسئلے پر اپنی رائے پبلک میں بیان کرنے کی معافی چاہی تھی. ان کا خط یہ تھا.

۱۹ ایڈمنسٹون روڈ،

الہ آباد ـ ۳۰ اپریل سنہ ۱۹٤۲ء

مکرمی مولانا صاحب

مدراس کانگریس لیجسلیچر پارٹی میں میری تحریک پر جو رزولیوشن منظور ہوئے ہیں ان کے بارے میں آپ کی رائے معلوم ہوئی. میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے رزولیوشن پیش کرنے سے پہلے آپ سے اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ساتھیوں سے ان کے بارے میں گفتگو کر لینا چاہئے تھی، اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ ان سے اختلاف کرتے ہیں. اس خط کے ذریعہ میں اس پر افسوس ظاہر کرنا چاہتا ہوں.

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس معاملے میں میری رائے کتنی پختہ ہو چکی ہے. میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے اپنے فرض سے چشم پوشی ہوگی اگر میں اس کی کوشش نہ کروں کہ لوگ میرے ہم خیال ہو کر اس مقصد کی طرف عملاً رجوع ہوں جدھر میرا عقیدہ مجھے لئے جا رہا ہے. میں سمجھتا ہوں کہ عام مفاد کی

کیا ہے۔ اس کا اعلان کیا گیا تھا کہ برطانوی کابینہ کے ایک رکن سر سٹیفرڈ کرپس ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے نئی تجویزیں لیکر جائیں گے۔ وردھا میں ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مجھے سر سٹیفرڈ کرپس سے گفتگو کرنا چاہئے میری سر سٹیفرڈ سے مسلسل ملاقاتیں ہوئیں، اور میں نے ان سے کہا کہ وہ جو مسودہ اعلان لائے تھے وہ اطمینان بخش نہیں تھا اس میں خاص اس وقت کے لئے کچھ پیش نہیں کیا گیا تھا اور ہر بات ایک غیر متعین مستقبل پر ڈال دی گئی تھی زمانہ حال سے متعلق جو تجویزیں تھیں وہ صرف مبہم ہی نہیں تھیں بلکہ ان کے ذریعے عوام کو کسی قسم کا اختیار ملتا ہی نہیں تھا دفاع کلی طور پر برطانوی حکومت کے ہاتھ میں رکھا گیا تھا اس تحفظ کی وجہ سے برطانیہ سے ہندوستان کو اختیارات کی مفروضہ منتقلی بالکل بے حقیقت ہوجاتی تھی۔ کیونکہ جنگ کے زمانے میں تحفظ اور دفاع کا انتظام پورے انتظام حکومت پر حاوی ہو جاتا ہے

میں نے اپنے ساتھیوں کی حب الوطنی اور صداقت کو علانیہ سراہا اور کمیٹی کو مطلع کیا کہ ہمارے تمام فیصلے اتفاق رائے سے ہوئے تھے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ فرقہ واری مسئلے اور دوسرے مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہئے، مگر کرپس کی پیش کش کے بارے میں ہمارا جو رویہ تھا اس پر ہم نے اپنے ان خیالات کو اثرانداز نہیں ہونے دیا۔ پیش کش کو جانچنے کے لئے ہم نے صرف ایک معیار

بے چینی کا دور

کرپس مشن کی ناکامی نے عام مایوسی اور غصہ کی فضا پیدا کر دی۔ بہت سے ہندوستانیوں کو شبہ ہوا کہ چرچل کی وزارت نے صرف امریکی اور چینی دباؤ کی وجہ سے سر سٹیفرڈ کو بھیجا تھا، مسٹر چرچل کا اپنا ارادہ تھا ہی نہیں کہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کریں مختلف پارٹیوں سے جو لمبی چوڑی گفتگوئیں ہوئیں ان کا منشا باہر کی دنیا کو دکھانا تھا کہ کانگریس صحیح معنوں میں ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی ہے اور یہ کہ ہندوستانیوں کے باہمی اختلافات ہی اس کا سبب ہیں کہ انگریز اُنہیں اختیارات سونپ نہیں دیتے۔ چونکہ کانگریسیوں میں بھی غلط فہمیاں تھیں اور وہ بھی پریشان تھے، میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ کرانے کا فیصلہ کیا یہ جلسہ الہ آباد میں ۲۹ اپریل سے ۲ مئی تک ہوا، اور اس سے پہلے، ۲۷ اپریل سے پہلی مئی تک ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کارروائی کو شروع کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس سے ڈیڑھ مہینے پہلے ہم وردھا میں ملے تھے۔ اُس وقت یہ معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کی خاطر ایک نیا رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ

لوگوں کی تسیہ کی جو سمجھتے تھے یا کہتے تھے کہ جاپان ہندوستان کو آزاد کرے گا۔ میں نے کہا کہ ہماری قومی خودداری کا تقاضا ہے کہ ہم ایک قوم کے بجائے کسی دوسری قوم کی غلامی کرنے کے خیال کو اپنے دل سے نکال دیں۔ برطانیہ سے ہمارے جو اختلافات ہیں ان کے باوجود ہم جاپانی حملے کا مقابلہ کریں گے۔ جاپان کا خیرمقدم ہرگز نہ کیا جائے گا، نہ ایک قدم اسکی طرف بڑھ کر نہ ساکت رہ کر۔ اگر ہم آزاد ہوتے تو ہر حملہ آور کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرتے۔ اس طرح کا مقابلہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن عدم‌تشدد کا ہتھیار بہرحال ہمارے پاس ہے۔ ہم اس ہتھیار کو اکیس برس سے استعمال کر رہے ہیں اور کوئی اسے ہمارے ہاتھ سے چھین نہیں سکتا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے رویّے اور فیصلے کی، اور کرپس‌مشن کے متعلق اس نے جو رزولیوشن منظور کیا تھا اس کی تصدیق کی اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ورکنگ کمیٹی کو آزادی کی جدو جہد جاری رکھنے کے لئے مزید کارروائی کرنے کا مجاز کیا جائے۔

میں الہ‌آباد سے کلکتہ واپس گیا اور مجھے ہر طرف حالات کو ابتر ہوتے ہوئے دیکھ کر بہت پریشانی ہوئی۔ بیشتر لوگوں کو یقین تھا انگریز شکست کھا جائیں گے، اور بعض، معلوم ہوتا تھا جاپانیوں کی فتح پر خوش ہوں گے۔ انگریزوں سے ان کی شکایت اور نفرت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ وہ یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ جاپان کے ہندوستان فتح کر لینے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

رکھا تھا کہ اس کی بدولت اختیار انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا یا نہیں. مجھے اس میں شک نہیں تھا کہ ہم فرقہ واری مسئلے کا ایک قابل اطمینان حل پیش کر سکینگے اگر سیاسی اختیارات کی منتقلی اطمینان بخش طریقے پر ہو جائے.

اس کے بعد میں نے بعض لوگوں کی اس رائے کا ذکر کیا کہ کرپس مشن کو لوگوں کا رویہ بدلنے میں کامیابی ہوئی اگرچہ اس کی وجہ سے برطانیہ اور ہندوستان کا معاملہ طے نہ ہو سکا. میں نے کہا کہ میرے نزدیک یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے. مشن کا کچھ نتیجہ نکلا تو یہ کہ برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت کے امکانات بہت کم ہوگئے، اور یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے. مشن نے امیدیں دلائیں اور پھر ان پر پانی پھیر دیا. اس نے اس یقین کو پختہ کر دیا ہے کہ غلام ہندوستان کو جنگ سے کوئی مطلب اور تعلق نہ ہوگا اور ہندوستان آزاد ہو تب ہی اپنی حفاظت کر سکے گا. سر سٹیفرڈ کرپس اب یہ کہہ رہے تھے کہ اس کے بعد سے ہندوستان کو اپنا معاملہ طے کرنے کے لئے فوراً اقدام کرنا ہوگا، برطانوی حکومت اپنی طرف سے پہل نہ کرے گی. لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ کانگریس مفاہمت کی خاطر جو کچھ کر سکتی تھی کر چکی ہے اور اب اسکی جانب سے کوئی اقدام نہ ہوگا.

اس کے بعد میں نے جاپان کے حملے کی طرف اشارہ کیا جو ایک مصیبت کی طرح سر پر آن کھڑا ہوا تھا. میں نے ان

کا حملہ سمندر کی طرف سے ہوگا اور وہ ڈائمنڈ ہاربر سے
کلکتہ کی طرف بڑھیں گے حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ ایسی
صورت میں کلکتہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا، اور
منتخب عہدہ داروں کو خفیہ ہدایتیں دے دی گئی تھیں کہ وہ
کلکتہ، ہوڑا اور چوبیس پرگنے کو کس طرح خالی کریں اور
کن راستوں سے جائیں۔ کچھ احتیاطی کارروائیاں بھی کرلی گئی
تھیں، مختلف مقاموں پر مقابلہ کرنے کا پلان بن گیا تھا اور عارضی
طور پر اس کے متعلق بھی احکامات تیار کرلئے گئے تھے کہ
پیچھے ہٹنے کی صورت ہوئی تو پسپائی کن راستوں سے ہوگی۔
پلان کے مطابق دریائے پدما مقابلے کا پہلا محاذ ہوتا، دوسرا
محاذ آسن سول اور رانچی کے درمیاں، اور آخری الہ آباد کے پاس۔
حکومت نے یہ بھی طے کیا تھا کہ جاپانی حملہ ہوا تو سب کچھ
جلا کر برباد کر دینے کی سی پالیسی پر عمل ہوگا، اور اہم پُلوں
کو گرا دینے اور کارخانوں اور صنعتی اداروں کو اُڑا دینے کا
انتظام کیا گیا تھا، تا کہ جاپانی ان سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔
جمشید پور کے مشہور کارخانے کو برباد کرنے کا جو پلان بنا تھا
اس کی لوگوں کو کسی طرح خبر ہوگئی اور اس پورے علاقے کی
آبادی پریشاں اور بے چین ہوگئی۔

میں نے گاندھی جی کو یہ سب بتایا، اور یہ بھی کہا کہ اگر
جاپانیوں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو میرے نزدیک
ہم میں سے ہر ایک کا اخلاقی فرض ہوجائے گا کہ ان کے خلاف
ہر ہتھیار کو استعمال کریں۔ میں سمجھتا تھا کہ ایک آقا کے

کرپس کے جانے کے بعد مجھے گاندھی جی کے رویّے میں بھی نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ جنگ کے دوران میں کسی تحریک کو شروع کرنے کے کس قدر خلاف تھے، اور کہتے تھے کہ ہندوستان کو عدم تشدد کے اصول کی حمایت کرنا اور کسی حالت میں اس سے انحراف نہ کرنا چاہئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تحریک شروع ہوئی تو اس میں تشدد پیدا ہو جائے گا، اور اسی وجہ سے وہ میرے اصرار کے باوجود عام تحریک کے آغاز پر راضی نہ ہوئے۔ دراصل میں انہیں انفرادی ستیہ گرہ یا سول نافرمانی پر بڑی مشکل سے رضامند کر سکا تھا۔ رضامند ہونے پر بھی انہوں نے اتنی شرطیں لگائیں کہ تحریک ایک سیاسی وظیفہ بن کر رہ گئی

گاندھی جی کا ذہن اب کامل سکوت کی انتہا سے منظم عوامی تحریک کی طرف جا رہا تھا۔ انہوں نے شاید اس طرح سوچنا پہلے ہی سے شروع کر دیا تھا، مگر اس کے نتائج کرپس کے جانے کے بعد نظر آئے۔ میں جون سنہ ۱۹۴۲ء میں ان سے ملنے کے لئے وردھا گیا اور کوئی پانچ دن ان کے ساتھ رہا، اور ان سے جو باتیں ہوئیں ان سے میں نے اندازہ کیا کہ جنگ چھڑنے کے وقت انہوں نے جو پوزیشن اختیار کی تھی اس سے وہ بہت دور ہٹ گئے ہیں۔

میں اب بھانپ سکتا تھا کہ حکومت کو جاپانی حملے کا اندیشہ ہے، اور وہ سمجھتی ہے کہ اگر جاپانیوں نے پورے ملک کو نہ گھیرا تب بھی وہ بنگال پر قبضہ کرنے کی کوشش کرینگے، ان

مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ گاندھی جی کو مجھ سے اتفاق نہیں ہے۔ مجھ سے اُنہوں نے صاف صاف کہا کہ اگر کبھی جاپانی فوجیں ہندوستان میں آئیں تو وہ ہماری نہیں انگریزوں کی دشمن ہونگی اُنہیں یقین تھا کہ اگر انگریز اسی وقت چلے گئے تو جاپانیوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی کوئی وجہ نہ رہیگی۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے غلط رائے قائم کی ہے۔ لیکن لمبی بحثوں کے بعد بھی ہم متفق نہ ہوسکے۔ مجھے معلوم ہوا کہ سردار پٹیل کی بھی وہی رائے تھی جو کہ گاندھی جی کی۔ اور ممکن ہے انہوں نے گاندھی جی پر اثر ڈالا ہو اس طرح ہم اپنے اختلافات کو دور کئے بغیر جدا ہوئے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ وردھا میں ہونے والا تھا۔ میں ۵ جولائی کو وردھا پہونچا اور گاندھی جی نے مجھ سے «ہندوستان چھوڑ دو» کی تحریک کے بارے میں پہلی مرتبہ گفتگو کی۔ میں اس نئے خیال کو اپنے تصورات میں آسانی سے کھپا نہ سکا میں نے محسوس کیا کہ ہم ایک عجیب سی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ ہم کو ہمدردی اتحادیوں سے تھی، مگر برطانوی حکومت نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ اس کے ساتھ ہمارا اتحاد عمل ناممکن ہوگیا۔ ہم انگریزوں کی طرفداری صرف ایک آزاد قوم کی حیثیت سے کرسکتے تھے اور انگریز ہمیں اپنی لشکر گاہ کے ملازموں کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ دوسری طرف، جاپانیوں نے برہما پر قبضہ کر لیا تھا اور آسام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمیں ہر ایسے قول اور فعل سے پرہیز

بجائے دوسرے کا مسلط ہوجانا ناقابل برداشت ہوگا، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شے اور جاندار واضح نے ہماری پرانی حکومت کی جگہ لے لی جو رفتہ رفتہ مضمحل ہوگئی تھی اور جس کی گرفت کمزور پڑگئی تھی تو ہمارے قومی مفاد کو بہت زیادہ نقصان پہونچے گا مجھے یقین تھا کہ جاپانیوں کی جیسی نئی اِمپیریلزم کو بے دخل کرنا ہمارے لئے بہت زیادہ مشکل ہوگا.

میں نے جاپانیوں کے امکانی حملے کی پیش بندی کے طور پر کچھ تدبیریں اختیار کی تھیں. کانگریس کے لوگوں سے کہا تھا کہ پروپگنڈے کے ذریعے پبلک میں جاپانیوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کریں، اور کلکتہ کو مختلف وارڈوں میں تقسیم کردیا تھا جہاں ایسے رضاکاروں کے جتھے بھرتی اور منظم کئے گئے تھے جنھوں نے جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کا عہد کیا تھا. ان رضاکاروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ جاپانی پیش قدمی کریں تو ان کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹ ڈالی جائے میں نے سوچا یہ تھا کہ جیسے ہی جاپانی فوج بنگال پہنچے گی اور برطانوی فوج بہار کی طرف پیچھے ہٹ جائے گی ویسے ہی کانگریس بیچ میں آکر سارے علاقے پر قبضہ کرلے گی، اور قبل اس کے کہ جاپانی اپنے قدم جماسکیں ہم اپنے رضاکاروں کے ذریعے درمیانی مدت میں اپنی حکومت قائم کرلیں گے نئے دشمن کا مقابلہ کرنے اور اپنی آزادی حاصل کرنے کی یہی ایک صورت تھی، مئی اور جون سنہ ۱۹٤۲ء میں میرا بیشتر وقت اس نئی پالیسی پر غور کرنے اور اس کو عملی شکل دینے میں صرف ہوا.

نہ جائینگے، بلکہ گرفتار کرنے والوں کا مقابلہ کریںگے اور حکم اسی حالت میں مانیںگے جب انہیں مجبور کر دیا جائے۔

مجھے جاپانیوں کے رویّے پر بھروسا نہیں تھا، اور میری رائے تھی کہ ہم اُن کے قول پر اعتبار نہیں کرسکتے مجھے یہ بہت بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کو ملک چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ کر اپنی فاتحانہ پیش قدمی کو روک دیں گے۔ مجھے ڈر تھا کہ انگریزوں کا چلا جانا جاپانیوں کو روکنے کے بجائے ان کو اور حوصلہ دلائےگا کیا وہ برطانیہ کی دست کشی کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کا بہترین موقع نہ سمجھیں گے؟ میں ان سوالوں کا قطعی جواب نہیں دے سکتا تھا، اس لئے مجھے گاندھی جی کا نقطۂ نظر اختیار کرنے میں تامل تھا۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے ایک منظم عوامی تحریک کا سلسلہ شروع کیا تو انگریز اسے ایک طرح کی تنبیہ سمجھیں گے اور اندھا دھند کارروائی نہ کریں گے۔ اس لئے انہیں تحریک کی تفصیلات طے کرنے اور اپنے ارادے کے مطابق اس کی رفتار کو بڑھانے کا موقع ملے گا مجھے یقین تھا کہ ایسا نہ ہوگا۔ حکومت انتظار کرنے کے بجائے گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کو عوامی تحریک شروع کرنے کا رزولیوشن منظور ہوتے ہی گرفتار کرلے گی۔ لیڈروں کی عدم موجودگی لوگوں کو بے بس کر دے گی، اور وہ اس قدر مایوس ہونگے کہ جاپانیوں نے ملک پر حملہ کیا تو ان کے خلاف کچھ نہ کر پائیں گے۔ اس وقت وہ اس عقیدت کی وجہ سے جو انہیں گاندھی جی سے تھی

کرنا چاہئے جس سے جاپانیوں کا حوصلہ بڑھے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا واقعات رونما ہوتے ہیں اور لڑائی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ گاندھی جی نے اس سے اتفاق نہیں کیا وہ مصر تھے کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب کانگریس کو مطالبہ کرنا چاہئے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اگر وہ راضی ہوگئے تو ہم جاپانیوں سے کہہ سکیں گے کہ اور آگے نہ بڑھیں، اور اگر اس کے باوجود جاپانی آگے بڑھے تو ان کا حملہ ہندوستان پر ہوگا، انگریزوں پر نہ ہوگا ایسی صورت میں ہم اپنی پوری طاقت سے ان کا مقابلہ کرینگے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو میں انگریزوں کی منظم مخالفت کرنے کے حق میں تھا، مگر اس وقت گاندھی جی نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا تھا اب جو انہوں نے اپنی رائے بدل دی تھی تو میری پوزیشن عجیب سی ہوگئی۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے وقت میں جب دشمن ہندوستان کی سرحد پر تھا، انگریز منظم مخالفت کی کسی تحریک کو ہرگز پنپنے نہ دینگے۔ گاندھی جی کو نہ معلوم کیوں یقین تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کرینگے، اور انہیں اپنی تحریک کو اپنے خاص ڈھنگ سے آگے بڑھانے کی اجازت دیدیں گے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ وہ وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ انگریزوں کی مخالفت کس طریقے پر کی جائے گی تو پتہ چلا کہ ان کے ذہن میں کوئی خاص پروگرام نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے صرف یہ ایک بات بتائی کہ پچھلے موقعوں کی طرح اس مرتبہ لوگ اپنی مرضی سے قید خانوں میں

تھا، اس لئے کہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد وہ بس یہ جواب دیتے تھے کہ ہمیں گاندھی جی پر پورا بھروسا کرنا چاہئے ان کا عقیدہ تھا کہ گاندھی جی پر سب کچھ ڈال دیا گیا تو وہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔ اس کے ثبوت میں وہ ۱۹۳۰ء کی نمک ستیہ گرہ کی مثال پیش کرتے تھے جب وہ شروع کی گئی تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوگا۔ خود حکومت ہند اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھی اور اس کا علانیہ مضحکہ اُڑایا جاتا تھا لیکن آخر میں یہ تحریک بہت کامیاب ہوئی اور انگریز ہماری شرطیں ماننے پر مجبور ہو گئے۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھی کہتے تھے کہ اس مرتبہ بھی گاندھی جی کو ویسی ہی کامیابی ہوگی، مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں ایسے استدلال سے مطمئن نہیں ہوتا تھا

غالباً گاندھی جی کو خیال تھا کہ جیسے ہی تحریک شروع ہوگی، انگریز کانگریس سے سمجھوتا کر لیں گے، یہ دیکھ کر کہ دشمن ہندوستان کی سرحد تک پہونچ گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تب بھی انگریز ایسی حالت میں جب کہ جاپانی ہندوستان کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے کوئی سخت اقدام نہ کریں گے، اور اس طرح کانگریس ایک موثر تحریک کی تشکیل کر سکے گی۔ میں نے حالات کو دیکھ کر بالکل اُلٹا نتیجہ نکالا تھا مجھے یقین تھا کہ جنگ کی اس نازک حالت میں انگریز کسی عوامی تحریک کو چلنے نہ دینگے۔ ان کے لئے یہ زندگی اور موت کا معاملہ تھا، ان کا جواب فوری اور کارگر ہوگا۔ میرے نزدیک یہ صاف ظاہر

کانگریس کی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ تھے، لیکن جب گاندھی جی اور ان کے ساتھی جیل میں ہونگے تو ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ کیا کریں. بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا کہ لوگوں کی ہمتوں کو قائم رکھنے کی کوئی تدبیر کرنا چاہئے. گاندھی جی کو موقع دیا گیا کہ تحریک کو اپنے طریقے پر آگے بڑھائیں تو ظاہر ہے کہ وہ عدم تشدد کی راہ اختیار کرینگے. مگر ایسا نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب گرفتار ہو جائیں تو لوگوں میں جمود پیدا ہو جائے، بلکہ انہیں اس کا حوصلہ دلانا چاہئے کہ وہ تشدد اور عدم تشدد کی بہت پروا کئے بغیر تحریک کو جاری رکھیں.

جب ورکنگ کمیٹی میں بحث شروع ہوئی تو میں نے ان مسائل کو وضاحت سے بیان کیا کمیٹی کے ممبروں میں سے صرف جواہر لال نے میری تائید کی، اور وہ بھی صرف ایک حد تک. دوسرے ممبر چاہے پوری طرح مطمئن نہ ہوتے مگر گاندھی جی کے خلاف رائے دینے پر تیار نہیں تھے میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی جواہر لال اکثر مجھ سے اتفاق کرتے تھے. انہیں چھوڑ کر باقی ممبر گاندھی جی کے کہنے کے مطابق کرنا کافی سمجھتے تھے. سردار پٹیل، ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور آچاریہ کرپلانی کو ٹھیک معلوم بھی نہ تھا کہ لڑائی کیا ہے اور کس لئے ہے؟ وہ شاذونادر ہی معاملوں کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے، اور بہرحال ان کی یہ عادت تھی کہ اپنی رائے کو گاندھی جی کے تابع کردیں. ان لوگوں کے ساتھ بحث کرنا فضول

ہماری بحثیں ۵ جولائی کو شروع ہوئیں اور کئی دن تک جاری رہیں میں نے پہلے بھی بعض موقعوں پر گاندھی جی سے اختلاف کیا تھا، مگر ایسا کامل اختلاف پہلے کبھی نہیں ہوا تھا معاملہ انتہا کو پہنچا جب انھوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ ہم خیالات میں ایک دوسرے سے اتنی دور ہوگئے ہیں کہ ہمارا تعاون نہیں ہوسکتا۔ اگر کانگریس چاہتی ہے کہ وہ تحریک کی رہنمائی کرے تو مجھے صدارت سے استعفٰے دیدینا اور ورکنگ کمیٹی سے بھی الگ ہوجانا چاہئے۔ جواہر لال کو بھی یہی کرنا چاہئے میں نے فوراً جواہر لال کو بلایا اور انہیں گاندھی جی کا خط دکھایا سردار پٹیل بھی اتفاق سے آگئے تھے اور انہیں خط پڑھ کر بہت صدمہ ہوا وہ اسی وقت گاندھی جی کے پاس گئے اور ان کے اس فعل پر سخت احتجاج کیا انھوں نے کہا کہ اگر میں نے صدارت سے استعفٰے دیا اور جواہر لال نے اور میں نے ورکنگ کمیٹی کو چھوڑ دیا تو اس کا رد عمل ملک کے لئے ایک مصیبت ہوجائے گا۔ اس سے لوگوں میں صرف ہیجان ہی نہیں پیدا ہوگا بلکہ کانگریس کی بنیادیں ہل جائینگی

گاندھی جی نے مجھے خط ۷ جولائی کو صبح سویرے بھیجا تھا۔ بارہ بجے کے قریب انھوں نے مجھے بلایا اور ایک لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے خط جلدی میں لکھ دیا تھا۔ اب معاملے پر مزید غور کرنے کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ اپنا خط واپس لے لیں۔ مجھے ان کی بات ماننی ہی پڑی۔ تین بجے سہ پہر کو جب ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو پہلی بات جو

تھا کہ جس وقت ہم تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کریں گے، حکومت تمام کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لیگی، اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پھر کیا ہوگا

مجھے اس کا پورا یقین تھا کہ موجودہ حالات میں کوئی عدم‌تشدد پر مبنی تحریک نہ شروع کی جا سکتی نہ جاری رہ سکتی ہے. کوئی تحریک تشدد سے اسی صورت میں پاک رہ سکتی تھی جب کہ اس کے قائد موجود ہوں اور قدم قدم پر اس کی رہنمائی کریں، اور میں جانتا تھا کہ تحریک شروع ہونے کا گمان بھی ہوا تو لیڈر سب گرفتار کر لئے جائیں گے ہاں اگر کانگریس عدم تشدد سے انحراف کر لینے کا فیصلہ کر لیتی تو تحریک کے لئے گنجائش تھی، کیونکہ ایسے لوگ بھی جنھیں تدبیریں بتانے والا نہ ہو آمدورفت اور ڈاک اور تار کے سلسلے کو توڑ سکتے ہیں، ساماں کے ذخیروں اور گوداموں میں آگ لگا سکتے ہیں اور ہزار طریقوں سے جنگ کے انتظامات میں گڑبڑ کر سکتے ہیں. میں یہ بھی مانتا تھا کہ اس طرح کی ایک عام شورش سب کاموں کو روک دیگی اور انگریز ہم سے معاملہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے. مگر اس میں بڑے خطرے تھے، اور میری رائے تھی کہ اگر ہم اس رستے کو اختیار کریں تو سب سمجھ کر فیصلہ کریں. دوسری طرف مجھے اس کا ذرا بھی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ جس قسم کی عدم تشدد کی تحریک گاندھی جی کے ذہن میں تھی وہ جنگ کے زمانے میں شروع کی جا سکے گی یا جاری رہ سکے گی.

کے خاتمے اور ایک قوم کے دوسری پر حملہ آور ہونے کے سلسلے کو بند کرنے کے لئے ضروری ہے۔

«جب سے عالمگیر جنگ شروع ہوئی ہے کانگریس نے بہت سوچ سمجھ کر ایسی پالیسی اختیار کی ہے جس سے حکومت کے لئے کوئی مشکل نہ پیدا ہو اگرچہ اس میں خطرہ تھا کہ اسکی ستیہ گرہ بے اثر رہیگی، اس نے عملاً اسے صرف ایک علامت کی شکل دی، اس لئے کہ اسے امید تھی کہ مشکل سے بچانے کی یہ پالیسی اس طرح اپنی منطقی انتہا کو پہنچائی گئی تو اس کی مناسب قدر کی جائے گی۔ اسے امید تھی کہ قومی نمائندوں کے ہاتھ میں حقیقی اختیار منتقل کر دیا جائے گا، تا کہ ہماری قوم ساری دنیا کے انسانوں کے لئے آزادی حاصل کرنے میں، جس کے پامال ہوجانے کا خطرہ ہے، پوری طرح سے شرکت کرسکے۔ اسے امید تھی کہ کم از کم ایسی کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی جس کا اثر برعکس ہو اور برطانیہ کا پنجۂ غصب اور مضبوط ہوجائے۔

« مگر یہ سب امیدیں پاش پاش ہوگئیں۔ کرپس کی لاحاصل تجویزوں نے بہت صاف صاف یہ ظاہر کر دیا کہ برطانیہ کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور وہ ہندوستان کو حسب سابق اپنے پنجے میں پکڑے رہنا چاہتا ہے۔ سر سٹیفرڈ کرپس سے گفت و شنید کرتے وقت کانگریس کے نمائندوں نے انتہائی کوشش کی کہ کم سے کم حقوق جو قومی مطالبے سے ہم آہنگ ہوں، حاصل ہو جائیں، لیکن بے سود۔ اس مایوسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ برطانیہ سے مخاصمت تیزی کے ساتھ بڑھ

گاندھی جی نے کہی وہ یہ تھی کہ گنہگار نادم ہوکر مولانا کے پاس واپس آگیا ہے !

ہم مجوزہ تحریک کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کرنے لگے ۔ گاندھی جی نے یہ بات صاف کردی کہ پچھلی تحریکوں کی طرح یہ بھی عدم تشدد پر مبنی ہوگی۔ لیکن تشدد کے سوا ہر طریق کار جائز ہوگا۔ گفتگو کے دوران میں جواہر لال نے کہا کہ شاید گاندھی جی کے ذہن میں جو چیز ہے وہ کھلی بغاوت ہے، چاہے اس بغاوت میں تشدد نہ ہو گاندھی جی کو یہ تعریف پسند آئی اور انھوں نے کئی مرتبہ کھلی ہوئی بے تشدد بغاوت کا ذکر کیا ۱۴ جولائی کو ورکنگ کمیٹی نے قومی مطالبے کے متعلق حسب ذیل رزولیوشن منظور کیا ۔

«آئے دن کے واقعات اور ہندوستان کے لوگ جو کچھ جھیل رہے ہیں ، اس سے کانگریسیوں کی اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کا راج فوراً ختم ہوجانا چاہئے ۔ غیروں کی حکومت اپنی بہترین شکل میں بھی بذات خود ایک بری چیز ہے جس سے محکوم قوم کو مسلسل ایذا پہنچتی رہتی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ جب تک ہندوستان ایک غلام ملک ہے وہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی کارگر تدبیر نہ کرسکے گا، اور نہ اس جنگ کے انجام پر جو انسانیت کو برباد کررہی ہے کوئی اثر ڈال سکے گا۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی صرف ہندوستان کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی سلامتی اور نازیزم ، فاشزم ، فوج گردی اور اِمپریلزم کی دوسری شکلوں

صرف اس وقت سامنے سے ہٹیں گی، حقیقت اسی وقت روبرو آئے گی، اور ہندوستانی قوم، جس میں ہر گروپ اور پارٹی کے لوگ شامل ہوں گے، اسی وقت ہندوستان کے مسائل کو باہمی رضامندی سے حل کر سکے گی، جب غیروں کی حکومت اور مداخلت ختم ہو جائے آج کل کی پارٹیاں، جن کو قائم کرنے کا مقصد برطانوی حکومت کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور اس پر اثر ڈالنا ہے، اس وقت اپنی دوکان بڑھا چکی ہونگی. اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ لوگ دل سے محسوس کرینگے کہ راجہ، مہاراجہ، جاگیردار، زمیندار، سب کے سب دولت اور جائدادیں کھیتوں، کارخانوں اور دوسری جگہوں پر کام کرنے والے آدمیوں سے حاصل کرتے ہیں، اس لئے اختیار اور اقتدار انہی کام کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے. جب ہندوستان سے برطانوی حکومت ہٹ جائے گی تو ملک کے ذمہ دار مرد عورتیں جمع ہو کر ایک عارضی حکومت قائم کرینگی، جو ہندوستان کی آبادی کے تمام اہم حصوں کی نمائندگی کرے گی، اور پھر یہ عارضی حکومت ایک اسکیم مرتب کرے گی جس کے مطابق ایک دستور ساز اسمبلی ترکیب پائے گی، تاکہ وہ ہندوستان کی حکومت کے لئے ایسا دستور بنائے جو ہر طبقے اور ہر گروہ کے لئے قابل قبول ہو. آزاد ہندوستان اور برطانیہ کے نمائندے باہمی مشورے سے طے کریں گے کہ مستقبل میں ان کے تعلقات کی شکل کیا ہو، اور دونوں ملک اتحادیوں کی حیثیت سے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرنے کے فرض کو کس طرح انجام دیں. کانگریس کی

رہی ہے اور ہر طرف پھیل رہی ہے اور جاپانی فوجوں کی کامیابی پر خوشی ہو رہی ہے ۔ ورکنگ کمیٹی اس صورت حال کو بہت خطرناک سمجھتی ہے ، کیونکہ اس کا تدارک نہ کیا گیا تو لازمی ہے کہ لوگ حملہ‌آور کو جو کچھ وہ کرنا چاہے ، بغیر روک ٹوک کے کرنے دینگے ۔ کمیٹی کی رائے ہے کہ ہر جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرنا چاہئے ، کیونکہ اسکے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں ہندوستانی قوم کی بے عزتی ہوگی اور اس کی محکومیت جاری رہے گی کانگریس چاہتی ہے کہ جو کچھ ملایا ، سنگاپور اور برہما میں ہوا ہے وہ ہندوستان میں نہ ہو ، اور جاپانیوں یا کسی اور قوم کے جارحانہ اقدام یا حملہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کی جائے ۔

« کانگریس کی خواہش ہے کہ برطانیہ سے اس وقت جو بغض اور عداوت ہے وہ خیرخواہی میں تبدیل ہوجائے ، اور ہندوستان اپنی خوشی سے دنیا کی قوموں کو آزاد کرنے کے اجتماعی منصوبے میں شریک ہو جائے ، اور ان تمام آزمائشوں اور مصیبتوں سے گزرے جو ایسے منصوبے پورے کرنے میں پیش آتی ہیں ۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہندوستان اپنے دل میں آزادی کی گرمی محسوس کرے

« کانگریس کے نمائندوں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ فرقہ‌واری معاملوں کا اُلجھاؤ سلجھ جائے ۔ مگر ایک غیر قوم کی موجودگی نے جس کا زمانے سے یہ اٹل طریقہ رہا ہے کہ تفرقہ ڈال کر حکومت کرے ۔ اسے ناممکن کر دیا ہے ، آج کل کی فرضی دشواریاں

«ہند وستان چھوڑ دو»

ورکنگ کمیٹی کا رزولیوشن شائع ہوا، تو پورے ملک میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی. لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا که اس رزولیوشن کے کیا نتیجے نکل سکتے ہیں. ان کو تو بس یہ نظر آرہا تھا که بالآخر کانگریس، برطانیہ کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے عوامی تحریک شروع کر رہی ہے. چنانچہ عوام اور حکومت دونوں ہی بہت جلد اس رزولیوشن کو «ہندوستان چھوڑ دو» کے نام سے موسوم کرنے لگے ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں کی طرح عوام بھی گاندھی جی سے کامل عقیدت رکھتے تھے اور ان کو یقین تھا که انہوں نے کوئی ایسی تدبیر سوچی ہے، جو حکومت کے نظام کو درہم برہم کردے گی اور اس طرح وہ مصالحت پر مجبور ہو جائے گی. میں یہاں اس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں که کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سوچتے تھے که گاندھی جی ہندوستان کو جادو کے ذریعہ یا ایسے طریقوں سے آزادی دلوا دیں گے، جو انسانی فہم و طاقت سے ماورا ہیں. اس لئے وہ ضروری نہیں سمجھتے تھے که فوراً اس کے لئے کوئی خاص کوشش کریں.

رزولیوشن منظور کرنے کے بعد، ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا که وہ یہ دیکھے گی که حکومت پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے. اگر

دلی خواہش ہے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے متفقہ ارادے اور متحدہ قوت کے بل پر جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنے کے قابل بن جائے

«کانگریس یہ تجویز کرتے ہوئے کہ برطانوی حکومت ہندوستان سے ہٹالی جائے، بالکل اس کی خواہشمند نہیں ہے کہ برطانیہ یا اتحادی طاقتوں کو ایسی مشکل میں پھنسا دے جو جنگ کو جاری رکھنے میں خارج ہو، اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہندوستان پر جارحانہ اقدام ہو یا چین پر جاپانیوں یا ایسی کسی ریاست کا جو محوری گروپ میں شامل ہے، زیادہ دباؤ پڑے. کانگریس کی یہ بھی نیت نہیں ہے کہ اتحادی ریاستوں کی قوت مدافعت کو کسی طرح سے خطرے میں ڈالے. اس لئے کانگریس کو یہ منظور ہے کہ اگر اتحادی ریاستیں ایسا چاہتی ہوں تو اپنی فوجوں کو ہندوستان میں رکھیں، تاکہ جاپانی حملہ یا اور کسی جارحانہ اقدام کو روکا جا سکے یا اس کا مقابلہ کیا جا سکے اور چین کی حفاظت اور امداد کی جا سکے.

«اس مطالبے کا کہ برطانوی اقتدار ہندوستان سے ہٹا لیا جائے کبھی یہ منشا نہیں تھا کہ تمام انگریز ہندوستان سے چلے جائیں، اور یہ تو ہرگز مقصود نہیں تھا کہ وہ انگریز بھی چلے جائیں جو ہندوستان کو اپنا وطن بنانا چاہتے ہوں اور یہاں شہریوں کی طرح اور ہندوستانیوں کو اپنے برابر سمجھتے ہوئے رہنا چاہیں. ورکنگ کمیٹی ان کے معاملے کو آخری فیصلے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس بھیج رہی ہے اس مقصد کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ۷ اگست سنہ ٤۲ء کو بمبئی میں اجلاس ہوگا.»

ملاقات کی درخواست کی۔ وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری نے جواب دیا کہ چونکہ گاندھی جی بغاوت کی باتیں کرتے ہیں، اس لئے وائسرائے ان سے ملاقات کرنا منظور نہیں کر سکتے انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت جنگ کے زمانے میں کسی قسم کی بغاوت کو برداشت نہیں کر سکتی، چاہے وہ تشدد پر مبنی ہو یا عدم تشدد پر نیز حکومت کسی ایسی جماعت کے نمائندے سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، جو اس قسم کی باتیں کرتی ہے اس انکار کے بعد، میرا بن وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری سے ملیں اور ان سے طویل گفتگو کی۔ اس وقت میں دہلی میں تھا انہوں نے اس گفتگو کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کیا، پھر وردھا واپس گئیں اور گاندھی جی سے اس ملاقات کا حال بیان کیا۔

اس کے فوراً بعد مہادیو دیسائی نے ایک بیان جاری کیا کہ معلوم ہوتا ہے گاندھی جی کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں یہ صحیح نہیں ہے کہ گاندھی جی نے برطانیہ کے خلاف کھلی بے تشدد بغاوت کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مہادیو دیسائی کے اس بیان پر مجھے کسی قدر حیرت ہوئی واقعہ یہ ہے کہ «بے تشدد انقلاب» کی اصطلاح جواہر لال نے ایجاد کی تھی اور پھر گاندھی جی بے تشدد انقلاب کی باتیں کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں اس کا کوئی مخصوص مفہوم رہا ہو، مگر عام پبلک نے ان کے اس بیان کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ کانگریس نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ بغیر تشدد کے (ہندوستان کی)

حکومت نے مطالبے کو تسلیم کر لیا، یا کم سے کم صلح جوئی کا رویہ اختیار کیا، تو مزید گفتگو کے لئے گنجائش رہے گی اور اگر اس کے برعکس حکومت نے مطالبے کو رد کر دیا، تو گاندھی جی کی رہنمائی میں اس کے خلاف ایک تحریک شروع کی جائے گی مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ حکومت گوارا نہ کرے گی کہ اسے ڈرا دھمکا کر گفتگو کی جائے۔ جو واقعات پیش آئے انہوں نے میرے اس قیاس کی تصدیق کر دی

وردھا میں بیرونی اخبارات کے نمائندوں کا ہجوم ہوگیا تھا انہیں ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ معلوم کرنے کی بہت فکر تھی ۱۵ جولائی کو گاندھی جی نے ایک پریس کانفرس بلائی ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر تحریک شروع کی گئی، تو وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک بے تشدد انقلاب ہوگا

رزولیوشن کے منظور ہونے کے بعد گاندھی جی کے سکریٹری مہادیو دیسائی نے مس سلیڈ سے کہا کہ انہیں وائسرائے سے مل کر رزولیوشن کے منشا کی وضاحت کرنا چاہئے مس سلیڈ ایک برطانوی امیر بحر کی لڑکی تھیں، مگر انہوں نے گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہو کر ہندوستانی طریقِ زندگی اختیار کر لیا تھا وہ عرف عام میں میرا بہن کہلاتی تھیں گاندھی جی کے انتہائی عقیدت مندوں میں سے تھیں اور ان کے آشرم میں کئی سال رہ چکی تھیں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ وائسرائے کو مجوزہ تحریک کی نوعیت اور اس کے طریق کار کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ مس سلیڈ وائسرائے سے ملنے کے لئے وردھا روانہ ہوئیں اور

سی پی، بمبئی اور دہلی پوری طرح تیار ہیں اور وہاں تحریک میں بہت زور اور طاقت ہوگی۔ آسام اُس وقت برطانیہ کی جنگی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور فوجی افسروں اور سپاہیوں سے بھرا پڑا تھا، اس لئے وہاں کسی قسم کا عملی اقدام ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن آسام جانے کے تمام راستے بنگال اور بہار سے گذرتے تھے، اس لئے ان دونوں صوبوں میں پروگرام کی اہمیت دو چند ہوگی، باقی صوبوں میں مناسب فضا پیدا کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی، مگر مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح صورت حال میرے سامنے واضح شکل میں نہیں تھی۔

وائسرائے نے میرا ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تو گاندھی جی نے محسوس کیا کہ حکومت آسانی سے جھکنے والی نہیں ہے، اس سے ان کے اعتماد کو دھکا لگا، مگر اب بھی ان کو یقین تھا کہ حکومت کوئی سخت قدم نہیں اٹھائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے بعد پروگرام تیار کرنے کے لئے کافی وقت مل جائے گا اور وہ بتدریج تحریک کی رفتار کو تیز کر سکیں گے۔ میں ان کی اس خوش فہمی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ ۲۸ جولائی کو میں نے ان کو ایک مفصل خط میں لکھا کہ حکومت پوری طرح تیار ہے اور بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے فوراً بعد کوئی قدم اُٹھائے گی۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ نتیجہ نکالنے میں مجھے جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہئے۔ وہ بھی صورت حال کا مطالعہ کر رہے ہیں اور انہیں اب بھی یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔

برطانوی حکومت کو مجبور کرنے کے تمام ذریعے استعمال کرے گی کہ وہ اقتدار سے دست بردار ہو جائے. میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ انگریز پر (ہمارے فیصلے کا) کیا اثر پڑے گا اور مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا جب وائسرائے نے گاندھی جی یا ان کے نمائندے سے ملنے سے انکار کر دیا. جب کہ ورکنگ کمیٹی طے کر چکی تھی ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ صورت حال پر غور کرنے کے لئے بلایا گیا.

۱۴ جولائی سے ۵ اگست تک میرا تمام تر وقت ملک کے مختلف حصوں کے کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کرنے میں صرف ہوا. میں ان کے ذہن نشیں کرنا چاہتا تھا کہ اگر حکومت نے ہمارا مطالبہ مان لیا یا کم سے کم ہمیں کام کرنے کا موقع دیا تو تحریک کے چلانے میں گاندھی جی کی ہدایتوں کی سختی سے پابندی کی جائے گی، اگر حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کرلیا، تو عوام کو اختیار ہوگا کہ وہ حکومت کے تشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے جو طریقہ بھی مناسب سمجھیں، خواہ تشدد یا عدم تشدد کا، اسے اختیار کریں جب تک لیڈر آزاد ہیں اور اپنے فرائض انجام دے سکتے ہیں، ملک میں جو کچھ ہوگا، وہ اس کے ذمہ دار ہوں گے، لیکن اگر حکومت ان کو گرفتار کر لے گی، تو اس کے نتائج کی ذمہ‌داری اسی پر ہوگی. ظاہر ہے کہ ان ہدایتوں کو خفیہ رکھا گیا تھا اور ان کی اشاعت کبھی نہیں کی گئی. اس وقت کی صورت حال کا جو نقشہ میرے سامنے تھا، وہ یہ تھا کہ بنگال، بہار، یوپی،

یہ ان کا وطن ہے، اس وجہ سے وہ اپنے میں اتنی طاقت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی زنجیروں کو توڑ سکیں اور نئے حملہ آور کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔

سوائے چند کمیونسٹوں کے، جنھوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تمام ممبروں نے ورکنگ کمیٹی کے تیار کئے ہوئے رزولیوشن کا خیر مقدم کیا گاندھی جی نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور دو روز کی بحث و گفتگو کے بعد، ۸ اگست کو رات گئے یہ رزولیوشن بھاری کثرت رائے سے منظور ہوگیا۔ رزولیوشن کا مکمل متن ضمیمہ میں درج ہے

میں بمبئی جاتا تو عام طور پر مرحوم بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں ٹھہرا کرتا تھا اس موقع پر بھی میں وہیں ٹھہرا تھا اس وقت وہ علیل تھے اور ان کی طبیعت کچھ عرصے سے ناساز تھی، اس لئے جب میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے سے واپس آیا اور معلوم ہوا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہیں تو کچھ تعجب ہوا رات کافی گزر چکی تھی، میں تھکا ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ سوگئے ہوں گے۔ میں نے ان کو اس قدر دیر تک جاگنے پر ہلکی سی فہمائش کی، مگر انھوں نے بتلایا کہ میرے ایک عزیز محمد طاہر، جن کا بمبئی میں کاروبار تھا، مجھ سے ملنے آئے تھے اور بہت دیر تک میرا انتظار کیا جب میں واپس نہیں آیا تو وہ میرے نام ایک پیغام چھوڑ کر چلے گئے ہیں محمد طاہر کے بمبئی پولیس میں ایک دوست تھے، ان سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ صبح سویرے تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کرلئے جائیںگے۔ طاہر کے دوست نے

۳ اگست کو میں کلکتہ سے بمبئی کے لئے روانہ ہوا مجھے پورا یقین تو نہ تھا، مگر دل یہ کہتا تھا کہ میں کلکتہ سے ایک طویل عرصے کے لئے جدا ہو رہا ہوں مجھے اس کی بھی اطلاعیں ملی تھیں کہ حکومت نے تمام انتظامات مکمل کرلئے ہیں اور اس کا ارادہ ہے کہ رزولیوشن منظور ہوتے ہی تمام لیڈر گرفتار کرلئے جائیں.

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۵ اگست کو منعقد ہوا، جس میں ۷ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لئے رزولیوشن کا ایک مسودہ تیار کیا گیا میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں، کمیٹی کی پچھلی میٹنگ سے اس وقت تک صورت حال میں جو تبدیلی ہوئی تھی، اس کا مختصر خاکہ پیش کیا اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان اسباب کی وضاحت کی، جنہوں نے ورکنگ کمیٹی کو اپنا رویہ بدلنے اور ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا تھا میں نے کہا کہ اس وقت اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے، ہماری قوم ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ نہیں سکتی ہندوستان نے جمہوری ممالک کے ساتھ تعاون کرنا چاہا تھا، مگر برطانوی حکومت نے بد قسمتی سے تعاون کی راہیں بند کردیں. اب صورت یہ ہے کہ جاپانی حملہ آور دروازے تک آگیا ہے، اس لئے قوم اپنے اندر حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنا چاہتی ہے برطانیہ اگر مناسب سمجھے تو ہندوستان کو خالی کرسکتا ہے، جیسے اس نے سنگاپور، ملایا اور برما کو خالی کردیا ہے، ہندوستانی ملک کو چھوڑ نہیں سکتے، کیونکہ

اور میں جلد ہی بستر پر لیٹ گیا۔

میں ہمیشہ سے صبح سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔ اگلی صبح کو بھی میں حسب معمول چار بجے اٹھا۔ مگر میری تھکاوٹ اب بھی باقی تھی اور سر بھاری بھاری سا تھا۔ میں نے اسپرین کی دو گولیاں کھائیں، چائے کی ایک پیالی لی اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ منظور شدہ رزولیوشن کی ایک نقل خط کے ساتھ پریزیڈنٹ روزولٹ کو بھیجی جائیگی ہم نے سوچا کہ پریزیڈنٹ روزولٹ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے میں جس قدر دلچسپی لے رہے ہیں، اس کے پیش نظر کم سے کم اتنا تو ہونا ہی چاہئے۔ میں نے پریزیڈنٹ روزولٹ کے نام خط لکھنا شروع کیا، مگر اسے ختم نہ کر سکا۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ سے یا شاید اسپرین کی وجہ سے نیند آنے لگی اور میں سونے کے لئے لیٹ گیا

میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ سویا ہوں گا کہ کسی نے چپکے سے میرا پاؤں دبایا میں نے آنکھیں کھولیں تو بھولا بھائی دیسائی کے صاحبزادے دھیرو بھائی دیسائی ایک کاغذ لئے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا ہے، قبل اس کے کہ دھیرو بھائی مجھے بتلائیں کہ بمبئی کا ڈپٹی کمشنر میری گرفتاری کا وارنٹ لایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کے ڈپٹی کمشنر برآمدے میں انتظار کر رہا ہے۔ میں نے دھیرو بھائی سے کہا کہ ڈپٹی کمشنر سے کہدیں کہ مجھے تیار ہونے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔

میں نے غسل کیا اور کپڑے پہنے۔ میں نے اپنے پرائیوٹ سکریٹری

یہ بھی بتلایا تھا کہ اسے یقین کے ساتھ تو نہیں معلوم ہے، مگر اطلاع یہ ہے کہ ہم سب کو ہندوستان کے باہر — غالباً جنوبی افریقا بھیج دیا جائیگا۔

اس قسم کی افواہیں کلکتہ میں روانگی سے قبل سے میں آئی تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ افواہیں بالکل بے بنیاد نہیں تھیں۔ جب حکومت نے ہم سب کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ بھی خیال آیا ہوگا کہ ہم کو ہندوستان میں رکھنا مصلحت کے خلاف ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں جنوبی افریقا کی حکومت سے گفتگو شروع کی گئی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عین وقت پر کوئی رکاوٹ پیش آگئی، جس کی وجہ سے بعد میں فیصلہ بدلنا پڑا۔ جلد ہی ہمیں معلوم ہوگیا کہ حکومت نے طے کیا ہے کہ گاندھی جی کو پونا میں نظر بند کیا جائیگا اور ہم لوگوں کو احمد نگر قلعہ میں قید کیا جائیگا۔

بھولا بھائی اس خبر سے سخت پریشان تھے اور اسی وجہ سے اب تک میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں بہت ہی تھکا ہوا تھا، اس لئے اس قسم کی افواہیں بیٹھ کر سننے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھولا بھائی سے کہا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو میرے پاس آزادی کے صرف چند گھنٹے باقی ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ میں جلد کھانا کھا کر سو رہوں تا کہ صبح کو جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے لئے تیار ہو جاؤں۔ بجائے اس کے کہ آزادی کے ان چند گھنٹوں کو افواہوں کے بارے میں قیاس آرائی میں صرف کروں، بہتر ہے کہ سو رہوں۔ بھولا بھائی نے اس سے اتفاق کیا

لائے ہیں اور وہ دوسرے ڈبے میں بیٹھائے گئے ہیں. ایک یوروپین
فوجی افسر نے آکر ہم سے پوچھا کہ چائے تو نہ پئیں گے ؟ میں
چائے پی چکا تھا، مگر اور منگوالی.

تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسرا فوجی افسر آیا اور اس نے ہم
لوگوں کو گننا شروع کیا. وہ کسی وجہ سے چکرایا ہوا سا تھا.
کیونکہ اس نے ہم لوگوں کو متعدد بار گنا جب وہ ہمارے ڈبے
میں آیا تو اس نے ذرا بلند آواز سے کہا « تیس ». جب اس نے
دو تین مرتبہ یہی کیا، تو میں نے اتنی ہی بلند آواز میں کہا
«۳۲» اس سے وہ اور پریشان ہوگیا، اور اس نے پھر گننا شروع
کیا. اس کے بعد ہی گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی چل پڑی.
میں نے مسز آصف علی کو پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا وہ اپنے شوہر
کو رخصت کرنے آئی تھیں جب گاڑی چلنے لگی تو انہوں نے میری
طرف دیکھا اور کہا « میری فکر نہ کیجئے گا، میں اپنے لئے
کوئی نہ کوئی کام نکال لوں گی. بے کار نہ بیٹھوں گی ». بعد کے
واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو کہا تھا، وہ کر
دکھلایا.

میں ابھی بتا چکا ہوں کہ ہماری گاڑی میں کوری ڈر تھا.
مسز نائیڈو ہمارے ڈبے میں آئیں اور کہا کہ گاندھی جی ہم سے
ملنا چاہتے ہیں. ہم کوری ڈر سے ہوتے ہوئے ان کے ڈبے میں گئے،
جو ذرا فاصلے پر تھا. گاندھی جی بہت ہی افسردہ نظر آرہے تھے.
میں نے کبھی ان کو اس قدر اُداس اور رنجیدہ نہیں دیکھا تھا. میں
سمجھ گیا کہ ان کو اس اچانک گرفتاری کا اندیشہ نہیں تھا. ان کا

محمد اجمل خاں کو، جو اس وقت تک اٹھ کر میرے پاس آچکے تھے، ضروری ہدایات بھی دیدیں. اس کے بعد میں برآمدے میں آیا، بھولا بھائی اور ان کی بہو ڈپٹی کمشنر سے باتیں کررہی تھیں میں نے مسکرا کر بھولا بھائی سے کہا کہ ان کے دوست پچھلی شام کو جو خبر لائے تھے صحیح نکلی پھر میں نے ڈپٹی کمشنر سے مخاطب ہو کر کہا « میں تیار ہوں » اس وقت پانچ بجے تھے.

میں ڈپٹی کمشنر کی کار میں بیٹھا ایک دوسری کار میں میرا سامان رکھا گیا اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلی ہم سیدھے وکٹوریا ٹرمنس آئے یہ لوکل گاڑیوں کا وقت تھا مگر اسٹیشن بالکل خالی تھا، شاید تمام گاڑیاں اور مسافر تھوڑی دیر کے لئے روک دئے گئے تھے جونہی میں کار سے اترا، اشوک مہتا نظر پڑے وہ بھی گرفتار کر لئے گئے تھے اور وکٹوریا ٹرمس لائے گئے تھے. اس سے میں سمجھ گیا کہ حکومت نے صرف ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو نہیں، بلکہ بمبئی کے مقامی کانگریسی لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا ہے، اور سارے ملک میں یہی کیا جا رہا ہوگا. پلیٹ فارم پر ایک گاڑی ہمارے انتظار میں کھڑی تھی. مجھے اس کے پاس لائے. اس وقت ایک انجن، گاڑی میں ڈائننگ کار لگا رہا تھا. یہ کوریڈر (Corridor) والی گاڑی تھی، جیسی کہ عام طور پر بمبئی اور پونا کے درمیان چلتی ہیں. میں ایک ڈبے میں پہنچا دیا گیا، جہاں میں کھڑکی کے پاس کی سیٹ پر بیٹھ گیا.

اس کے بعد فوراً ہی جواہر لال، آصف علی اور ڈاکٹر محمود نظر آئے. جواہر لال نے مجھے بتلایا کہ گاندھی جی کو بھی اسٹیشن

یہ معاملہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر لڑائی کی جائے۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بمبئی کا پولیس کمشنر، جو ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا، اندر آیا۔ اس نے ہم سے اپنے ڈبے میں جانے کے لئے کہا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ صرف مسز نائیڈو، گاندھی جی کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ جواہرلال اور میں اپنے ڈبے میں آگئے۔ ہماری گاڑی اس وقت تیزی کے ساتھ کلیان کی طرف جا رہی تھی، لیکن وہ کلیان میں نہیں ٹھہری اور پونا کا راستہ اختیار کرلیا۔ میں نے سوچا کہ غالباً ہم لوگ پونا میں نظربند کئے جائیں گے اور جب وہاں گاڑی رکی تو مجھے یقین ہوگیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گرفتاری کی خبر کسی طرح پونا پہنچ گئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف پولیس تھی اور پبلک میں سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی، البتہ پل کے اوپر بڑا اژدہام تھا۔ جونہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی، لوگوں نے «مہاتما گاندھی کی جے» پکارنا شروع کر دیا۔ جونہی لوگوں نے نعرے لگائے، کمشنر نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کو حکم دیدیا۔ اسے حکم ملا تھا کہ کسی قسم کے مظاہرے یا نعرے کی اجازت نہ دی جائے۔

جواہر لال کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے۔ جونہی انہوں نے دیکھا کہ پولیس لاٹھی چارج کر رہی ہے تو ڈبے سے باہر کود پڑے اور چلاتے ہوئے آگے بڑھے کہ «تمہیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے» پولیس کمشنر ان کے پیچھے لپکا اور اُنہیں ان کے ڈبے میں واپس لانے کی کوشش کی۔ جواہر لال نے اس کا

اندازہ یہ تھا کہ حکومت کوئی سخت کارروائی نہیں کرے گی۔ اگرچہ میں نے ان کو بار بار آگاہ کیا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں، مگر ظاہر ہے ان کو اپنی رائے پر زیادہ اعتماد تھا۔ اب چونکہ ان کے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے، وہ طے نہیں کر پاتے تھے کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔

ہم نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ گاندھی جی نے کہا «تم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی حکومت کو اطلاع کرنا کہ تم بحیثیت صدر کانگریس اپنے فرائض کو جاری رکھنا چاہتے ہو۔ اس مقصد کے لئے تم کو اپنے پرائیوٹ سکریٹری اور دوسری سہولتوں کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ جب تم پچھلی مرتبہ گرفتار ہوئے تھے اور نینی جیل میں نظر بند تھے، تو حکومت نے تم کو یہ سہولتیں مہیا کی تھیں۔ اسی قسم کی سہولتوں کا تم کو پھر مطالبہ کرنا چاہئے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کو ایک مسئلہ بنا لینا چاہئے»

میں گاندھی جی سے اتفاق نہ کرسکا۔ میں نے کہا کہ موجودہ صورت حال بالکل مختلف ہے۔ ہم نے اپنا راستہ جان بوجھ کر اختیار کیا ہے۔ اس لئے اس کے نتائج کو بھی برداشت کرنا چاہئے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آسکتی تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلے کے بارے میں لڑنے کو کہیں، جو کانگریس نے اٹھایا ہو، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اتنے معمولی مسئلے پر کہ مجھے خاص سہولتیں دی جائیں لڑنے کے لئے آمادہ ہو جاتا۔ میں اس مطالبہ کو حق بجانب نہیں سمجھتا تھا کہ کانگریس کے کاموں کو انجام دینے کے لئے پرائیوٹ سکریٹری رکھنے کی اجازت ملے۔ موجودہ حالات میں

جب گاندھی جی اُتار لئے گئے، تو پھر گاڑی روانہ ہوئی۔ اب
میں سمجھا کہ ہمیں احمد نگر لے جایا جا رہا ہے ہم دن کے
ڈیڑھ بجے اسٹیشن پر پہنچے سوائے چند پولیس افسروں اور ایک
فوجی افسر کے پلیٹ فارم پر کوئی نہیں تھا ہم سے اترنے کے لئے
کہا گیا اور کاروں پر سوار کر دیا گیا، جو ہمارا انتظار کر رہی
تھیں۔ کاریں فوراً روانہ ہو گئیں اور سیدھی جاکر قلعہ کے اندر
کے پھاٹک پر رکیں وہاں ایک فوجی افسر منتظر کھڑا تھا پولیس
کمشنر نے ایک فہرست نکال کر اسے دیدی۔ وہ ایک ایک نام
پکارتا گیا اور ہمیں قلعہ میں داخل کرتا گیا دراصل اس طرح
پولیس کمشنر ہم کو فوجی محکمے کے حوالے کر رہا تھا۔ اب سے
ہم فوجی حراست میں آگئے

کہنا نہیں سنا اور غصے میں باتیں کرنے لگے اس اثناء میں ورکنگ کمیٹی کے ایک اور ممبر، شنکر راؤ دیو، بھی پلیٹ فارم پر اُتر پڑے چار سپاہیوں نے ان کو گھیر لیا اور گاڑی میں واپس جانے کے لئے کہا جب اُنھوں نے جانے سے انکار کیا تو پولیس والوں نے ان کو زبردستی اٹھا کر ڈبے میں لائے۔ میں نے جواہر لال سے پکار کر کہا کہ اندر آجائیں۔ جواہر لال غصے سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے، مگر میری درخواست کو قبول کرلیا۔ پولیس کمشنر میرے پاس آیا اور دو تین مرتبہ اس نے معذرت کی «جناب والا، مجھے سخت افسوس ہے، مگر مجھے ان باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور میں ان کو بجا لانے پر مجبور ہوں»

میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ مسز نائیڈو اور گاندھی جی گاڑی سے اُتار لئے گئے ہیں بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ آغا خاں کے مکان میں، جو آغا خان محل کے نام سے مشہور ہے، نظر بند کیا گیا ہے۔ ایک اور شخص بھی جو بمبئی میں گرفتار کیا گیا تھا، گاڑی سے اترا اور پلیٹ فارم پر جانا چاہتا تھا۔ مگر پولیس نے اس کو روک دیا، پھر بھی وہ اس وقت تک باز نہیں آیا جب تک کہ پولیس نے اس کو پکڑ کر زبردستی نہیں روکا۔ میرا خیال ہے وہ گاندھی جی کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ موجودہ تحریک میں لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے کو رضاکارانہ طور پر گرفتار نہ کرائیں، بلکہ جب سختی اور زبردستی کی جائے، تب وہ جیل میں جانے پر راضی ہوں۔

یہ بات پسند نہیں آئی اور میں نے جیلر سے کہا کہ ہم چینی کی پلٹیوں میں کھانے کے عادی ہیں۔ جیلر نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آج تو ڈِزرسٹ کا انتظام نہیں ہو سکے گا، مگر کل ضرور ہو جائے گا۔ پونا سے جو قیدی کھانا پکانے کے لئے لایا گیا تھا، وہ ہماری پسند کے مطابق پکا نہیں سکتا تھا۔ وہ جلد ہی بدل دیا گیا۔ مگر نیا آدمی بھی اس سے کچھ بہتر نہیں تھا۔

ہماری نظر بندی کا مقام راز میں رکھا گیا تھا۔ مجھے یہ بات حماقت آمیز معلوم ہوئی، کیونکہ ایسی کوئی بات زیادہ عرصے تک چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ بہر حال حکومت کے اس طرز عمل پر زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ غالباً ایسے موقعوں پر سب حکومتیں حماقت کی باتیں کرتی ہیں۔

دو تین دن بعد بمبئی کے جیل خانوں کا انسپکٹر جنرل ہم کو دیکھنے آیا، اس نے ہمیں بتلایا کہ سرکاری حکم یہ ہے کہ ہمیں اپنے عزیزوں کو بھی خط لکھنے کی اجازت نہ دی جائے، کسی کا خط ہم کو نہ دیا جائے اور ہم کو کوئی اخبار بھی پڑھنے کو نہ ملے۔ اس نے بہت معذرت کی، مگر ساتھ ہی کہا کہ یہ احکامات بہت تاکیدی ہیں اور اسے ان پر عمل کرنا ہوگا۔ پھر بھی اس نے کہا کہ ہماری اور ضروریات کو وہ خوشی سے پورا کرے گا۔

۴ اگست کو جب میں کلکتہ سے بمبئی کے لئے روانہ ہوا تھا، تو طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مجھے انفلوئنزا تھا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے ایام میں بھی بخار رہا۔ حکومت کو بخوبی

قلعہ احمد نگر جیل

ورکنگ کمیٹی کے نو اور ممبر میرے ساتھ احمد نگر لائے گئے تھے، یعنی جواہر لال، سردار پٹیل، آصف علی، شنکر راؤ دیو، گووند بلبھ پنت، ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیا، ڈاکٹر سید محمود، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پروفلا گھوش. راجن بابو ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے مگر چونکہ بمبئی کے جلسے میں شرکت کے لئے نہیں آسکے تھے، اُس لئے ان کو پٹنہ میں گرفتار کرکے وہیں نظر بند کر دیا گیا.

ہم کو قلعہ کے اندر لے گئے، ایک ایسی عمارت میں جو فوجی بیرک معلوم ہوتی تھی. اس کا کوئی دو سو فٹ لمبا صحن تھا، جس کے چاروں طرف کمرے تھے. بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں غیر ملکی قیدی یہاں رکھے جاتے تھے. پونا سے ایک جیلر یہاں منتقل کر دیا گیا تھا. ہمارا سامان جب اُتارا جانے لگا، تو اس نے اس کی چیکنگ کی. میرے پاس ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا، جسے میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا میرا اور سامان اندر بھیج دیا گیا، مگر ریڈیو روک لیا گیا اور رہا ہونے کے وقت تک میں نے اسکی شکل نہیں دیکھی. ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر کے بعد، لوہے کی طشتریوں میں کھانا چنا گیا. ہمیں

لگ گئے۔ اس میں جواہرلال سب سے آگے آگے تھے۔ ہم نے
کوئی تیس یا چالیس قسم کے بیج بوئے، ان میں پانی دیا کرتے
اور کیاریوں کی برائی کیا کرتے۔ ہم نے بڑے ذوق اور محویت سے
پودوں میں کلی نکلتے دیکھا، جب پھول کھلنے لگے، تو صحن
حسن اور لطف کا مقام بن گیا۔

ہم کو قید خانے میں آئے کوئی پانچ دن ہوئے تھے، ایک
افسر آیا، جس کے متعلق، ہمیں معلوم ہوا کہ، ہماری دیکھ بھال
کے لئے جیل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے وہ شہر میں رہتا تھا
اور روزانہ آٹھ بجے صبح کو آتا اور شام کو چلا جاتا تھا
ہمیں اس کا نام معلوم نہیں تھا، اس لئے ہم لوگوں نے سوچا
کہ اس کا کوئی نام رکھنا چاہئے مجھے یاد پڑا کہ جب چاند بی بی
اسی جیل میں نظر بند تھیں تو ایک حبشی اُن کا جیلر تھا، جس کا
نام چیتا خاں تھا۔ میں نے تجویز کیا کہ ہمیں اپنے سپرنٹنڈنٹ
کا بھی یہی نام رکھنا چاہئے۔ میرے ساتھی خوشی سے مان گئے،
اور یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ ہر شخص اس کو چیتا خاں
کہنے لگا۔ مجھے تعجب ہوا، جب تین چار روز کے بعد جیلر نے
آکر بتایا کہ آج سویرے چیتا خاں چلا گیا ہے۔

جسے ہم چیتا خاں کہتے تھے، وہ اُس وقت پورٹ بلیر میں
تھا، جب جاپانیوں نے حملہ کرکے انڈمان کے جزیروں پر
قبضہ کرلیا۔

۲۵ اگست کو میں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا کہ مجھے
اس کی شکایت نہیں ہے کہ حکومت نے مجھے اور میرے رفقاء کو

اس کا علم تھا. اسپکٹر جنرل ڈاکٹر تھا اور میرا معائنہ کرنا چاہتا تھا، مگر میں اس پر راضی نہیں ہوا.

ہمارا دنیا سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا تھا اور بالکل نہیں معلوم تھا کہ قلعے کے باہر کیا ہو رہا ہے. ہم نے محسوس کیا کہ اپنی صحت اور ہمت کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنے کا پروگرام بنا لینا چاہئے میں لکھ چکا ہوں ہمارے کمرے ایک صحن کے چاروں طرف تھے میں ایک طرف کے پہلے کمرے میں تھا. اس کے بعد کے کمرے میں جواہر لال تھے اور تیسرے میں آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود اس طرف کا آخری کمرہ ڈائنگ روم تھا. ہم صبح کو آٹھ بجے ناشتے کے لئے ملتے، پھر گیارہ بجے دوپہر کے کھانے کے لئے، اس کے بعد سب لوگ میرے کمرے میں جمع ہوتے اور ایک دو گھنٹے مختلف موضوعوں پر بحث کیا کرتے پھر کچھ دیر آرام کرتے اور چار بجے چائے کے وقت پھر ملتے. چائے کے بعد صحن میں کچھ ورزش کرتے. رات کا کھانا آٹھ بجے ملتا تھا اور عام طور پر ہماری بحث و گفتگو دس بجے تک جاری رہتی اس کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے کمرے میں چلے جاتے.

ہم جب آئے تو صحن میں پھول پتی کا نام نہیں تھا جواہر لال نے تجویز پیش کی کہ اس میں پھول لگانے چاہئیں. اس طرح ہم مشغول رہ سکیں گے اور جگہ خوبصورت ہوجائیگی. یہ خیال ہم سب کو پسند آیا اور ہم نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ پونا سے بیج منگوادے. اس کے بعد ہم لوگ کیاریاں تیار کرنے میں

ہماری گرفتاری کے بعد ملک میں گڑبڑ اور شورش پھیل جائیگی۔ بنگال، بہار، یو۔پی۔ اور بمبئی کے صوبے حکومت کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش تھے، رسل و رسائل کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا تھا اور کارخانے بند کردئیے گئے تھے۔ تھانوں پر حملے ہوئے تھے اور وہ جلادئیے گئے تھے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر حملے کئے گئے اور بعض بعض مقامات پر وہ برباد کردئیے گئے تھے۔ فوجی لاریاں بھی بڑی تعداد میں جلا دی گئی تھیں۔ کارخانے بند ہونے کی وجہ سے جنگی سامان کی پیداوار یا تو ختم ہوگئی تھی یا بہت کم ہوگئی تھی۔ مختصراً حکومت کے بہیمانہ ظلم و تعدی کے خلاف پورا ملک اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور تحریک عدم تشدد کی پابند نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ میرے اندازے اور قیاس کے مطابق ہوا تھا اور ایک حد تک یہ وہی کام تھے، جن کے بارے میں کارکنوں سے گفتگو ہوئی تھی اور جنہیں کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۴۲ء کے باقی مہینوں میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔

سنہ ۱۹۴۳ء کے شروع میں فضا پھر بدلی۔ فروری میں ہم نے اخباروں میں پڑھا کہ گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا ہے کہ وہ اکیس دن کا برت رکھیں گے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ برت تزکیہ نفس کے لئے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ گاندھی جی کے اس اقدام کے دو بڑے سبب ہیں۔ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ گاندھی جی کو اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ حکومت کانگریسی رہنماؤں کو اس طرح گرفتار کر لے گی، بلکہ انہیں اتنی مہلت مل جانے کی امید

گرفتار کرنا مناسب سمجھا البتہ ہمارے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے، اس کی شکایت ضرور ہے۔ سزا یافتہ مجرموں تک کو اپنے قریبی عزیزوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت ہوتی ہے، مگر ہم کو اس سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ میں دو ہفتے انتظار کروں گا۔ اگر حکومت کی طرف سے اطمینان بخش جواب موصول نہ ہوا تو میں اور میرے رفقاء سوچیں گے کہ اس کے بعد کیا کارروائی کریں۔

۱۰ ستمبر کو چیتا خاں نے آکر اطلاع دی کہ حکومت نے ہمیں اپنے عزیزوں کو ہفتہ میں ایک مرتبہ خط لکھنے کی اجازت دیدی ہے اور ہمیں روزانہ ایک اخبار بھی مل جایا کرے گا۔ چنانچہ ٹائمز آف انڈیا میری میز پر رکھ دیا گیا اور اس کے بعد وہ برابر آتا رہا۔ اس رات کو میں دیر تک اخبار پڑھتا رہا ایک ماہ سے زیادہ ہوگیا تھا کہ ہم لوگوں کو کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اب ہمیں اپنی گرفتاری کے بعد کے واقعات اور جنگ کے حالات معلوم ہوئے۔

دوسرے روز میں نے چیتا خاں سے پچھلی تاریخوں کے اخبار مانگے۔ چونکہ حکومت نے اب اخبارات کی اجازت دیدی تھی اس لئے میرے مطالبے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چیتا خاں نے اس بات سے اتفاق کیا اور دو تین دن میں اس نے میری گرفتاری سے اس وقت تک کا ٹائمز آف انڈیا کا مکمل فائل مہیا کردیا۔

خبروں کے پڑھنے سے میرے اس قیاس کی تصدیق ہوگئی کہ

ہیں. حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا برت کے دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا، جب معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کے اندازے صحیح ثابت ہوں گے. گاندھی جی کے معالج بھی مایوس ہو گئے مگر گاندھی جی نے حکومت اور اپنے ڈاکٹروں کے تمام قیاسات کو غلط ثابت کر دیا انہوں نے قوت برداشت کی جو غیر معمولی صلاحیت دوسرے موقعوں پر دکھلائی تھی، اس نے اِس مرتبہ ایک کرشمہ کر دکھایا. ان میں ایسی جان تھی کہ وہ موت پر غالب آگئے، اور اکیس دن کے بعد انہوں نے برت کھولا.

گاندھی جی کے برت سے جو کھلبلی مچی تھی اس کے بعد ہم دوبارہ اپنے روز مرہ کے کاموں میں لگ گئے ان کے برت کے زمانے میں اسیری کی بے بسی ہم کو بہت گراں گزری. بیکسی کا یہ احساس دوسرے سال مجھے کچھ اور زیادہ شدت کے ساتھ ہوا.

میری بیوی کئی سال سے بیمار تھیں. ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں تھا، تو اُن کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی رہا ہونے کے بعد جب میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، تو انہوں نے آب و ہوا کی تبدیلی تجویز کی. وہ رانچی چلی گئیں اور جولائی ۱۹۴۲ء تک واپس نہیں آئیں. اس وقت ان کی صحت کچھ بہتر تھی، مگر اگست کے پہلے ہفتہ میں جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو ان کی صحت پھر تشویش ناک ہو گئی تھی. ۹ اگست کو میری گرفتاری کی خبر سے یقیناً ان کو بہت سخت صدمہ پہنچا ہوگا اور ان کی صحت نے، جو پہلے سے نازک تھی، ایک اور پلٹا کھایا. قید کے زمانے میں ان کی گرتی ہوئی صحت کی خبروں

تھی کہ عدم تشدد کے طریقوں پر، اپنے مخصوص خیالات کے مطابق تحریک کو آگے بڑھائیں۔ ان کی یہ دونوں توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ ملک میں جو کچھ ہوا تھا اس کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے اوپر لے لی تھی اور اب اپنے معمول کے مطابق کفارے کے لئے برت رکھنے کا منصوبہ سا رہے تھے۔ میں اور کسی مفروضے کی بنا پر اس برت کو ایک بامعنی فعل قرار نہیں دے سکتا تھا۔

حکومت نے ان کے اس اقدام کو بالکل ہی دوسری نظر سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسی عمر میں اور صحت کی موجودہ حالت میں وہ اکیس دن کا برت برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس کے نزدیک اس طرح برت رکھنے کے معنی موت کو دعوت دینا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گاندھی جی کا مقصد یہی ہے اور وہ حکومت کو اپنی موت کا ذمہ دار بنانا چاہتے ہیں بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ حکومت نے اس مفروضے پر تمام ضروری انتظامات کئے تھے۔ ان کے جانبر نہ ہونے کا اس درجہ یقین تھا کہ اس نے لاش کو جلانے کے لئے صندل کی لکڑی کا بھی انتظام کر لیا تھا اگر گاندھی جی اپنی موت کی ذمہ داری حکومت پر ڈالنی چاہتے تھے، تو حکومت کا جواب یہ تھا کہ وہ اس وجہ سے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ ان کی آخری رسم آغا خان محل میں، جہاں وہ نظر بند تھے، ادا کی جائے گی اور ان کی راکھ ان کے لڑکوں کو بھیج دی جائے گی۔

ڈاکٹر۔ بی۔ سی۔ رائے نے حکومت کو لکھا کہ وہ گاندھی جی کے برت کے زمانے میں ان کے مشیرطبی کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے

اپی رہائی کے اسباب نہ سمجھ سکے. غالباً ان کا خیال تھا کہ ان کی رہائی برطانوی پالیسی میں تبدیلی کا نتیجہ ہے. بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس مرتبہ بھی وہ غلطی پر تھے. برت کی وجہ سے ان کی صحت بالکل تباہ ہو گئی. تب سے انھیں برابر کوئی نہ کوئی شکایت رہی. پونا کے سول سرجن نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ دی کہ غالباً وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکیں گے. برت کو برداشت کرنے کی قوت ان میں نہیں تھی، اس وجہ سے سول سرجن کا خیال تھا کہ وہ چند دن کے مہمان ہیں، جب وائسرائے کو یہ رپورٹ ملی، تو اس نے گاندھی جی کو رہا کر دیا، تاکہ حکومت ان کی موت کی ذمہ دار قرار نہ دی جائے، اس کے علاوہ سیاسی حالات ایسے بدل گئے تھے کہ برطانوی حکومت کو اب ان سے کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا. جنگ خطرناک منزل سے گزر چکی تھی، اور اتحادی طاقتوں کو کامیابی کے لئے صرف وقت درکار تھا. حکومت نے یہ بھی سوچا کہ ایسی حالت میں جبکہ کانگریس کے تمام لیڈر جیل میں ہیں، گاندھی جی تنہا شاید ہی کچھ کر سکیں. دوسری طرف یہ ممکن تھا کہ ان کی موجودگی ایسے لوگوں کے لئے ایک رکاوٹ بن جائے، جو تشدد کے طریقے اختیار کر رہے تھے.

رہائی کے بعد کچھ عرصے تک گاندھی جی اتنے بیمار رہے کہ کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکتے تھے. چند مہینے علاج ہوتا رہا، جوں ہی وہ کچھ اچھے ہوئے، انھوں نے کئی سیاسی کارروائیاں شروع کر دیں، ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں.

نے مجھے بہت ہی پریشان رکھا۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے شروع میں گھر سے اطلاع ملی کہ وہ پھر بہت بیمار ہیں۔ اس کے بعد اور بھی وحشتناک خبر ملی۔ ان کے ڈاکٹر مایوس ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے خود ہی حکومت کو لکھا کہ مجھے بیوی سے ملنے کا موقع دیا جائے، اس لئے کہ ان کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔ ڈاکٹروں کے اس خط کو حکومت نے بالکل نظر انداز کیا میں نے بھی وائسرائے کو لکھا، مگر ہماری خط و کتابت بے نتیجہ رہی۔

اپریل میں ایک دن دوپہر کے وقت چیتا خاں میرے پاس آیا یہ بہت ہی غیر معمولی بات تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے مجھے ایک تار دیا۔ یہ مخفی تحریر میں تھا، مگر انگریزی میں اس کی نقل بھی ساتھ تھی۔ تار کلکتہ سے بھیجا گیا تھا، اور اس میں لکھا تھا کہ میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ حکومت ہند بڑی آسانی سے مجھے عارضی طور پر کلکتہ منتقل کر سکتی تھی تاکہ میں اپنی بیوی کو وفات سے قبل دیکھ لوں۔ اس خط کا مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

تین مہینے کے بعد قسمت نے ایک اور صدمہ پہنچایا۔ میری بہن آبرو بیگم، جو بھوپال میں رہتی تھیں، بیمار ہوگئیں اور تقریباً دو ہفتے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئی ہیں

اسی زمانے میں ہم نے اخباروں میں یکایک یہ خبر پڑھی کہ گاندھی جی رہا کر دئے گئے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ خود گاندھی جی

ہوئے ہیں، اور ان کی منت سماجت کرتے ہیں، تو ان میں سے بہت سے مسٹر جناح کی عزت کرنے لگے. انہوں نے یہ بھی سمجھا کہ غالباً یہی فرقہ وارانہ سمجھوتے میں مفید شرائط حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ بہتر آدمی ہیں.

یہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا کہ گاندھی جی پہلے شخص تھے، جنہوں نے مسٹر جناح کے لقب «قائد اعظم» کو رواج دیا. گاندھی جی کے آشرم میں ایک سادہ لوح مگر نیک خاتون تھیں، جن کا نام اُمت السلام تھا، انہوں نے کچھ اردو اخبارات میں مسٹر جناح کے نام کے ساتھ «قائد اعظم» لکھا ہوا دیکھا تھا جب گاندھی جی مسٹر جناح کو ملاقات کے لئے خط لکھ رہے تھے، تو انہوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائد اعظم کہتے ہیں، اس لئے آپ بھی اسی نام سے خطاب کیجئے ایک منٹ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے، گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائد اعظم کہہ کر خطاب کیا یہ خط جلد ہی اخبارات میں شائع ہوگیا جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائد اعظم کہتے ہیں، تو اُنہوں نے سوچا کہ وہ حقیقت میں یہی مرتبہ رکھتے ہوں گے.
جولائی سنہ ۱۹٤٤ء میں جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ گاندھی جی مسٹر جناح سے خط و کتابت کر رہے ہیں اور ان سے ملنے کے لئے بمبئی جا رہے ہیں تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں. ان کا یہ اقدام کسی مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے ہندوستانی سیاست کو اور بگاڑ دے گا. بعد کے واقعات نے میرے خدشوں کی تصدیق کر دی. مسٹر جناح

گاندھی جی نے مسلم لیگ سے از سرنو گفت و شنید کی کوشش کی اور مسٹر جناح سے ملاقات کا انتظام کیا، ان کی دوسری تحریک یہ تھی کہ حکومت سے نئے سرے سے بات چیت کا اہتمام کیا جائے۔ اپنے پچھلے بیانوں کے بالکل برعکس انہوں نے لندن کے اخبار نیوز کرانیکل کو یہ بیان دیا کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو وہ اپنی رضا و رغبت سے برطانیہ کا ساتھ دیگا اور جنگ کی سرگرمیوں میں جی جان سے مدد کرے گا۔ جب میں نے ان کے بیانات کو پڑھا تو حیران رہ گیا، مگر مجھے یقین تھا کہ ان دونوں اقدامات کا انجام ناکامی ہو گا۔

میرا خیال ہے کہ اس موقع پر مسٹر جناح سے گاندھی جی کا ملنا فاش سیاسی غلطی تھی اس کی وجہ سے مسٹر جناح کو نئی اور پہلے سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی، جس سے انہوں نے بعد میں پورا پورا فائدہ اُٹھایا دراصل گاندھی جی نے شروع ہی سے مسٹر جناح کے ساتھ عجیب و غریب طرز عمل اختیار کر لیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد کانگریس سے علیحدہ ہونے پر مسٹر جناح کی سیاسی حیثیت بہت کم ہوگئی تھی، اور ان کے، سیاسی زندگی میں، دوبارہ اثر پیدا کر لینے کا بڑا سبب گاندھی جی کی غلطیاں اور فروگذاشتیں تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسٹر جناح شاید ہی کسی اعلیٰ سیاسی مرتبے پر پہنچ پاتے، اگر گاندھی جی کا طرز عمل وہ نہ ہوتا، جو اُنہوں نے اختیار کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد کو مسٹر جناح اور ان کی پالیسی پر اعتبار نہیں تھا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ گاندھی جی مسلسل ان کے پیچھے لگے

کے نتیجہ کا کوئی اثر نہیں تھا پھر بھی برطانوی حکومت نے ان کی اعانت کی موجودہ پیش کش کا مطلب یہ لیا کہ برطانیہ کی ہمدردی کو حاصل کرنے کی اس وقت کوشش کی گئی ہے۔ جب اتحادی طاقتوں کی کامیابی یقینی ہوگئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اس پیش کش کو وہ اہمیت نہیں دی جس کی گاندھی جی امید رکھتے تھے اس کے علاوہ انگریزوں کو اب ہندوستان کی امداد کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی جتنی جنگ کے ابتدائی زمانے میں تھی اس وجہ سے بھی انہوں نے گاندھی جی کی تجویز سے بے اعتنائی برتی۔

اب جب کہ ۱۹۵۷ء میں، میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں اور اس سلسلے کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں گاندھی جی کے بعض قریب ترین پیروؤں کے طرزعمل میں حیرت انگیز کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پرفلا گھوش ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دینے کے لئے تیار ہوگئے تھے، جب کانگریس نے ایک رزولیوشن منظور کیا کہ اگر برطانیہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردے تو کانگریس جنگ کی سرگرمیوں میں امداد کرے گی۔ انہوں نے اس وقت مجھے لکھا تھا کہ ان کے لئے عدم تشدد عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ہندوستان کی آزادی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہے، لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو ان میں سے ایک شخص نے بھی نہیں کہا کہ ہندوستان کی فوج کو خدمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اس

نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور اپنی پوزیشن کو استوار کر لیا، مگر اپنے قول اور فعل سے ہندوستان کی آزادی کے مقصد کو کوئی مدد نہیں پہنچائی

گاندھی جی نے حکومت سے گفت و شنید کے سلسلے میں جو دوسرا قدم اٹھایا تھا وہ بھی بے وقت تھا۔ یاد ہوگا کہ جنگ کے چھڑنے پر میں نے کانگریس کو اس پر آمادہ کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی کہ وہ لڑائی کے معاملے میں حقیقت شناسی سے کام لے اور اثباتی طرز عمل اختیار کرے گاندھی جی کی اس وقت رائے یہ تھی کہ اگرچہ ہندوستان کی سیاسی آزادی بہت اہم ہے مگر عدم تشدد کے اصول پر قائم رہنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے انہوں نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ اگر ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لئے صرف یہی تدبیر ہے کہ جنگ میں شرکت کی جائے تو کم از کم وہ خود اس کو اختیار کرنے کئے تیار نہیں ہیں اب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ کانگریس برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کرے گی، اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا اس سے ان کے پچھلے خیالات کی مکمل تنسیخ ہوتی تھی اور ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ایک طرف ہندوستانی پریشان ہو گئے، دوسری طرف برطانیہ پر جو اثر ہوا، وہ اب بھی نا خوش گوار تھا۔ بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے اس وقت برطانوی حکومت کی اعانت سے پہلوتہی کی جب جنگ کا انجام مشتبہ تھا یہ خیال بہرحال غلط تھا، کیونکہ گاندھی جی کے خیالات پر جنگ

حکومت چلائی جائے اور یہ پالیسی میں جنگ کو خارج از بحث کیا جائے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں صرف جواہر لال تھے، جن کو مکمل طور پر میرے خیالات سے اتفاق تھا مجھے یقین ہے کہ تاریخی اسباب اور نتائج کے سلسلے نے جواہر لال کی اور میری پوری پوری تصدیق کی ہے۔

جون ۱۹۴۴ء میں ہم نے "ڈی ڈے" کے بارے میں خبریں پڑھیں اس وقت سے جنگ نے پلٹا کھایا اتحادیوں کی فتح یقینی طور پر نظروں کے سامنے تھی دنیا نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ زمانۂ جنگ میں سب سے بڑی شخصیت جو منظر عام پر آئی، وہ پریزیڈنٹ روزویلٹ کی ہے معلوم تھا کہ مستقبل کی جو تصویر ان کے ذہن میں تھی، وہ آہستہ آہستہ حقیقت کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے افریقہ اور ایشیا دونوں میں اتحادی طاقتیں فتح یاب ہوئی تھیں اور اب ہٹلر کے یورپی قلعہ کی طرف قدم بڑھا رہی تھیں مجھے اس پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا میری بہت پہلے یہ رائے تھی کہ پہلی جنگ عظیم کی طرح اس مرتبہ بھی جرمنی نے بیک وقت دو محاذوں پر لڑنے کی غلطی کی ہے دراصل ہٹلر نے جس دن سوویٹ روس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اسی دن اپنی تباہی و بربادی کے بیج بو دئے تھے۔ اب ہٹلر یا اس کی قوم کے لئے تباہی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اسی زمانے میں، ہمارے جیل خانے میں ایک غیر متوقع حادثہ پیش آیا چیتا خان نے ایک دن یہ اطلاع دی کہ اُسے ڈاکٹر سید محمود کی رہائی کے احکامات مل گئے ہیں۔ اس پر ہم

کے برعکس انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ ہندوستانی فوج کو تقسیم کیا جائے اور اسے حکومت ہند کے اختیار میں دے دیا جائے یہ مطالبہ اس وقت کے کمانڈر انچیف کی تجویز کے برخلاف تھا کمانڈر انچیف کی تجویز یہ تھی کہ تین سال تک فوج اور کمانڈر انچیف مشترک رہیں مگر ان لوگوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا اگر عدم تشدد واقعی ان کا عقیدہ تھا تو انہوں نے ایسی حکومت کی ذمہ داریاں کیونکر قبول کر لیں، جو فوج پر سالانہ سیکڑوں کروڑ روپے خرچ کرتی تھی؟ بلکہ ان میں سے بعض تو فوج کے اخراجات میں اضافہ چاہتے تھے، نہ کہ تخفیف اور آج اس کے اخراجات تقریباً دو سو کروڑ ہیں

مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ ان ساتھیوں اور دوستوں نے بیشتر سیاسی مسائل پر کبھی خود غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ وہ گاندھی جی کی اندھی تقلید کرتے اور جب کوئی مسئلہ اٹھتا تو وہ دیکھتے رہتے کہ گاندھی جی اس سے کیا اثر لیتے ہیں میں گاندھی جی کا احترام اور تحسین و توصیف کرنے میں ان میں سے کسی سے کم نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہوں، مگر میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ پوزیشن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ ہم آنکھ بند کرکے ان کی تقلید کریں یہ عجیب بات ہے کہ یہ احباب جس اصول کی خاطر ۱۹٤۰ء میں ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دینا چاہتے تھے، ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ وہ اسے بالکل ناممکن سمجھتے ہیں کہ فوج اور دفاع کے عظیم انتظامات کے بغیر ہندوستان کی

تھے که ہمساری اسیری کا رمانه حتم ہوںے والا ہے. ۱۹٤٤ء کے سب آحر میں، حکومت ہىد اس ىتیحه پر پہچی که اب ہمیں احمد نگر میں ىطر ىد رکھىے کی چنداں ضرورت ىہیں ہے ہمیں وہاں رکھىے کے کئی سبب تھے حکومت کا حیال تھا که ہم وہاں ىطر ىد کئے گئے تو کسی کو اس کا علم ىہیں ہوگا. اس کا یه بھی حیال تھا که اگر ہم کو سِول حیل میں رکھا گیا، تو ممکں ہے که ہم حیل کے ىاہر کے لوگوں سے رابطه قائم کر لیں فوح کی ىگرانی میں ىطر ىدی ہو گی، تو اسے روکا جا سکے گا. احمد ىگر کیمپ حیل میں صرف یوریی فوحی تھے اور وہ یقیىی طور پر ہمیں بیرونی دىیا سے رابطه ىه پیدا کرىے دیتے ہمارے پاس اس کا ثبوت موحود ہے که حوىہی ہم احمد ىگر پہچے تو حکومت کو فکر ہوئی که ىاہر کی دىیا سے ہمارا رابطه قائم ىه ہو سکے حں بیرکوں میں ہمیں رکھا گیا تھا، اں میں روشندان تھے، حں سے قلعه کا احاطه ىطر آتا تھا ہمارے پہچىے سے پہلے اں کو پوری طرح ىىد کر دیا گیا تھا، پلاسٹر اس قدر تازہ تھا که ہمارے پہچىے تک وہ سوکھا بھی ىہیں تھا ہم ىے اپىی ساڑھے تیں سال کی ىطر ىىدی کے رماىے میں شاید ہی کبھی ىاہر کے کسی ہىدوستاىی کو دیکھا ہو. ایک دو مرتبه اس عمارت کی معمولی مرمت کی ضرورت پیش آئی، مگر اس کے لئے بھی ہىدوستاىی مردوروں سے کام ىہیں لیا گیا. اس طرح مکمل طور پر دىیا سے ہمارا تعلق مىقطع کر دیا گیا تھا.

حکومت اس میں تو کامیاب ہوئی که ىاہر کی دىیا سے ہمارا کوئی تعلق پیدا ىه ہو، مگر اس کا پہلا مقصد پورا ىہیں ہوا.

سب متعجب تھے، کیونکہ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تنہا ان کو کیوں رہائی کا مستحق سمجھا گیا۔

چند مہینے ہوئے احمد نگر میں ہیضہ کی بیماری پھیلنے کا خطرہ تھا۔ چیتا خاں نے ہم سب کو ٹیکا لگوانے کا مشورہ دیا ہم میں سے پانچ یعنی جواہرلال، پٹا بھی سیتارمیا، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود اور میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ سردار پٹیل، آچاریہ کرپلانی شنکر راؤ دیو اور ڈاکٹر پرفولا گھوش نے اسے اپنے ضمیر کے خلاف ٹھہرا کر انکار کر دیا۔ ردّ عمل کے طور پر مجھے تھوڑا سا بخار ہو گیا، مگر ڈاکٹر محمود غالباً اس معاملے میں بہت حساس تھے، پندرہ دن تک ان کو غیر معمولی طور پر تیز اور مسلسل بخار رہا ہم سب کو ان کی فکر تھی اور جواہرلال نے اپنی طبعی ہمدردی کی بنا پر نرس اور مشیرکار کے فرائض انجام دئیے۔ بالآخر بخار تو اُتر گیا، مگر ان کے مسوڑھوں سے خون آتا رہا۔ وہ چیتا خاں کے زیر علاج تھے اور قریب قریب اچھے ہو چکے تھے جب ان کی رہائی کا حکم آیا۔ اس لئے اُن کی بیماری اُن کی رہائی کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی ہمارا خیال تھا کہ غالباً اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی ہے۔ اب حکومت کا رویہ اور نرم ہوگا، چنانچہ ڈاکٹر محمود کو صحت کی بنیاد رہا کیا گیا ہے۔ بعد میں مجھے صحیح وجہ معلوم ہوئی، مگر اب جبکہ اتنے سال گذر چکے ہیں، میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس ناخوشگوار واقعہ کی تفصیل بیان کی جائے۔

اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ نہیں معلوم تھا، مگر ہم محسوس کرتے

آرام کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا
جب میری منتقلی کا وقت آیا تو چیتا خاں نے کہا کہ چونکہ میری صحت ٹھیک نہیں ہے اس واسطے میرے لئے کلکتہ کی مرطوب آب و ہوا مناسب نہیں ہوگی اس نے اشارۃً کہا کہ مجھے بنگال کے کسی خشک مقام پر بھیجنا چاہئیے۔ ایک دن دوپہر بعد انہوں نے مجھ سے تیار ہونے کو کہا۔ جب میرا ساماں کار میں رکھا جا چکا، تو وہ مجھے احمد نگر اسٹیشن کے بجائے ایک میل کے فاصلے پر ایک دیہاتی اسٹیشن پر لے گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اگر میں احمد نگر سے روانہ ہوتا، تو سب کو فوراً خبر ہوجاتی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ میری آمد و رفت کے بارے میں کسی قسم کی تشہیر ہو۔

احمد نگر کے قید خانے میں میرا بیشتر وقت ذہنی اعتبار سے بہت گراں گزرا۔ اس کا میری صحت پر بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ گرفتاری کے وقت میرا وزن ۱۷۰ پونڈ تھا اور جب میں احمد نگر سے منتقل کیا گیا تو صرف ۱۳۰ پونڈ تھا، اشتہاء ختم ہوچکی تھی، بہ مشکل میں کچھ کھا سکتا تھا۔

بنگال سے ایک سی۔ آئی۔ ڈی۔ انسپکٹر مع چار کانسٹبل کے میرے ساتھ جانے کے لئے آیا تھا۔ جب ہم اسٹیشن پہنچے تو چیتا خاں نے مجھے ان کے حوالے کردیا۔ ہم نے احمد نگر سے آسنسول تک کلیان کے راستے سے سفر کیا آسنسول میں مجھے ریٹائرنگ روم میں ٹھہرایا گیا، جہاں میرے لئے مخصوص انتظام کیا گیا تھا۔ حکومت کی انتہائی کوشش تھی کہ سارا معاملہ

پبلک کو ہمارے پہنچنے کے ایک ہفتہ کے اندر معلوم ہو گیا کہ ہم سب کو قلعہ احمد نگر کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد واقعے کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ برطانیہ کی فتح اب نظروں کے سامنے تھی اس لئے حکومت ہند نے سوچا کہ اب ہمیں اس فوجی قید میں رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اور ہم کو بغیر کسی خطرے کے اپنے اپنے صوبوں کے سول قید خانوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے

سردار پٹیل اور شنکر راؤ دیو کو سب سے پہلے منتقل کر کے پونا جیل میں بھیج دیا گیا۔ آصف علی کو بنالا بھیجا گیا، جہاں عام طور پر دھلی کے سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ جواہر لال کو پہلے الہ آباد کے قریب نینی بھیجا گیا، اس کے بعد الموڑا۔ جواہر لال نے روانگی کے وقت کہا کہ غالباً ہماری رہائی کے دن قریب آرہے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ رہا ہونے پر فوراً ہی ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ نہ بلائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ آرام اور تفریح کے لئے کچھ وقت چاہتے ہیں اور اس کتاب کو جو وہ ہندوستان پر لکھ رہے ہیں، مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے جواہر لال سے کہا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ مجھے بھی آرام اور صحتیابی کے لئے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ مجھے اس وقت کی کیا خبر تھی کہ ہم ایسے حالات میں آزاد کئے جائیں گے کہ فوری اور ہیجانی سیاسی اقدامات ضروری ہوں گے اور ہماری زندگی کا جو بچا کھچا حصہ ہے، شاید اس میں

میرے لئے چھتری کا بھی انتظام کیا تھا۔ انسپکٹر اسے پکڑے ہوئے تھا اس خیال سے کہ مجمع مجھے دیکھ نہ لے، اُس نے چھتری کو اس قدر نیچے کرلیا کہ تقریباً میرے سر پر رکھ دی اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ میرا چہرہ نہ دیکھ پائیں اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے میرے ڈبے میں پہنچا دیں گے اور لوگوں کو خبر بھی نہ ہوگی مجھے لوگوں سے ملنے کی کوئی خاص خواہش نہیں تھی مگر جب میں نے دیکھا کہ کلکتہ، الہ آباد اور لکھنؤ سے لوگ محض مجھے دیکھنے کے لئے آئے ہیں تو میں نے سوچا کہ یہ بہت ہی نامناسب بات ہوگی کہ یہ لوگ میری ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکیں۔ اس لئے میں نے انسپکٹر سے چھتری لے لی اور اس کو بند کردیا۔ لوگ میری طرف دوڑ پڑے، لیکن میں نے انہیں روک دیا، ظاہر ہے میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ ہر ایک سے فرداً فرداً ملوں، اس لئے میں نے اجتماعی طور پر سب سے خطاب کیا اور ہنس کر کہا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹروں کی پریشانیاں دم بہ دم بڑھتی جا رہی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ گرمی میں ان کو درد سر ہوجائے۔

میں نے لوگوں کو ہاتھ اٹھاکر خدا حافظ کہا اور اپنے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ مجمع چاروں طرف سے اُمڈ پڑا۔ پلیٹ فارم پر جو لوگ تھے ان کے علاوہ بہت سے لائن پار کرکے میرے ڈبے کے دوسرے طرف آ گئے، جلد ہی گاڑی روانہ ہوگئی اور سات بجے تک ہم لوگ بنکورا پہنچ گئے۔ بنکورا کے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دوسرے افسر مجھے اسٹیشن پر ملے اور شہر کے باہر

صیغۂ راز میں رہے، مگر پھر بھی اخباروں نے کسی نہ کسی طرح پتہ چلا ہی لیا اور مجھے آسنسول میں کلکتہ کے کچھ نامہ نگار اور الہ آباد کے کچھ احباب نظر آئے مقامی لوگوں کا ایک مجمع بھی اکٹھا ہو گیا تھا

آسنسول کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا اور مجھ سے ذاتی طور پر درخواست کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں پبلک سے ملنا چاہوں تو وہ مجھے روکے گا نہیں، لیکن میں نے ایسا کیا تو حکومت اس سے سخت باز پرس کرے گی، اس لئے وہ بہت ممنون ہوگا، اگر میں اوپر کی منزل پر چلا جاؤں اور پبلک سے نہ ملوں میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا یا حکومت کی نظر میں معتوب کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں اس کے ساتھ اوپر کے کمرے میں چلا گیا

سپرنٹنڈنٹ پولیس کا نواب ڈھاکہ سے کچھ رشتہ تھا انھوں نے اور ان کی بیوی نے میری خاطر مدارات کی. ان کی بیوی نے اصرار کے ساتھ میرے آٹو گراف لئے اور دونوں نے مجھے آرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں سکورا بھیجا جاؤنگا کوئی ٤ بجے شام کو گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اور تھوڑی دیر بعد مجھے میرے کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا. اس وقت پلیٹ فارم پر آدمیوں کا بڑا ہجوم ہو گیا تھا. مقامی لوگوں کے علاوہ بہت سے لوگ کلکتہ، الہ آباد اور لکھنؤ سے آئے تھے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ان کے اسپکٹروں کو بہت فکر تھی کہ میں لوگوں سے نہ ملوں دھوپ بہت تیز تھی اس لئے پولیس نے

ہو گیا ہے۔ سکورا کے ڈسٹرک مجسٹریٹ نے مجھے دوسرا ریڈیو عنایت کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد میں نے براہ راست دوسرے ملکوں کی خبریں سنیں۔

اپریل کے آخری دنوں میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ آصف علی نینی تال جیل میں بہت سخت بیمار ہیں۔ وہ بہت دیر تک بے ہوش رہے اور ان کے بچنے کی امید نہیں رہی اس کی وجہ سے حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان کو رہا کرکے دہلی واپس بھیج دیا جائے۔

مئی سنہ ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر مزید مشورہ کرنے کے لئے انگلستان گئے۔ مئی کے آخر میں وہ ہندوستان واپس آئے جون کی ایک شام کو میں نے ریڈیو پر دہلی کی خبروں میں سنا کہ وائسرائے نے اعلان کیا ہے کہ برطانیہ کی سابقہ یقین دہانیوں کے مطابق ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لئے از سر نو کوشش کی جائیگی۔ شملہ میں ایک کانفرنس ہوگی جس میں شرکت کے لئے کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو بلایا جائے گا۔ کانگریس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہا کر دئے جائیں گے، تاکہ وہ اس کانفرنس میں شرکت کر سکیں۔

دوسرے روز میں نے سنا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی رہائی کے احکامات جاری کئے جا چکے ہیں میں نے یہ خبر کوئی نو بجے رات میں سنی تھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی ریڈیو پر یہ خبر سنی، تو دس بجے رات میں مجھے یہ پیغام بھیجا کہ اگرچہ انہوں نے یہ خبر سنی ہے، مگر ابھی سرکاری طور پر انہیں کوئی

ایک دو منزلہ بنگلہ میں لے گئے۔

یہ اپریل کا شروع تھا اور دن بدن گرمی بڑھتی جا رہی تھی مگر جب میں شام کو دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھتا تو چہرے پر ہوا کے خوش گوار جھونکے لگے، صبح اور شام زیادہ ناگوار نہ ہوتی تھی مگر دن کے وقت گرمی بہت بڑھ جاتی تھی میرے پاس بجلی کا پنکھا تھا اور برف بھی مل جایا کرتی تھی مگر دوپہر میں اتنی سخت گرمی پڑتی کہ ان سے بہت کم فائدہ پہنچتا کلکٹر ہفتہ میں ایک مرتبہ میرے پاس آیا کرتا ایک دن اس نے بتلایا کہ اس نے حکومت کو لکھا ہے کہ اب مجھے بنکورا میں نہیں رہنا چاہئے۔ اسے جواب کا انتظار ہے، جونہی موصول ہوگا، وہ مجھے کسی ٹھنڈی جگہ بھیج دے گا،

اچھے باورچی کا ملنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ بنکورا میں بھی شروع میں یہی دقت پیش آئی مگر جلد ہی ایک اچھا باورچی مل گیا۔ مجھے یہ اس قدر پسند آیا کہ رہا ہونے کے بعد اس کو کلکتہ لے آیا

میں لکھ چکا ہوں کہ جب میں قلعہ احمد نگر جیل میں داخل ہوا تھا تو میرا ریڈیو مجھ سے لے لیا گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد چیتا خاں نے اس کو استعمال کرنے کی اجازت مانگی میں نے خوشی سے اس کو اجازت دیدی جب تک احمد نگر میں رہا، دوبارہ ریڈیو دیکھنے میں نہیں آیا جب مجھے بنگال منتقل کیا جا رہا تھا تو میرے اسباب میں ریڈیو بھی رکھ دیا گیا۔ مگر جب میں نے اس کو استعمال کرنا چاہا، تو معلوم ہوا کہ وہ خراب

نے ان سے کہا کہ یہ خوشی منانے کا وقت نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ میں آزاد ہو گیا ہوں، مگر ہزاروں، میرے دوست اور ساتھی اب بھی جیل میں ہیں

میری درخواست پر بینڈ بجانا بند ہو گیا اور وہاں سے ہٹا دیا گیا جس وقت کار پُل پر سے گذر رہی تھی، مجھے گذرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا، جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا. میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں. اب میں تین سال کے بعد واپس آرہا تھا، مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا.

مگر وہ اب اپنی قبر میں ہے اور ہائے
میری دنیا کیسی بدل گئی ہے

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا. کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں اُن کی قبر پر جانا چاہتا تھا میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی میں نے ان میں سے ایک ہار لیکر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا.

حکم نہیں ملا ہے۔ جوں ہی ان کو حکم ملیگا، وہ مجھے اطلاع کر دیں گے۔ چنانچہ آدھی رات میں جیلر نے آکر اطلاع دی کہ رہائی کے احکامات آگئے ہیں۔ اتنی رات گئے کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے دوسرے روز صبح سویرے ڈسٹرک مجسٹریٹ مجھ سے ملنے آیا اس نے رہائی کا حکم پڑھکر سنایا اور مجھے بتایا کہ کلکتہ اکسپریس پانچ بجے شام کو سکورا سے روانہ ہوتی ہے۔ اس میں ایک فرسٹ کلاس کوچ میرے لئے ریزرو کرایا جا رہا ہے۔

چند گھنٹوں میں کلکتہ سے نامہ نگار مجھ سے ملنے کے لئے آپہنچے۔ ہزاروں کی تعداد میں مقامی عوام بھی جمع ہو گئے۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو مقامی کانگریس کمیٹی نے ایک پبلک میٹنگ کا انتظام کیا، جس میں میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ میں اکسپریس سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوا اور دوسرے روز صبح کو ہوڑا پہنچا۔

ہوڑا اسٹیشن اور پلیٹ فارم پر انسانوں کا سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ میں بڑی ہی مشکلوں سے اپنے ڈبے سے باہر نکلا اور کار میں سوار ہوا۔ بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبانیا پربھا دتّا اور متعدد دوسرے مقامی لیڈر میرے ساتھ کار میں تھے۔ ہم روانہ ہونے والے ہی تھے کہ میری نگاہ بینڈ بجانے والوں پر پڑی، جو میری کار کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے مسز دتّا سے پوچھا کہ وہ بینڈ باجا کس لئے آیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میری رہائی کی خوشی منانے کے لئے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ میں

اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں ہمارے قید کئے جانے کا چین اور متحدہ ریاستوں (امریکہ) پر جو اثر پڑا وہ برطانیہ کے حق میں اچھا نہیں تھا اس وقت ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی، مگر بعد کو پتہ چلا کہ ان ملکوں کے لوگوں نے برطانیہ کی اس حرکت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا واشنگٹن میں سینیٹ اور ہاؤس آف ریپریزنٹے ٹیوس، (House of Representatives) دارالعوامین نے اس مسئلے پر بحث کی اور بہت جوشیلی تقریریں کیں۔

یورپ میں جنگ کی صورت بہتر ہونے لگی تو امریکیوں نے پھر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کیا جائے۔ لارڈ ویول کے مئی سنہ ۱۹۴۵ء میں لندن جا کر وزیر ہند سے اس بارے میں مشورہ کرنے کا کہ اب ہندوستان میں کیا کیا جائے، ایک سبب امریکہ کا یہ دباؤ ہوگا تب یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک گول میز کانفرس بلائی جائے اپریل میں یورپ میں جنگ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ لیکن ایشیا میں اس کے جلد بند ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ جاپانیوں کا اب بھی ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ تھا اور خود جاپان کو جنگ سے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا تھا اب تک امریکہ کی طاقت بیشتر یورپی میدان جنگ میں لگائی جاتی رہی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی شکست کے آثار نظر نہیں آرہے تھے مگر متحدہ ریاستوں کے لئے جاپان کی شکست کا معاملہ جرمنی کی شکست سے بھی زیادہ اہم تھا اسی وجہ سے پریزیڈنٹ روزولٹ نے مارشل سٹالن سے وعدہ لیا تھا کہ یورپ میں جنگ ختم ہوتے ہی روس جاپان پر حملہ

شملہ کانفرنس

لڑائی شروع ہونے پر امریکہ کے اہل رائے اس بات کو تسلیم کرنے لگے کہ جب تک ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل نہ ہوگا، تب تک جنگ کی سرگرمیوں میں ہندوستان کی پوری تائید حاصل نہ ہو سکے گی. اس وجہ سے وہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ہندوستان کو آزاد کر دے. پرل ہاربر پر جاپانی حملہ کے بعد متحدہ ریاستیں خود جنگ میں مبتلا ہو گئیں پریزیڈنٹ روزولٹ نے بار بار مسٹر چرچل کے سامنے اس مسئلے کو اٹھایا، اور شاید انگریز محسوس کرنے لگے کہ امریکیوں کے مطالبے کو پورا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا جب کرپس مشن ہندوستان آیا تو بی. بی سی کی خارجی سروس نے بار بار اعلان کیا کہ اب ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے اور جنگ کے بارے میں اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنے کا موقع ملا ہے. پریزیڈنٹ روزولٹ کا خاص اپنا نمائندہ ہی ان کا خط میرے نام لے کر آیا. اس خط میں انہوں نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کرپس مشن کو منظور کر لے گا اور جنگ میں جمہوری ریاستوں کی طرف سے شریک ہو جائے گا لیکن کرپس مشن ناکامیاب ہوا اور صورت حال وہی رہی جو پہلے تھی.

ہے؟ میں نے الٹ کر جواب دیا کہ میں نے نہ چارٹر دیکھا ہے نہ یہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہے۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ غالباً وہ اس مشہور بیان کی طرف اشارہ کر رہے ہوں گے جو پریزیڈنٹ روزولٹ نے مسٹر چرچل سے گفتگو کرنے کے بعد شائع کیا تھا۔ پریزیڈنٹ نے کہا تھا کہ جنگ ختم ہو جانے پر تمام ملکوں کو خود مختاری کے اصول کے مطابق اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا جب پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل سے سوال کیا گیا کہ کیا ہندوستان کا مستقبل بھی اسی بیان کے مطابق طے ہو گا تو انہوں نے بہت زور اور قطعیت کے ساتھ جواب دیا تھا «نہیں»۔ وہ ایک نہیں تین مرتبہ اعلان کر چکے ہیں کہ اس نام نہاد چارٹر کا ہندوستان پر اطلاق نہ ہو گا، اور یہ بات واضح کر دی ہے کہ پریزیڈنٹ کے بیان میں ہندوستان کا مسئلہ مد نظر نہیں تھا۔ جب پریزیڈنٹ کو مسٹر چرچل کے اس جواب کی طرف توجہ دلائی گئی تو انہوں نے اس کا اقبال کیا کہ گفتگو زبانی ہوئی تھی اور اس کا کوئی تحریری رکارڈ نہیں ہے۔ اس لئے اس بیان کو چارٹر کہنا غلط ہو گا

امریکی نامہ نگار ان واقعات سے ناواقف نہیں تھے اس لئے جب میں نے پوچھا کہ چارٹر کہاں ہے اور کیا ہے تو وہ مسکرا دئیے نامہ نگاروں میں ایک خاتون بھی تھیں انہوں نے پوچھا کیا کہ چارٹر کے وجود کے بارے میں میرے خطیبانہ سوال کا اشارہ پریزیڈنٹ کے اس بیان کی طرف ہے کہ چرچل سے جو سمجھوتا ہوا تھا وہ

کرے گا امریکیوں نے یہ بھی خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کی پوری مدد حاصل ہو تو جاپان کو شکست دینا بہت زیادہ آسان ہو جائے گا جاپان برہما، سنگاپور اور انڈونیشیا پر قابض تھا۔ ان تمام علاقوں میں ہندوستان کی مدد بہت ہی کارآمد ہو سکتی تھی یورپ میں ہٹلر کی طاقت کو مٹا دیا گیا تھا، لیکن جاپان کو جلد شکست دینے کے لئے ہندوستان کا تعاون ضروری تھا امریکیوں کے اصرار کی یہ ایک بہت بڑی وجہ تھی

کلکتہ اس وقت مشرق میں امریکی فوجوں کے سب سے بڑے مرکزوں میں سے تھا، اور اس وجہ سے وہ امریکی نامہ نگاروں اور فوجی افسروں سے بھرا ہوا تھا میری رہائی کے بعد وہ سب مجھ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے اور کلکتہ پہنچنے کے ایک دن بعد میں نے ان میں سے بعض سے اپنے یہاں ملاقات کی انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کئے بغیر فوراً نفس معاملہ پر گفتگو شروع کر دی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وائسرائے جو تجویز لایا ہے اس سے کانگریس کیا اثر لے گی؟ میں نے جواب دیا کہ میں کوئی قطعی بات نہ کہہ سکوں گا جب تک کہ مجھے تجویز کی تفصیلات معلوم نہ ہوں یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب تک ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط ہے اس وقت تک ہندوستانی جنگ میں شرکت کا شوق پیدا نہ کر سکیں گے۔ اگر کسی شخص کے ہاتھ پیر بندھے ہوں تو وہ ہاتھ پیر باندھنے والے کے دشمن سے لڑنے کا حوصلہ کیونکر کرے گا۔ انہوں نے اس کے جواب میں پوچھا کہ کیا اٹلانٹک چارٹر میں ہندوستان کی آزادی کا ذمہ نہیں لیا گیا

انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کو حکومت کا کام چلانے کو دیا جائے گا تو مسٹر ایمیری نے جواب دیا کہ وہ کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کو حکومت قائم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں. کانگریس کو پورا پورا اختیار ہوگا کہ جسے چاہے اپنا نمائندہ بنائے، مولانا آزاد کو یا پنڈت نہرو کو

اس بیان نے ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال پیدا کیا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کیا جانے والا ہے لوگ اب سمجھتے تھے کہ کانگریس کا پیش کش کو منظور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس روزانہ سینکڑوں خط اور تار آنے لگے جن میں اس پر اصرار ہوتا تھا کہ کانگریس پیش کش کو منظور کر لے. ملک کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں نے ایک مختصر سا بیان پریس کو بھیجا کہ کانگریس نے کبھی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس ایسے موقعوں کا خیر مقدم کیا ہے اب اگر اس کا امکان پیدا ہوا کہ ہندوستان اپنے سیاسی اور انتظامی مستقبل کی خود تعمیر کرے، تو میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اس چیلنج کو قبول کیا جائے میں نے صاف صاف کہا کہ ہم معاملات کو تعمیر کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، تخریب کی نظر سے نہیں دیکھتے

رہائی کے ایک دن بعد کلکتہ میں مجھے وائسرائے کی طرف سے گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، جو ۲۵ جون کو شملے میں ہونے والی تھی میں نے جواب دیا کہ میں ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ بمبئی میں ۲۰ جون کو کرنے والا ہوں، اور ورکنگ کمیٹی

تحریری شکل میں موجود نہیں ہے۔

میں نے کہا، «ظاہر ہے میرے ذہن میں یہی بات تھی»۔

نامہ نگاروں کا آخری سوال یہ تھا کہ اگر کانگریس نے ویول کی تجویز کو منظور کرلیا تو کیا میں ہندوستانیوں کی لازمی بھرتی کی تائید کروں گا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر ہندوستان کو آزادی کا یقین دلا دیا گیا تو وہ اپنی خوشی سے جنگ میں شریک ہو جائے گا۔ اس وقت ہمارا پہلا فرض ہوگا کہ پوری قومی طاقت کو کام میں لائیں اور لازمی بھرتی کی تائید کریں۔

میں نے نامہ نگاروں کو ایک بیان یاد دلایا جو میں نے سنہ ۱۹۴۰ء، یعنی جنگ کے ابتدائی زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے دیا تھا۔ میں نے اس وقت اعلان کیا تھا کہ اگر ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل ہو گیا تو وہ صرف اپنی خوشی سے جنگ میں شریک نہیں ہوگا بلکہ جبری بھرتی کا طریقہ اختیار کرکے ہر تندرست نوجوان کو جنگ کے محاذ پر بھیجے گا ہماری پیش کش جمہوریت کے لئے جینا ہی نہیں بلکہ اس کے لئے جان دینا بھی تھا۔ میں نے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ انگریزوں نے میری پیش کش کو قبول نہیں کیا اور ہم عزت کے ساتھ مرنے کے موقع سے بھی محروم رہے۔

۱۴ جون سنہ ۱۹۴۵ء کو مسٹر ایمیری وزیر ہند نے دارالعلوم میں ایک بیان دیا جس میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے جنگ کے بارے میں طے کرنے کا موقع دیا جائے گا اس کے بعد جب دریافت کیا گیا کہ کیا

کے یہاں ٹھہرا. کمرہ وہی تھا جہاں ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار کیا گیا تھا میں برآمدہ میں بیٹھا اور دوستوں سے باتیں ہونے لگیں تو یقین نہیں آتا تھا کہ تین برس گذر گئے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں کل ہی ان لوگوں سے ملا تھا اور ۹ اگست کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ سب خواب و خیال تھے. گرد و پیش کی چیزیں وہی تھیں، دوست وہی تھے اور وہی بحر عرب دور افق تک اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھا.

گاندھی جی اپنے دستور کے مطابق برلا ہاؤس میں ٹھہرے تھے اور ورکنگ کمیٹی کا جلسہ وہیں ہوا میں نے کمیٹی کو اس دعوت کے بارے میں مطلع کیا جو شملہ کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے بھیجی گئی تھی کمیٹی نے وائسرائے کے خط پر غور کرکے فیصلہ کیا کہ میں گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی کرنے کا مختار کیا جاؤں اس کی اطلاع وائسرائے کو کی گئی اور انھوں نے بمبئی سے ہمارے سفر کا انتظام کیا مجھے انبالہ تک پہنچانے کے لئے ایک ہوائی جہاز دیدیا گیا اور انبالہ سے شملہ تک کا سفر میں نے موٹر میں کیا یہ اور بتادوں کہ بمبئی سے روانگی سے پہلے ہی مجھے وائسرائے کے پاس سے اس خط کا جواب مل گیا جو میں نے کلکتہ سے لکھا تھا. وہ کانفرنس سے پہلے مجھ سے ملاقات کرنے پر خوشی سے راضی ہوگئے، مگر خط و کتابت کی اشاعت کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ چونکہ میں خود شملہ آرہا ہوں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ملاقات کے وقت اس پر گفتگو کریں.

ان کے خط پر غور کرکے اپنے نمائندے مقرر کرے گی. میں نے یہ بھی لکھا کہ میں کانگریس سے پہلے ان سے ملنا چاہتا ہوں اور دریافت کیا کہ انہیں اعتراض تو نہ ہوگا اگر میں اس خط و کتابت کو شائع کردوں جو میرے اور ان کے درمیان ہوئی تھی جب میں قلعہ احمد نگر جیل میں تھا

اس زمانے میں میری صحت بہت خراب تھی. میرا وزن چالیس پاؤنڈ کم ہو گیا تھا اور مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا تھا مجھے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور قوے جیسے شل ہو گئے تھے. ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وائسرائے سے کانگریس کو کم از کم دو ہفتے کے لئے ملتوی کرنے کی درخواست کروں، کیونکہ اس سے مجھے علاج اور طبیعت کو بحال کرنے کا موقع مل جائے گا. مگر میں نے اتنے اہم جلسے کو محض اپنی تندرستی کی خاطر ملتوی کرانا مناسب نہیں سمجھا

میں نے بنگال کی لیجس لیٹو کاؤنسل کے ایک ممبر رکن ہمایوں کبیر سے کانگریس کے دوران میں اپنے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کو کہا، اور اس طرح رفاقت کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو اب تک قائم ہے. میں نے ان کو پہلے سے جواہر لال کے نام پیغام دے کر بمبئی بھیج دیا. جواہر لال سے میں نے کہا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کے جلسے سے پہلے ہم دونوں کو مل کر اپنا طریقِ کار طے کر لینا چاہئے انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا، اس لئے کہ ان کے اپنے ذہن میں بھی یہی خیال تھا.

میں بمبئی ۲۱ جون کو پہنچا، اور حسب معمول بھولا بھائی دیسائی

کریں گے کہ وائسرائے کاؤنسل کے مشورے پر عمل کرے۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ حکومت پر اعتبار کیا جائے اور کہا کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان کا مسئلہ حل کر دیا جائے۔ اب چونکہ لڑائی ختم ہونے والی ہے، ہندوستان کا اس میں فائدہ ہے کہ جنگ کو ایک کامیاب انجام تک پہنچانے کے لئے انگریزوں کے ساتھ تعاون کرے۔ پھر انھوں نے مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت ضروری ہوگی۔

میں نے صاف صاف کہا کہ لیگ سے مفاہمت ہوسکنے کا مجھے کوئی اعتبار نہیں ہے۔ لیگ جن لوگوں کے قابو میں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں حکومت کی تائید حاصل ہے اور وہ معقول شرطوں کو بھی قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔

وائسرائے نے بہت اصرار سے کہا کہ حکومت لیگ کی حمایت نہ کرے گی۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈروں کو ایسا کوئی خیال ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت غیر جانبدار رہی ہے اور رہے گی۔

اس کے بعد میں نے اس خط و کتابت کے سوال کو اُٹھایا جو قلعہ احمد نگر جیل سے ان کے اور میرے درمیان ہوئی تھی، اور یہ امید ظاہر کی کہ انھیں اس کے شائع کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

وائسرائے نے جواب دیا کہ وہ کوئی اعتراض نہ کریں گے اگر میرا واقعی بہت جی چاہتا ہو کہ انھیں چھاپ دوں، لیکن ان کی اشاعت کا اچھا اثر نہ پڑے گا، کیوں کہ ہم اس وقت ایک نئے جوش

دن کو گرمی بہت سخت تھی اور میں جب دہلی پہنچا تو بدن میں کچھ سکت نہیں رہی تھی انبالہ سے کالکا تک موٹر کا سفر اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوا راستے بھر لوگوں کے ہجوم ملتے رہے جنہوں نے موٹر کو گھیر لیا، پائدانوں پر اور چھت پر بھی چڑھ گئے، اور ہم بڑی مشکل سے آگے بڑھ پائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دیوانے ہوگئے ہیں، وہ سامنے سے ہٹتے ہی نہیں تھے جب تک کہ ہم ان کی خوشامد نہ کرتے کہ ہمیں روکیں نہیں، آگے جانے دیں آخر کار قریب دس بجے رات کو میں شملہ پہنچا، اور سیدھا سیوائے ہوٹل گیا جہاں میرے لئے کمرے طے کئے گئے تھے۔ مگر میں اس ہوٹل میں زیادہ دن تک رہ نہیں سکا۔ لارڈ ویول نے میری حالت دیکھ کر سوچا کہ میرا ہوٹل میں رہنا مناسب نہ ہوگا، انہوں نے وائسریگل اسٹیٹ میں ایک مکان میرے لئے خالی کرادیا، اور میری دیکھ بھال اپنے عملہ کے سپرد کردی۔ اس تواضع اور مروت کا میرے اوپر بہت اثر ہوا۔ جہاں تک میرا ان سے سابقہ رہا، میں نے لارڈ ویول کو طبعی شائستگی کی مثال اور لحاظ کا نمونہ پایا۔

دوسرے دن صبح دس بجے میری وائسرائے سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بہت اخلاق سے میرا استقبال کیا اور برطانوی حکومت کی طرف سے جو تجویزیں لائے تھے انہیں بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کے دوران میں کوئی بڑی دستوری تبدیلیاں نہ کی جاسکیں گی، مگر ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کے ممبر سب ہندوستانی ہوجائیں گے اور وہ اس کو ایک دستوری رسم بنانے کی کوشش

پیدا کرنے کی خاطر اپنی پچھلی تجویز کو دوبارہ پیش کیا ہے۔

میں نے وائسرائے کو بتایا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے مجھے اپنی طرف سے کارروائی کرنے کا مختار کیا ہے، مگر اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ قطعی جواب دینے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلوں، اسی خیال سے میں نے ورکنگ کمیٹی کو تجویز پر غور کرنے کے لئے شملہ بلایا ہے اس طرح میں کانگرس کا فیصلہ کانگرس کے سامنے پیش کر سکوں گا میں نے لارڈ ویول کو یقین دلایا کہ میری کوشش یہ ہوگی کہ کوئی حل نکالوں اور میں دشواریاں نہیں پیدا کروں گا

وائسرائے تجویزوں کو بیان کر رہے تھے تو ان کے انداز میں ایک صفائی اور خلوص تھا جس سے میں متاثر ہوا میں نے دیکھا کہ ان کا رویہ ایک سیاست داں کا نہیں بلکہ سپاہی کا ہے۔ انہوں نے معاملہ کو طول نہیں دیا، بلکہ جو کچھ کہا صاف صاف اور بغیر ہیر پھیر کے کہا۔ ان کے اور سر سٹیفرڈ کرپس کے طریقے میں بہت فرق تھا۔ کرپس نے کوشش کی تھی کہ اپنی تجویزوں کو بہترین روشنی میں پیش کریں انہوں نے ان کے ہر اچھے پہلو کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا اور کمزور پہلوؤں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ لارڈ ویول نے کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے اوپر اچھا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے پھٹ سے کہہ دیا کہ لڑائی ابھی جاری ہے اور جاپان ایک بہت طاقت ور دشمن ہے ایسی صورت میں برطانیہ کوئی اہم اقدام کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے لئے جنگ کے خاتمہ کا انتظار کرنا

اور ولولے کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے مل بیٹھنے والے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ دلوں سے پرانی کدورتیں نکال دیں۔ اگر ایسے موقع پر پرانی باتوں کی یاد تازہ کی گئی تو فضا بدل جائے گی اور دوستی اور خلوص کے بجائے بے اعتباری اور غصہ کی فضا پیدا ہو جائے گی انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ خط و کتابت کی اشاعت پر اصرار نہ کروں، اور کہا کہ اگر میں نے ان کی تجویز کو مان لیا تو وہ بہت ممنون ہوں گے

میں نے دیکھا کہ وائسرائے کا انداز مخلصانہ ہے اور وہ واقعی سیاسی فضا میں تبدیلی چاہتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ ان کی طرح مجھے بھی ایک نئی فضا پیدا کرنے اور اپنے مسائل پر دوستی کے ایک نئے انداز سے گفتگو کرنے کی خواہش ہے، اس لئے میں کوئی ایسی بات نہ کروں گا جو فضا کی تبدیلی کے حق میں مفید نہ ہوا اور ان کی تجویز کو مان لوں گا

وائسرائے نے دوبارہ کہا کہ وہ میرے اس رویے پر بہت شکر گذار ہیں

اس کے بعد وائسرائے نے اپنی تجویز کی تفصیلات بیان کیں۔ میرے اوپر پہلا اثر یہ پڑا کہ بنیادی طور پر یہ کرپس کی پیش کش سے مختلف نہیں ہے۔ مگر حالات میں ایک بڑا فرق یہ ہو گیا تھا کہ اُس وقت انگریزوں کو ہندوستان کے تعاون کی انتہائی ضرورت تھی، اور اس وقت یورپ میں لڑائی ختم ہو چکی تھی اور اتحادی ہٹلر پر نمایاں فتح حاصل کر چکے تھے۔ اس کے باوجود برطانوی حکومت نے ہندوستان میں ایک نئی سیاسی فضا

دلیل یہ دی کہ اب حالات بدل گئے ہیں، یورپ کی جنگ ختم ہو گئی ہے اور جاپان بھی زیادہ دن تک مقابلہ نہ کر سکے گا. جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو برطانیہ کے لئے ہمارا تعاون حاصل کرنے کی کوئی خاص غرض نہ رہے گی اس وجہ سے لارڈ ویول کی پیش کش کو نامنظور کر دینا مناسب نہ ہو گا، اور ہمیں کانفرنس میں اس مقصد سے شرکت کرنا چاہئے کہ اگر شرطیں کسی اعتبار سے بھی قابل قبول ہوں تو انہیں مان لیا جائے.

اس پر ایک لمبی بحث ہوئی مگر آخر میں ورکنگ کمیٹی نے طے کیا کہ کانفرنس میں مندرجہ ذیل امور پر زور دینا چاہئے

(۱) ہم کو اس بارے میں صاف اور واضح بیان ملنا چاہئے کہ ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کا وائسرائے سے کیا تعلق ہوگا؟ کیا ایسی صورت میں جب کہ کاؤنسل متفقہ فیصلہ کرے وائسرائے اس فیصلہ کا پابند ہوگا یا اسے پھر بھی نا منظوری کا اختیار ہوگا؟

(۲) فوج کی حیثیت واضح ہونا چاہیے. اس وقت فوج اور قوم کے درمیان ایک دیوار حائل تھی. اس صورت حال میں تبدیلی ہونا چاہیے، تاکہ ہندوستان کے لیڈروں کو فوج سے تعلق پیدا کرنے کا موقع ملے؟

(۳) برطانوی حکومت نے ہندوستان کی عام رائے معلوم کئے بغیر ملک کو کھینچ کر جنگ میں شریک کر لیا تھا. کانگریس کو یہ پوزیشن منظور نہیں ہے. اگر کوئی باہمی فیصلہ ہو اور ایک نئی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل بنے تو کاؤنسل کو حق ہوگا کہ ہندوستان کے جنگ میں آئندہ شریک رہنے کے مسئلے کو ہندوستان

ہوگا، مگر دور اثر تبدیلوں کا سلسلہ ابھی سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ ایکزیکیوٹیو کاؤنسل بالکل ہندوستانی ہو جائے گی، اور اس طرح ملک کی حکومت کا مرکز ہندوستانیوں کے اختیار میں آ جائے گا۔ جب ایک مرتبہ یہ ہو جائے تو ایک نئی صورت حال پیدا ہوجائے گی اور جنگ کے بعد ترقی یقینی ہو جائے گی۔

لارڈ ویول سے میری ملاقات نے شملہ کی فضا بدل دی اس رات کو وہ بڑی سرکاری دعوت دے رہے تھے اور میں نے سنا کہ کھانے کے دوران میں انہوں نے میری بہت تعریف کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کانگریسی لیڈروں کے خیالات اور حکومت سے ان کے اختلافات چاہے جیسے ہوں، مگر وہ ہیں شریف آدمی۔ وائسرائے کا یہ قول پورے شہر میں دہرایا گیا اور اس نے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ بہت سے لوگ جو اس وقت تک کانگرس کی طرف سے سرد مہر تھے اور میرے وجود کو بھی بس تکلفاً تسلیم کرتے تھے ایک بارگی ہم سے محبت کرنے لگے۔ وہ میرے پاس تحفے تحائف لے کر آنے لگے اور مجھے یقین دلانا چاہا کہ دل میں انہوں نے ہمیشہ کانگریس کو سراہا ہے اور اس کی طرف داری کی ہے۔

۲۴ کی سہ پہر کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ سردار ہرنام سنگھ کے مکان پر ہوا، جہاں گاندھی جی ٹھہرے تھے۔ وائسرائے سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کی میں نے مختصر رپورٹ پیش کی اور یہ رائے دی کہ ہمیں اس پیش کش کو منظور کر لینا چاہیے۔ اگرچہ وہ کرپس کی پیش کش سے مختلف نہیں ہے۔ اس کے لئے میں نے

استقبال کیا اور یہیں ہمارا ان سے باقاعدہ تعارف کرایا گیا۔ میں اس زمانے میں بہت کمزور تھا اور میرے لئے چند منٹ سے زیادہ کھڑے رہنا بہت مشکل تھا۔ میں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹیری، سرایون جنکنز سے اس کا ذکر کیا اور وہ مجھے ایک طرف کونے میں لے گئے جہاں ایک صوفہ رکھا تھا مجھے وہاں بیٹھے ہوئے چند منٹ گذرے تھے جب وہ ایک خاتون کو لیکر آئے اور تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ عربی زبان کی بہت اچھی عالم ہیں شاید انہوں نے یہ سوچا کہ میں اکیلا بیٹھا ہوں اس لئے کسی کو میرے پاس ہونا چاہیے، اور میرے لئے مشرقی علوم کے ماہر سے بہتر ساتھی کون ہو سکتا تھا۔ میں نے خاتون سے عربی میں بات چیت شروع کی، مگر معلوم ہوا کہ اس بیچاری کا علم «نعم» اور «لا» تک محدود تھا پھر میں نے ان سے انگریزی میں پوچھا کہ آخر وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کو یہ خیال کیسے ہوا کہ آپ عربی روانی سے بولتی ہیں انہوں نے کہا کہ میں چند مہینے بغداد میں رہ کر آئی ہوں اور رات کو کھانے کی دعوت میں میں نے کچھ مہمانوں سے کہا تھا کہ کسی عرب کو کسی بات پر تعجب ہو تو وہ «عجیب! عجیب!» کے لفظ استعمال کرتا ہے خاتون نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس سے مہمان مرعوب ہوئے اور انہوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ میں عربی زبان کی عالم ہوں

تھوڑی دیر کے بعد لارڈ ویول آئے اور کہا کہ اب کانفرنس کے کمرے میں جانے کا وقت ہوگیا ہے۔ یہاں نشستوں کی ترتیب ایسی تھی کہ وائسرائے بیچ میں تھا، کانگریس سب سے بڑی مخالف

کی لیجس لیٹو اسمبلی میں پیش کرے۔ جاپان کے خلاف جنگ کرنے میں ہندوستان برطانیہ کے ایک فیصلے کی بدولت نہیں بلکہ قومی نمائندوں کی رائے کی بنا پر شریک ہوگا۔

گاندھی جی ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شروع سے آخر تک موجود تھے اور اس فیصلے میں بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر انہوں نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ جنگ میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس عدم تشدد کے اصول کو چھوڑ رہی ہے۔ یعنی انہوں نے تشدد یا عدم تشدد کی بحث نہیں چھیڑی۔ ان کی طرح ورکنگ کمیٹی کے وہ ممبر جنہوں نے پہلے اس بنا پر استعفیٰ دیا تھا خاموش بیٹھے رہے۔

وائسرائے کے اعلان کے مطابق انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر اور شیڈیول کاسٹ اور سکھوں کے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر اور مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر، کاؤنسل آف سٹیٹ میں کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈر اور اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے لیڈروں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ان کے علاوہ کانفرنس میں وہ لوگ بھی شریک ہوئے جو اس وقت صوبجاتی حکومتوں کے چیف منسٹر تھے یا حال تک رہ چکے تھے۔ ہندو مہا سبھا نے کوشش کی کہ اسے بھی دعوت دی جائے، مگر وائسرائے نے اس کے استحقاق کو تسلیم نہیں کیا۔

ہم سے کہا گیا کہ کانفرنس شروع ہونے کے وقت سے کچھ پہلے آجائیں۔ وائسرائے نے وائسریگل لاج کے چمن میں ہمارا

اختلافات منظر عام پر آگئے دوسرے دن تک کانفرنس چند خاص اصولوں پر متفق ہو گئی، جیسے کہ اقلیتوں کی نمائندگی، جنگ کی سرگرمیوں میں کھلے دل سے شرکت اور جنگ کے خاتمے تک نئے طریقے پر مرتب کی ہوئی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کا قانون حکومت ہند کے ماتحت برقرار رہنا۔ لیکن کاؤنسل کی رکنیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ کانگریس تمام ہندو ممبروں کو نامزد کر سکتی ہے اور لیگ تمام مسلمان ممبروں کو نامزد کرے گی میں نے کہا کہ کانگریس ایسے مطالبے کو منظور نہیں کر سکتی، تمام سیاسی مسئلوں میں اس نے قومی نقطۂ نظر اختیار کیا تھا اور سیاسی معاملوں میں وہ ہندو مسلمان کے امتیاز کو صحیح نہیں تسلیم کر سکتی تھی۔ وہ کسی حالت میں بھی اس پر راضی نہیں ہو سکتی کہ اسے صرف ہندوؤں کی پارٹی قرار دیا جائے۔ اس لئے میں نے اصرار کیا کہ کانگریس کو اس کی آزادی ہونا چاہیے کہ جس ہندوستانی کو چاہے نامزد کرے، قطع نظر اس سے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی یا پارسی یا سکھ، کانگریس کو ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر شرکت کرنا چاہیے ورنہ شرکت ہی نہ کرنا چاہیے۔ مسلم لیگ کو اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ اس کے نمائندے کون ہوں گے۔

کانفرنس کا ۲۶ جون کی صبح کو اجلاس ہوا، مگر نمائندوں کو آپس میں مشورہ کرنے کا موقع دینے کے لئے اجلاس برخاست کر دیا گیا۔ مسٹر جناح نے کانگریس سے غیر رسمی طور پر گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے اس کے لئے

پارٹی کی حیثیت سے اس کے بائیں طرف تھی، لیگ اس کے دائیں طرف۔ اس طرح شاید غیر شعوری طور پر اس کا اعتراف کیا گیا کہ لیگ حکومت کی حامی ہے۔

لارڈ ویول نے مختصر سی افتتاحی تقریر کی، جس کے بعد میں نے کانفرنس کے سامنے کانگریس ورکنگ کمیٹی کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ میں نے جو تین مسئلے اٹھائے تھے ان کا وائسرائے نے موافقت میں جواب دیا گفتگو دن بھر جاری رہی، صرف لنچ کے لئے وقفہ کیا گیا۔

کانفرنس عام پبلک کے لئے نہیں تھی اور اس میں اخباروں کے نمائندوں کو نہیں بلایا گیا تھا پہلی نشست کے بعد میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ اگر سرکاری طور پر اخباروں کو کوئی رپورٹ نہ بھیجی گئی تو ہماری گفتگو کے بارے میں بے بنیاد قیاس آرئیاں کی جائیں گی اس لئے مناسب ہو گا اگر اخباروں کے لئے رپورٹ تیار کر لی جایا کرے، مگر یہ ایسی ہونا چاہیے جس پر تمام شرکا متفق ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہر نشست کے بعد ایک سرکاری بیان تیار کر لیا جائے گا اور اشاعت سے پہلے کانفرنس سے اس کی منظوری حاصل کر لی جائے گی۔ اسی کے مطابق شام کو مجھے ایک مسودہ بھیجا گیا جسے میں نے ایک دو معمولی سی ترمیمیں کرنے کے بعد واپس کر دیا۔ اخباروں کو بھیجنے سے پہلے یہ ترمیمیں بیان میں شامل کر لی گئیں۔ کانفرنس کے دوران میں اس طریق کار پر عمل ہوتا رہا۔

کانفرنس شروع ہونے کے بہت جلد بعد کانگریس اور لیگ کے

گئے تھے وہ مجھے یاد ہیں۔ کہا گیا تھا کہ اس کا ایک مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے جذبے کو تقویت پہنچانا ہے، دوسرا سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے حق کو پیش کرنا اور اس طرح مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کو محفوظ کرنا ہے۔ اس طرح لیگ کے لیڈر قدرتی طور پر سیاسی آزادی کے اس مطالبے کے خلاف تھے جو کانگریس پیش کر رہی تھی، اور سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان ایسے کسی مطالبے میں شریک ہوئے تو انگریز نیابتی مجلسوں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے حق کو مخصوص کرنے کے دعوے کی حمایت نہ کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کانگریس کو غداروں کی جماعت کہتے تھے اور گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتا جیسے اعتدال پسند سیاسی لیڈروں کو شبہے کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس دور میں برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کو کانگریس کے مطالبوں کو رد کرنے کا ذریعہ بنا کر رکھا۔

مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا دوسرا دور شروع ہوا جب اس نے دیکھا کہ حکومت کانگریس کے دباؤ کی وجہ سے مختلف اصلاحات جاری کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ کانگریس کے قدم بہ قدم مقصد کی طرف بڑھتے دیکھ کر اسے کچھ پریشانی ہوئی۔ لیگ سیاسی جد و جہد سے تو الگ اور بے تعلق رہی، مگر جیسے ہی کچھ حاصل ہوا اس نے مسلمانوں کے حصہ کا مطالبہ کیا۔ مسلم لیگ کا یہ طریقہ حکومت کے لئے مفید مقصد تھا، اور در حقیقت یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے کہ لیگ کی کارروائیاں انگریزوں کی

پنڈت گووند بلبھ پنت کو نامزد کیا، جنہیں میں مسٹر جناح سے گفت و شنید کرنے کے لئے سب سے مناسب شخص سمجھتا تھا ان کے درمیان کئی دن تک گفتگو ہوئی، مگر آخر میں لاحاصل ثابت ہوئی۔ خضر حیات خاں، جو پنجاب کے چیف منسٹر کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، اس دوران میں کئی بار مجھ سے ملے، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہر معاملے میں انہوں نے بہت معقول رویہ اختیار کیا، اور جیسے جیسے دشواریاں پیدا ہوئیں انہوں نے ان کے حل کرنے میں مدد کی اور دوسروں سے اتحاد عمل کیا۔

شملہ کانفرنس ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے یہ پہلا موقع ہے جب کہ مفاہمت کی کوشش برطانیہ اور ہندوستان کے بنیادی سیاسی اختلافات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس فرقہ واری مسئلے کی وجہ سے ناکامیاب ہوئی جس نے مختلف ہندوستانی جماعتوں میں تفرقہ ڈال دیا تھا اس تبدیلی کو سمجھنے کے لئے مسلم لیگ کی گذشتہ تاریخ پر نظر دوڑانا ضروری ہے

مسلم لیگ نے سیاسی مسئلوں کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس کی تاریخ تین الگ الگ حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

مسلم لیگ ڈھاکہ کے مقام پر ۱۹۰٦ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد کرسمس میں قائم ہوئی اس کا آغاز نواب مشتاق حسین کی کوششوں سے ہوا میں اس اجلاس میں موجود تھا اور لیگ کے قیام کے جو دو مقصد بیان کئے

ہندوستان کی آزادی یقینی نہ ہوجاتی۔ اس وجہ سے گفتگو بنیادی سیاسی مسئلوں پر ختم ہوجاتی اور فرقہ واری مسئلہ پر بات کرنے کی نوبت نہ آتی۔ شملہ کانفرنس میں، میں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو لارڈ ویول کی پیش کش منظور کرنے پر آمادہ کرلیا۔ مگر اب جبکہ ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف ختم ہونے کے قریب تھا تو اکزیکیوٹیو کاؤنسل میں فرقہ واری نمائندگی کے مسئلے نے کانفرنس کو ناکام کردیا۔

میں یہ بیان کرچکا ہوں کہ اس معاملہ میں کانگریس نے قومی نقطۂ نظر پیش کیا اور مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ کانگریس اپنی قومی حیثیت سے دست بردار ہوکر ایک فرقہ واری پارٹی بن جائے۔ مسٹر جناح نے حیرت انگیز دعویٰ کیا کہ کانگریس صرف ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کے ہندو ممبران کو نامزد کرسکتی تھی۔ میں نے کانفرنس میں پوچھا کہ مسٹر جناح یا مسلم لیگ کو کس طرح یہ حکم لگانے کا حق ہے کہ کانگریس کسے نامزد کرے اور کسے نہ کرے؟ اگر کانگریس مسلمانوں پارسیوں، سکھوں اور عیسائیوں کے نام پیش کرے تو کاؤنسل میں ہندو ممبروں کی تعداد کم ہوجائے گی لیکن اس سے مسلم لیگ کو کیا مطلب ہے؟ میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ وہ صاف صاف بتائیں کہ مسلم لیگ کا مطالبہ معقول ٹھہرایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

لارڈ ویول نے جواب دیا کہ وہ لیگ کے مطالبہ کو معقول نہیں مان سکتے، لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جسے کانگریس اور لیگ کو آپس میں طے کرنا چاہیئے، حکومت کے یا خود ان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی فریق کو اپنا فیصلہ منظور کرنے پر مجبور کرے۔

خواہش کے مطابق ہوتی تھیں۔ لیگ نے یہی رویہ مورلے منٹو اصلاحات اور مونٹے گیو چمسفرڈ کی صوبجاتی خود مختاری کی سکیم کے زمانے میں اختیار کیا

لیگ کے پروگرام کا تیسرا دور پہلی جنگ عظیم کے زمانہ سے شروع ہوا۔ اس وقت تک کانگریس نے بہت اعتبار پیدا کرلیا تھا، اور یہ صاف ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی اب مسٹر جناح لیگ کے قائد ہوگئے تھے اور انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں کانگریس اور حکومت کے ہر اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ جب کبھی کانگریس اور حکومت کے درمیان حکومت کے اختیارات منتقل کرنے کی گفتگو ہوتی تو مسٹر جناح پہلے خاموش رہتے، اگر گفتگو کامیاب نہ ہوتی تو وہ ایک نودا سا بیان شائع کردیتے کہ دونوں فریق مذمت کے قابل ہیں لیکن چونکہ کسی قسم کا سمجھوتا نہیں ہوا ہے لیگ کو برطانیہ کی پیش کش کے بارے میں کوئی رائے دینے کی ضرورت نہیں ہے اگست ۱۹۴۰ء کی پیش کش اور ۱۹۴۲ء میں کرپس کی تجویزوں کے موقع پر انھوں نے ایسا ہی کیا۔ شملہ کانفرنس میں انھیں ایسی صورت حال نظر آئی جس سے اب تک انھیں سابقہ نہیں پڑا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں، اب تک کانگریس اور حکومت کے درمیان ہر گفتگو کسی سیاسی مسئلہ کی وجہ سے ناکامیاب ہوئی تھی۔ انگریز اختیار منتقل کرنے پر راضی نہیں تھے اور کانگریس کسی ایسے فیصلے کو منظور کرنے پر تیار نہیں تھی جس سے

وردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ۔ فروری ۱۹۴۲ء.

۱۹۴۶ء میں میرٹھ کانگریس. کرپلانی، پٹیل، آزاد، غفار خاں.

کاؤنسل کی رکنیت کے بارے میں اختلاف اس وقت نمودار ہوا جب سیاسی مسئلے پر سمجھوتا ہو چکا تھا۔ نئے نظام کا خاکہ بن گیا اور سب نے اسے پسند کرلیا تو پارٹیوں سے کہا گیا کہ اپنے نمائندوں کے نام پیش کریں۔ ظاہر ہے کانگریس کی فہرست میں پہلا نام کانگریس کے صدر کا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے جواہرلال اور سردار پٹیل کے نام شامل کئے تھے۔ باقی دو نام طے کرنے سے پہلے ہم میں خاصی بحث ہوئی۔ مجھے بہت خواہش تھی کہ ایک پارسی اور ایک ہندوستانی عیسائی ہماری فہرست میں ہو

یہاں مختصراً یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مجھے اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنے پر کیوں اصرار تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں جب ہم گرفتار ہوئے تھے تو برطانوی حکومت نے بعض اقلیتوں کو کانگریس کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان اقلیتوں میں سے ایک پارسی بھی تھے جس سے حکومت نے معاملہ کرنا چاہا۔ ان کی جماعت بہت چھوٹی ہے، لیکن تعلیم، دولت اور قابلیت کی وجہ سے اس کو قومی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس جماعت کے ایک آدمی کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے جب بمبئی میں پہلی بار کانگریسی وزارت بننے کے موقع پر نریمان کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے علاوہ کانگریس نے سنہ ۱۹۳۷ء میں ایک فیصلہ کیا تھا جس سے پارسیوں کو نقصان ہوا۔ کیونکہ جب شراب بندی نافذ کی گئی تو دوسری جماعتوں کے لوگوں سے زیادہ کاروباری پارسیوں پر اس قانون کا اثر پڑا۔ شراب کی تجارت میں وہ اجارہ دار سے تھے، اور

سراب سدی نے کروڑں کے لیں دیں کو ختم کر دیا حکومت کو خیال تھا کہ ان واقعات کے بعد سے پارسی کانگریس کے خلاف ہوں گے ، مگر ایک جماعت کی حیثیت سے انھوں نے حکومت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا قبول نہیں کیا ایک بیان میں، جس پر تقریباً تمام اہم اور معتبر لیڈرں کے دستخط تھے ، انھوں نے صاف صاف اعلان کردیا کہ ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں وہ کانگریس کے ساتھ ہیں اور اس کے ساتھ رہیں گے

قلعہ احمد نگر کے جیل خانے میں جب میں نے یہ بیان پڑھا تو میرے اوپر بہت اچھا اثر پڑا، اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ پارسیوں نے اس بیان کو شائع کر کے ہندرستان کی بڑی خدمت کی ہے میں نے یہ بھی تجویز کیا کہ ہمیں اس احسان کا مناسب طریقے پر اعتراف کرنا چاہیے ، اور اگرچہ ان کی جماعت بہت چھوٹی ہے ، مگر ہندوستان کی پہلی آزاد حکومت میں ان کا خیال رکھنا چاہیے . اس لئے جب ہم کانگریس کے نمائندوں کی فہرست مرتب کر رہے تھے تو میں نے اصرار کیا کہ فہرست میں ایک پارسی نام بھی ہو . گاندھی جی کو میرا خیال پسند آیا ، مگر وہ سمجھتے تھے کہ کسی پارسی کو شامل کرنا ممکن نہ ہوگا ، اس لئے کہ کانگریس صرف پانچ اشخاص کو نامزد کر سکتی ہے . اس پر سب تیار تھے کہ آئندہ کوئی وزارات بنے تو اس میں ایک پارسی کے لئے جگہ نکالنے کی پوری کوشش کی جائے مگر میں اس پر راضی نہیں ہوا . میں نے کہا کہ مستقبل کے بارے میں کچھ یقین نہیں ہے ، اور اب جو ہمیں موقع ہے کہ اپنی پسند کے مطابق

پنڈت جی - بادشاہ خاں - سردار پٹیل - مولانا آزاد - مہاتما جی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ، دہلی ۱۹۴۷ء

یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ مہاسبھا کی طرح مسلم لیگ نے بھی کانگریس کی طرح سے ایک مسلمان کا نام پیش ہونے پر اعتراض کیا۔

دس برس کے بعد بھی جب میں ان واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس عجیب صورت حال پر حیرت ہوتی ہے جو مسلم لیگ کے رویہ کی وجہ سے پیدا ہوئی لارڈ ویول نے خود آزمائشی طور پر ایک فہرست تیار کی تھی جس میں کانگریس اور لیگ کے پانچ پانچ ناموں کے علاوہ چار نام اور تھے، ایک سکھوں کے نمائندے کا، دو شڈیولڈ کاسٹ کے نمائندوں کے، اور چوتھا خضرحیات خاں کا، جو اس وقت پنجاب کے چیف منسٹر تھے مسٹر جناح کو یہ بات بہت بری لگی کہ ایکزیکیوتیو کاؤنسل میں دو مسلمان ہوں جو ان کے نامزد کردہ نہ ہوں۔ خضر حیات خاں مجھ سے ملنے آئے اور میں نے ان کو یقین دلایا کہ کانگریس کو ان کے شامل کئے جانے پر اعتراض نہ ہوگا۔ یہی میں نے لارڈ ویول سے بھی کہا۔ اس لئے اگر کانفرنس مسٹر جناح کی مخالفت کی وجہ سے ناکامیاب نہ ہو جاتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کاؤنسل کے چودہ ممبروں میں سے سات مسلمان ہوتے، اگرچہ پوری آبادی کے وہ صرف پچیس فی صدی تھے۔ یہ کانگریس کی فیاضی کا ثبوت ہے، اور اس سے مسلم لیگ کی حماقت پر ایسی روشنی پڑتی ہے جس میں وہ خاصی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کی محافظ سمجھی جاتی تھی، مگر اسی کی مخالفت کے سبب سے مسلمان غیر تقسیم شدہ ہندوستان کی حکومت

انتخاب کریں، ہمیں ایک پارسی کو اپنی فہرست میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ دو دن کی بحث کے بعد بالآخر میری بات مان لی گئی۔

میں نے ایک ہندوستانی عیسائی کو بھی فہرست میں شامل کرنے پر اصرار کیا مجھے معلوم تھا کہ اس جماعت کا نمائندہ کسی اور ذریعے سے کاؤنسل میں نہیں آسکتا۔ سکھوں اور شڈیولڈ کاسٹ کے لوگوں کی نمائندگی بہر حال ہو جائے گی، لیکن جب تک کانگریس اس کی سرپرستی نہ کرے، کوئی ہندوستانی عیسائی حکومت کا رکن نہ بن سکے گا مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ہندوستانی عیسائیوں کی جماعت نے ہمیشہ کانگرس کی حمایت کی ہے اور سیاسی معاملات میں قومی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس نے جو فہرست داخل کی اس میں صرف دو ہندو نام تھے۔ اگر کسی ثبوت کی ضرورت تھی تو اس سے ثابت ہو گیا کہ کانگرس صحیح معنوں میں قومی پارٹی ہے یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہندو، جن کی ہندوستان میں اکثریت تھی، اس تجویز پر اعتراض کریں گے، مگر یہ تعریف کی بات ہے کہ ہندوؤں نے استقلال کے ساتھ کانگریس کی تائید کی، اور اس وقت بھی ان کے رویہ میں فرق نہیں آیا جب انھوں نے دیکھا کہ کانگرسی فہرست کے پانچ ناموں میں سے تین مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں میں سے لئے گئے ہیں۔ بعد کو ہندو مہاسبھا نے کانگریس کے اس فیصلے کو اپنی ترقی کا ذریعہ بنانا چاہا، لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ کس بری طرح ناکامیاب ہوئی۔

آزاد کرنے کے مسئلہ سے براہ راست تعلق ہے اس لئے ہندوستان کی نئی حکومت کا یہ فرض ہوتا کہ جاپان کے خلاف جنگ جاری رکھے جب تک کہ یہ سب ملک آزاد نہ ہو جائیں۔ لیکن ہندوستان کی نئی حکومت کسی ایسی تجویز میں شریک نہ ہوسکتی جس کا مقصد یہ ہوتا کہ سابق یوروپی اِمپریلیسٹ طاقتوں کی حکومت کو بحال کیا جائے۔ ہم جنگ سے پہلے کی نوآبادیاتی حکومتوں کو جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں دوبارہ قائم کرنے کے لئے نہ ایک ہندوستانی سپاہی بھیجتے نہ ایک پائی خرچ کرتے

میں نے نامہ نگاروں کو یہ بھی بتایا کہ جب ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں حکومت کا اختیار منتقل کرنے کا بنیادی مسئلہ طے ہو گیا تھا تو کانفرنس نئی اکزیکیوٹیو کاؤنسل کی تعداد ترکیب اور ترکیب پر غور کرنے لگی۔ اس کے اجلاس اس لئے ملتوی کئے گئے کہ مختلف پارٹیوں میں نجی اور غیر رسمی گفتگو ہو سکے مگر ان گفتگوؤں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اس دوران میں مسٹر جناح نے یہ پوزیشن اختیار کی کہ نئی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کے مسلمان ممبروں کو نامزد کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہوگا۔ اور کانگریس کو اس کا حق نہ ہوگا کہ کسی مسلمان کو نامزد کرے۔ کانگریس کے لئے ایسے کسی اصول کو تسلیم کر لینا اس کی بنیادی قومی حیثیت کے خلاف ہوتا۔ اس کے لئے یہ صرف نشستوں کا نہیں بلکہ ایک بنیادی اصول کا معاملہ تھا ہم اس کے لئے تیار تھے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلم لیگ کی خواہشوں کو پورا کریں لیکن مسٹر جناح نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ مفاہمت

میں ایک معقول حصہ حاصل کرنے سے محروم رہے۔ مسلم لیگ کی انتہا پسندی کا انجام یہ ہوا کہ کانفرنس ناکامیاب قرار پاکر برخاست کر دی گئی

کانفرنس کے بعد میں نے ایک بیان شائع کیا اور نامہ نگاروں کی ایک کانفرنس بھی کی، جس میں، میں نے سمجھایا کہ شملہ کانفرنس میں شرکت کرنے میں کانگریس کو کیا دشواریاں پیش آئیں ہمارے سامنے تحویریں اچانک پیش کی گئیں، ۱۵ جون سنہ ۱۹٤۵ء کو میرے ساتھی اور میں سب رہا کئے گئے، اور ہمیں وائسرائے کی دعوت کے بارے میں فوراً فیصلہ کرنا پڑا ہم نے محسوس کیا کہ بین‌اقوامی دنیا میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اور ان کا بلا شبہ ہندوستان کے مسئلے پر اثر پڑا ہے۔ ان تبدیلیوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندوستان اور دوسری‌ایشیائی قوموں کی آزادی کا مسئلہ نظروں کے سامنے آگیا حالات کا صحیح جائزہ لینے کی دشواریوں کے باوجود ورکنگ کمیٹی نے کانفرنس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا

میں نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ گفتگو کی ہر منزل پر میں نے کانگریس کی قومی حیثیت پر زور دیا میں نے وائسرئے پر بھی واضح کردیا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی موجودہ سیاسی تعطل کو دور کرنے کی ہر معقول کوشش میں شریک ہونا چاہتی ہے۔

میں نے یہ کہا کہ اگر شملہ کانفرس کامیاب ہوتی تو جاپان کے خلاف جنگ صرف برطانیہ کی نہ ہو جاتی۔ بلکہ ہندوستان کی بھی ہو جاتی۔ ہندوستان کا جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو

اور استقلال کے کچھ کیا نہیں جا سکتا. پست ڈانواں ڈول ہو اور قدم لڑکھڑاتے ہوں تو ہم ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتے. قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں ضرور سوچنا چاہئے، مگر جب ایک مرتبہ ہم فیصلہ کرلیں اس کے بعد تامل اور ہچکچاہٹ تعریف کی بات نہیں ہے بلکہ قطعی کمزوری کی علامت ہے».

میں نے نامہ نگاروں سے کہا کہ کانگریس نے جو رویہ اختیار کیا اس پر مجھے بالکل افسوس نہیں ہے ہم نے جس حد تک ممکن تھا مسٹر جناح کی خواہشوں کا لحاظ کیا، مگر ہم ان کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرسکتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد اور مختار نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں لیگ کی منسٹری نہیں ہے صوبہ سرحد کی منسٹری کانگریسی ہے، بنگال میں گورنر کی حکومت ہے اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت ہے سندھ میں سر غلام حسین کی حکومت کا دار و مدار کانگریس کی حمایت پر ہے اور آسام میں بھی یہی حال ہے اس لئے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے. در اصل مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جس کو لیگ سے کوئی مطلب نہیں ہے.

اس بات کو ختم کرنے سے پہلے میں «ہندوستان چھوڑ دو» کی تحریک کے ایک نتیجہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں. اس دوران میں چند نئی شخصیتیں ہندوستان کے منظر عام پر نمودار ہوئیں. جنہیں نئے حالات کے تقاضوں نے اُبھارا تھا اُن میں سے ایک

کی گنجائش نہ رہی ۔ انہوں نے کہا کہ وہ ناموں کی فہرست بھی داخل نہ کریں گے جب تک کہ ان کا نظریہ تسلیم نہ کرلیا جائے وائسرائے نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنے بس بھر کوشش کی مگر مسٹر جناح کو قائل نہ کر سکے ۔ مسٹر جناح اصرار کرتے رہے کہ جو مسلمان نامزد ہوں ان سب کو لیگ ورکنگ کمیٹی نامزد کرے اس سے وائسرائے اتفاق نہ کر سکے اور انہیں محسوس ہوا کہ فی الحال اس تجویز پر مزید گفتگو کرنا بے فائدہ ہوگا ۔

میں نے اس وقت جو بیان شائع کیا تھا اس کا ایک حصہ درج کرتا ہوں ۔

« موجودہ صورت حال سے دو نتیجے نکلتے ہیں پہلا یہ ہے کہ کانگرس کی ناکامی کا ذمہ دار وہ رویہ ہے جو مسلم لیگ نے اختیار کیا ، دوسرا یہ ہے کہ اب جو مسلم لیگ نے انکار کردیا ہے تو لارڈ ویول کو طے کرنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں گے یا نہیں ۔ فی الحال انہوں نے طے کیا ہے کہ آگے نہ بڑھیں گے اس سلسلے میں میں ایک بات دہراؤں گا جو میں نے کانگرس میں کہی تھی ۔ برطانوی حکومت اپنے آپ کو فرقہ واری مسئلے سے بری الذمہ نہیں کرسکتی چاہے آج ہو یا کل ، ایک نہ ایک دن اسے عدل و انصاف پر مبنی فیصلہ کرکے اس پر قائم رہنا ہوگا ۔ اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے ۔ اور جب ایک مرتبہ فیصلہ کرلیا جائے تو پھر ہمیں آگے بڑھنا چاہئے ۔ جو اس کے لئے تیار ہوں انہیں موقع ملنا چاہئے کہ آگے بڑھیں ، جو چاہتے ہوں کہ انہیں الگ چھوڑ دیا جائے انہیں چھوڑ دینا چاہئے ۔ بغیر ارادے

انہیں قید نہیں کیا جائے گا تو میں نے مسز آصف علی سے کہہ دیا کہ اب ان کے روپوش رہنے کی ضرورت نہیں ہے اور انہوں نے سنہ ۱۹۴۵ء کے آخری حصہ میں پبلک میں آنا شروع کر دیا ان کی سرگرمیاں اتنی مشہور ہو گئی تھیں کہ وائسرائے نے ایک تقریر میں ان کی مثال پیش کرتے ہوئے عدم تشدد کے مسئلے میں کانگریس کی ایمانداری پر شبہ ظاہر کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ جب ورکنگ کمیٹی کا ایک ممبر کی بیوی تشدد آمیز سرگرمیوں میں مصروف ہو تو حکومت کے لئے مشکل ہے کہ عدم تشدد کے بارے میں جو اعلان کانگریس کیا کرتی ہے، ان پر اعتبار کرے جب قلعہ احمد نگر کے جیل خانہ میں آصف علی نے ان باتوں کی خبر سنی تو میں نے دیکھا کہ انہیں اپنی گرفتاری کی پرواہ نہیں ہے، بلکہ وہ ان خطروں کے خیال سے فکر مند ہیں جن میں ان کی بیوی گھری ہوئی ہیں۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ فکر مند ہونے کے بجائے انہیں اس پر فخر کرنا چاہئے کہ ان کی بیوی ایک اعلے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اتنی ہمت سے پیش قدمی کر رہی ہیں

مسز آصف علی تھیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ ۹ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کی صبح کو بمبئی کے ریلوے پلیٹ فارم پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ بیکار نہیں بیٹھی رہیں گی۔ ہماری گرفتاری کے بعد انہوں نے سارے ملک کا دورہ کیا اور برطانیہ کی جنگی سرگرمیوں کی مخالفت کے لئے وہ لوگوں کو منظم کرتی رہیں۔ انہوں نے تشدد اور عدم تشدد کے فرق کا خیال نہیں کیا، بلکہ وہ طریقہ اختیار کیا جو زیادہ کارآمد معلوم ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد حکومت ان کی جد و جہد کی طرف متوجہ ہوئی اور انہیں گرفتار کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن وہ روپوش ہوگئیں اور گرفتاری سے بچی رہیں۔ اس میں ان کی بہت سے ہندوستانیوں نے مدد کی، جن میں سے کئی سرکاری عہدہ دار یا کارخانوں کے مالک تھے جو معمولاً حکومت کے وفادار حامی سمجھے جاتے تھے۔ بمبئی اور کلکتہ کے بعض کاروباری لوگوں نے ان کی مدد کی، اور وہ انڈین سول سروس اور ہندوستانی فوج کے افسروں کے گھروں میں بھی رہیں۔ انہیں جتنے روپیہ کی ضرورت تھی اسے وہ جمع کرسکیں اور ہماری گرفتاری کے دوران میں وہ برابر مشغول رہیں

جب میں ۱۹۴۵ء میں رہا ہوا تو وہ کلکتہ میں چھپ کر مجھ سے ملنے آئیں۔ میں نے لارڈ ویول سے ان کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ان کی گذشتہ سرگرمیوں کی بنا پر انہیں گرفتار نہ کریں گے، لیکن آئندہ کیا ہوگا؟ میں نے جواب دیا کہ اب سیاسی صورت حال بدل گئی ہے اور اس کا بہت امکان ہے کہ وہ اپنی باغیانہ سرگرمیوں کو جاری رکھیں جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ

کہ لیبر پارٹی کا رویہ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ سمجھا جاتا تھا، مگر مجھے یقین تھا کہ لیبر پارٹی ہندوستان کے مسئلے پر ایک نئے زاویہ سے غور کرے گی اور اس کا نتیجہ اچھا ہو گا

اسی کے تھوڑے دن بعد وائسرائے نے اعلان کیا کہ اسی سال جاڑوں میں عام انتخابات ہوں گے. اس کی وجہ سے ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کرنا ضروری ہوں گے، کیونکہ اب کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامیابی کو دیکھتے ہوئے اسے کیا پالیسی اختیار کرنا چاہئے بعض لوگ ایک نئی تحریک شروع کرنے کی موافقت میں تھے، بعض کا خیال تھا کہ اگر نئی تحریک نہ شروع کی جائے تو کانگریس انتخابات کو بائیکاٹ کرے میری رائے تھی کہ ان میں سے کسی طریقہ کو اختیار کرنے کے لئے کافی وجہ نہیں ہے، اگر شملہ کانفرنس ناکامیاب ہوئی تھی تو اس میں انگریزوں کا قصور نہیں تھا ناکامی کا سبب فرقہ واری تھی سیاسی اختلاف نہیں تھا

میں گلمرگ ہی میں تھا جب ایک نیا واقعہ پیش آیا جس کا دنیا کی تاریخ میں کوئی جواب نہیں وہ یہ تھا کہ امریکیوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی شہروں پر اٹم بم گرائے. اس کے پہلے عام طور پر اندازہ کیا جاتا تھا کہ جاپانیوں کی طاقت توڑنے میں کم از کم دو سال لگیں گے ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی جاپانیوں کے پاس اس نئے اور ہیبت ناک آلۂ جنگ کا کوئی جواب نہیں تھا، اور وہ بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے. یورپ میں جنگ ختم ہو گئی تھی چند ہفتوں کے

عام انتخابات

شملہ کانفرس کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے بہت اصرار سے مشورہ دیا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے کشمیر چلا جاؤں ۔ میری صحت اب بھی کمزور تھی اور میں کانگریس کے صدر کے معمولی فرائض بھی بہت مشکل سے انجام دے پاتا تھا۔ جواہر لال کو بھی تبدیلی آب و ہوا کی ضرورت تھی اور انہوں نے بھی کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جولائی اور اگست کے مہینے گلمرگ میں گذارے۔ میں یہیں تھا جب مجھے خبر ملی کہ لیبر پارٹی نے برطانیہ کے عام انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ میں نے فوراً مسٹر ایٹلی اور سر سٹفیرڈ کرپس کو مبارکباد کے تار بھیجے، اور ان میں یہ امید بھی ظاہر کی کہ حکومت کا اختیار حاصل کرنے کے بعد لیبر پارٹی ان وعدوں کو پورا کرے گی جو وہ ہندوستان سے اس زمانے میں کرتی رہی ہے جب اس کی حیثیت مخالف پارٹی کی تھی۔ مسٹر ایٹلی نے جواب میں لکھا کہ لیبر پارٹی ہندوستان کے مسئلے کا صحیح حل نکالنے کی پوری کوشش کرے گی کرپس نے لکھا ہے کہ انہیں امید ہے کہ ہندوستان کو مایوسی نہ ہو گی۔ مجھے یہاں یہ بات کہدینا چاہئے کہ گاندھی جی اور جواہر لال دونوں کو میرا اس طرح تار دینا پسند نہیں آیا۔ ان کو اعتبار نہیں تھا

لیکن حالات ایسے تھے، کہ مجھے کشمیر چھوڑنا پڑا۔ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں میری موجودگی ضروری تھی۔ جس میں میدانی علاقے میں آ گیا و جو وقتی بہتری میری صحت میں ہوئی تھی وہ غائب ہو گئی

اس وقت کشمیر کے لئے ہوائی جہاز کی سروس نہیں تھی۔ مسافروں کو لمبی اور پر پیچ موٹر کی سڑک سے جانا پڑتا تھا۔ لیکن امریکی اپنے فوجی افسروں کو بڑی تعداد میں آرام اور تفریح کے لئے کشمیر لے جایا کرتے تھے۔ ہر دوسرے ہفتے ایک نئی ٹولی ہوائی جہاز سے سری نگر بھیجی جاتی ان افسروں میں سے کچھ مجھ سے ملنے آئے۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ مجھے دہلی جانا ہے تو انہوں نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو امریکی کمانڈر کے خاص جہاز میں مجھے پہنچا دیں گے ۱۰ ستمبر کو میں ان کے جہاز میں دلی پہنچا اور پونا کے لئے روانہ ہو گیا ورکنگ کمیٹی کا ۱۴ ستمبر کو پونا میں اجلاس ہوا اور پھر اس کا مقام بدل کر بمبئی کر دیا گیا ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں میں اس پر گرما گرم بحثیں ہوئی کہ اب ہماری پالیسی کا رخ کیا ہونا چاہیے اکثریت کا، جس میں گاندھی جی بھی شامل تھے، خیال تھا کہ ہمیں اپنے آپ کو تعمیری کاموں کے لئے وقف کر دینا چاہیے، اس لئے کہ اب سیاسی میدان میں کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں ہے

میرا کہنا تھا کہ اب لیبر پارٹی کی حکومت کی وجہ سے برطانیہ میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے لیبر پارٹی کا ہندوستان کے ساتھ ہمیشہ

اندر امریکی فوج جاپان کی سر زمین پر اتری اور ٹوکیو پر قبضہ کر لیا جنرل میک آرتھر عملاً جاپان کے حکمراں ہو گئے۔

مجھے اب بھی یقین ہے کہ جاپان کو آگاہ کئے بغیر ایٹم بم گرانے کی کوئی وجہ نہیں تھی ان بموں نے صرف فوجیوں کو نیست ونابود نہیں کر دیا بلکہ نئے شہریوں کو بھی اور آنے والی نسلوں تک کو نقصان پہنچایا در اصل ایٹم بم نے نوع انسانی کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا پہلی جنگ عظیم میں، جب جرمنوں نے اتحادیوں کے خلاف زہریلی گیس استعمال کی تو دنیا کی عام رائے نے ان کی بے تکان مذمت کی اگر جرمنوں نے اس وقت انسانیت کے خلاف ارتکاب جرم کیا تھا، تو اس وقت امریکنوں کو کیسے بری کیا جا سکتا تھا میرا خیال تھا کہ ایٹم بم استعمال کرنا قابل معافی نقصان رسانی کی حدود سے تجاوز کرنا ہے اور اس سے اتحادیوں کی عزت اور بہادری کی شہرت میں اضافہ نہ ہوگا مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اتحادیوں نے اس واقعہ کو ایک شاندار فتح کہہ کر خیر مقدم کیا، اور احتجاج کے طور پر کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا

میری صحت اب بھی کمزور تھی جولائی اور اگست کشمیر جانے کے لئے اچھا وقت نہیں ہے، اور مجھے وہاں رہنے سے کچھ فائدہ بھی نہ ہوا، مگر ستمبر کے ساتھ بہت خوش گوار تبدیلی ہوئی اور میری حالت تیزی کے ساتھ بہتر ہونے لگی۔ میری خوراک بڑھ گئی اور میں ورزش کرنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں ایک مہینہ اور ٹھہر سکتا تو میری صحت بالکل بحال ہوجاتی

جو میں سمجھتا تھا وہی پیش بھی آیا. جنگ کے خاتمہ کے کچھ عرصہ بعد لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں عام انتخابات ہوں گے جیسے ہی مجھے اس اعلان کی خبر ملی، میں نے محسوس کیا کہ اب سیاسی قیدیوں کے سوال کو اٹھانے کا وقت آگیا ہے جب عام انتخابات کا اعلان کر دیا گیا تھا، تو ان لوگوں کو گرفتار رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی تھی. میں نے لارڈ ویول کو گلمرگ سے لکھا کہ میں نے سیاسی قیدیوں کے مسئلے کو شملہ میں پیش نہیں کیا، اس لئے کہ موقع مناسب نہیں تھا مگر اب حالات بدل گئے ہیں، جنگ ختم ہو گئی ہے اور عام انتخابات کا اعلان کر دیا گیا ہے، اس لئے تمام سیاسی قیدیوں کو معاف کر دینا چاہیے. یہ اقدام ہندوستانی قوم اور حکومت دونوں کے مفاد کے لئے ضروری ہے. جہاں تک خود قیدیوں کا تعلق ہے، وہ برسوں جیل میں رہ چکے ہیں اور چند مہینے اور کاٹ لیں گے، ان کا گرفتار رہنا انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا مگر سمجھوتے کے امکانات کو کم کر دے گا اگر حکومت ایک نئی سیاسی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے تو اسے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا ہوگا.

لارڈ ویول نے تار کے ذریعے جواب دیا کہ وہ میری رائے سے متفق ہیں اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے احکامات جاری کر رہے ہیں. لیکن انھوں نے معافی اور رہائی کا عام حکم جاری نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر کانگریسی قیدی چھوڑ دئے گئے، مگر چند نسبتاً انتہا پسند کارکن قید رہے. ان میں جے پرکاش نرائن،

دوستانہ برتاؤ رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے مناسب ہوگا اگر ہم اسے اپنے خلوص کو ثابت کرنے کا موقع دیں۔ میری قطعی رائے تھی کہ ہمیں کوئی نئی تحریک شروع نہ کرنا چاہیے بلکہ عام انتخابات میں شریک ہونا چاہیے میں نے یہ بھی کہا کہ شملہ کانفرنس ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش تھی، اور اگرچہ وہ ناکامیاب ہوئی لیکن ہم کو اس اسپرٹ کی قدر کرنا چاہیے جو لارڈ ویول نے ظاہر کی تھی، اور اب جو لیبر پارٹی برسراقتدار ہے تو ہمیں دیکھنا چاہئے کہ آگے کیا ہوگا۔ بہت بحث مباحثہ کے بعد میری رائے بالآخر مان لی گئی۔

اس کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ سیاسی قیدیوں کے سوال کو اٹھاؤں حکومت ہند نے ورکنگ کمیٹی کو رہا کر دیا تھا، لیکن کانگریس کے ہزاروں معمولی ممبر اب تک جیل میں تھے شملہ کانفرنس کے موقع پر مجھے صحیح اندازہ تھا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا، اس لئے میں نے کانفرنس میں تمام سیاسی قیدیوں کی عام معافی اور رہائی کے سوال کو پیش نہیں کیا۔

کانفرنس کے بعد دو واقعے ہوئے جنھوں نے فضا کو بالکل بدل دیا پہلا واقعہ لیبر پارٹی کی مکمل فتح تھی، اور دوسرا ایٹم بم کا گرانا اور جنگ کا خاتمہ۔ اب قومی اور بین الاقوامی صورت حال بہت زیادہ صاف ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہمیں اپنی پالیسی میں خاص طور پر دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، یعنی ایک طرف ہندوستانی قوم میں جدوجہد کی روح کو تازہ رکھنا اور دوسری طرف ہر قسم کے اندھا دھند اقدام سے پرہیز کرنا۔

ہندوستانی قوم کی تاریخ بن گئی ہے جو اپنی قید کی زنجیروں سے زور آزمائی کر رہی تھی اور برابر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں لگی تھی ابتدا میں وہ ایک چھوٹی سی جماعت تھی، مگر وہ بڑھتی اور اس وسیع ملک میں پھیلتی رہی اور شہروں اور دور افتادہ گاؤوں میں عوام کو آزادی کا پیغام سناتی رہی ان عوام سے اس نے اختیار اور طاقت حاصل کی ہے، اور بڑھتے بڑھتے ایک زبردست جماعت بن گئی ہے جو ہندوستان کے اس ارادے کی حقیقی جاگتی اور جوش دلانے والی علامت ہے کہ وہ آزادی اور خود مختاری حاصل کرے گا پشت در پشت اس نے اپنے آپ کو اس مقدس مقصد کے لئے وقف کیا ہے، اور اس کے نام سے اور اس کے جھنڈے کے پیچھے بے شمار مردوں اور عورتوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں. خدمت اور قربانی کی بدولت اس نے ہماری قوم کے دل میں گھر کر لیا ہے اور اس کے اس ارادے نے کہ کسی طرح سے بھی قوم کی بے عزتی کو گوارا نہ کرے گی غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک طاقتور تحریک پیدا کردی ہے

«کانگریس کی کارگذاری کی تاریخ میں عوام کی بھلائی کے لئے تعمیری کام اور آزادی حاصل کرنے کے لئے مسلسل جد و جہد دونوں شامل ہیں. اس جد و جہد میں اس نے کئی مرتبہ نازک حالات کا سامنا کیا ہے اور ایک عظیم‌الشان سلطنت کی فوجی قوت سے بار بار ٹکر لی ہے. اس نے امن پسند طریقوں سے کام لیا، اس لئے وہ ان مقابلوں میں صرف سلامت ہی نہیں

رامانند مشرا اور کئی اور لوگ شامل تھے۔

میں اپنی مداخلت کے اس نتیجے سے مطمئن نہیں تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب باقی سب لوگ چھوڑ دئیے گئے ہیں تو تھوڑے سے انتہا پسند لوگ کیوں قید رکھے جائیں حکومت ہند کو ان پر شبہے تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ان کا طرز عمل دوسرے کانگریسی کارکنوں سے مختلف تھا۔ جنھوں نے «ہندوستان چھوڑ دو» کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ ستمبر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا بمبئی میں اجلاس ختم ہوا تو میں نے اور لارڈ ویول کو لمبا اور مفصل خط لکھ کر سمجھایا کہ یہ مٹھی بھر قیدی رہا نہ کئے گئے تو اس کا ملک پر برا اثر ہوگا اور اگر وہ ملک میں اچھی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قیدیوں کی عام معافی پر راضی ہو جانا چاہیے آخر میں لارڈ ویول میری بات مان گئے اور سب قیدی چھوڑ دئیے گئے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے طے کیا تھا کہ ورکنگ کمیٹی ایک الکشن مینی فیسٹو تیار کرکے اس کے سامنے غور اور منظوری کے لئے پیش کرے اس نے ورکنگ کمیٹی کو اس کا بھی مختار کیا کہ مرکزی الکشن کمیٹی کی طرف سے بطور تمہید ایک مینی فیسٹو جاری کر دے۔ چونکہ الکشن قریب آگئے تھے، اس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ دوبارہ نہ کیا جا سکا اور ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل مینی فیسٹو اپنی ذمہ‌داری پر شایع کر دیا۔

«ساٹھ سال سے کانگریس ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ اس لمبی مدت میں اس کی تاریخ اس

آزادی کا تحفظ کیا جائے گا۔ اس کی رائے میں اس دستور کو وفاقی ہونا چاہئے جس میں اراکین وفاق کو بہت کچھ خود مختاری دی جائے، اور جس کے قانون ساز شعبے بالغوں کے عام حق رائے دہندگی کی بنا پر منتخب کئے جائیں۔

«ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کے بدیسی راج نے ملک کی نشو و نما کو روک دیا ہے اور بہت سے ایسے اہم مسئلے پیدا کئے ہیں جن کو فوراً حل کرنا ضروری ہے، اس دوران میں ملک اور ملک والوں کو ایسے منظم طریقے سے نفع اندوزی کا ذریعہ بنایا گیا ہے کہ عوام بد حالی اور فاقہ کشی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ملک صرف سیاسی اعتبار سے محکوم اور ذلیل کر کے نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ وہ معاشی، سماجی، تہذیبی اور روحانی اعتبار سے بہت پیچھے گر گیا ہے، جنگ کے دوران میں اور اب بھی غیر ذمہ دار حکومت کی نفع اندوزی اور ہندوستانیوں کے مفاد اور ان کے خیالات کی نظر اندازی پھر عروج پر پہنچی ہے، اور انتظامی نا اہلیت کا نتیجہ ہیبت ناک قحط اور عام بد حالی کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ آزادی اور خود مختاری کے سوا ان اہم مسئلوں کا اور کوئی حل نہیں ہے، سیاسی آزادی کا ماحصل معاشی بھی ہونا چاہئے اور سماجی بھی

«افلاس کی بلا کو دور کرنا اور عوام کے معیار زندگی کو بہتر کرنا ہندوستان کے مسائل میں سب سے اہم اور فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ کانگریس کی توجہ خاص طور پر عوام کی بہبودی اور ترقی کی طرف رہی ہے اور یہی اس کی تعمیری سرگرمیوں

رہی بلکہ ان سے اس کو نئی طاقت حاصل ہوئی پچھلے بیں سالوں کے بے مثال عوامی ابتلاء اور انہیں دبانے کی ظالمانہ اور بے رحم کوششوں کے بعد کانگریس پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ ابھری ہے، اور ہماری قوم، جس کا اس نے طوفانوں اور مصیبتوں میں ساتھ دیا ہے اب اس سے بہت زیادہ محبت رکھتی ہے۔

کانگریس ہندوستان کے ہر شہری، مرد یا عورت کو مساوی حیثیت اور ترقی کے موقع دینا چاہتی ہے وہ تمام جماعتوں اور فرقوں میں اتحاد چاہتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ یہ ایک دوسرے سے رواداری برتیں، ایک دوسرے کے خیرخواہ ہوں۔ وہ چاہتی ہے کہ قوم کو اپنی خواہش اور اپنی توفیق کے مطابق بڑھنے اور ترقی کرنے کا پورا موقع ملے وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ قوم اور ملک کے ہر گروپ اور ہر علاقے کو اس بڑے نظام کے اندر اپنی زندگی اور اپنی تہذیب کو ترقی دینے کی آزادی ہو، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ چاہتی ہے کہ ان علاقوں یا صوبوں کی حد بندی، جہاں تک ہوسکے لسانی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے کی جائے وہ چاہتی ہے کہ ان تمام لوگوں کو ان کے حقوق دلوائے جائیں جو سماجی ظلم اور بے انصافی برداشت کرتے رہے ہیں اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے جن کی بدولت ان کو دوسروں کے مساوی حیثیت نہیں مل سکتی ہے۔

«کانگریس کی نظر میں ایک آزاد، جمہوری ریاست ہے جس میں دستور کے ذریعے تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور شہری

ہندوستاں کو تمام قوموں ، اور خاص طور سے مشرق اور مغرب اور شمال میں اپنے پڑوسیوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہئے۔ مشرق بعید، جنوب مشرقی اور مغربی ایشیا سے ہندوستاں کے ہزاروں برس تک تجارتی اور تہذیبی تعلقات رہے ہیں اور یہ لازمی بات ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے ساتھ وہ ان تعلقات کی تجدید کرے اور انہیں بڑھائے تحفظ کی تدبیروں اور تجارت کے رجحانات کا بھی تقاضا ہے کہ ان علاقوں سے قریبی تعلق ہو۔ ہندوستاں نے اپنی آزادی کی جدوجہد عدم تشدد کے اصول پر کی ہے۔ اس لئے اس کا وزن ہمیشہ امن عالم اور باہمی تعاون کا بول بالا کرنے کے لئے استعمال ہوگا۔ وہ تمام محکموں کی آزادی کا حمایتی بھی ہوگا، اس لئے اس عالم کی بنیاد اسی آزادی پر اور ہر جگہ سے امپریلیزم کے اخراج پر رکھی جاسکتی ہے۔

"۸ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک ریزولیوشن منظور کر لیا تھا، جو اس کے بعد ہندوستاں کی داستاں کا مشہور ٹکڑا ہو گیا۔ کانگریس اسی ریزولیوشن اور اس کے نعرۂ جنگ کے ساتھ مرکزی اور صوبجاتی اسمبلیوں کے انتخاب کے موقع پر میدان میں آتی ہے۔

" مرکزی لیجسلیٹیو اسمبلی ایک جماعت ہے، جس کے پاس کوئی اختیار اور اقتدار نہیں اور عملاً وہ ایک مشاورتی جماعت ہے، جس کے مشورے کا برابر مذاق اڑایا گیا ہے اور اس کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ پرانے زمانے کی یادگار ہے اور اس کا حلقہ انتخاب بہت محدود ہے۔ رائے دہندوں کے رجسٹر غلطیوں اور

کا مقصد ہے اس سے ہر تجویز اور ہر تبدیلی کو اس معیار پر جانچا ہے کہ اس کے عوام کی بہبودی اور ترقی پر کیا اثر ہوگا، اور وہ علانیہ کہتی رہی ہے کہ ہمارے عوام کی بہبودی میں جو رکاوٹیں ہوں انہیں دور کر دینا چاہئے صنعت اور زراعت، جماعتی مفاد اور رفاہ عام کے محکموں اور اداروں کو ترقی دینا چاہئے اور ان کے طریق کار کو جدید طرز پر لانا اور کام کو جلد از جلد پھیلانا چاہئے تا کہ ہمارے ملک کی دولت میں اضافہ ہو اور اس میں دوسروں پر بھروسا کئے بغیر اپنی کوشش سے بڑھنے کا مادہ پیدا ہو مگر جو کچھ کیا جائے اس کا پہلا مقصد اور سب سے اعلیٰ غرض یہ ہونا چاہئے کہ ہمارے عوام کو فائدہ پہنچے، ان کی زندگی کی معاشی، تہذیبی، اور روحانی سطح اونچی ہو، اُن میں بے روزگاری کم ہو اور فرد کی عزت بڑھے اس مقصد کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم ہر میدان میں جماعتی ترقی کا پہلے سے پلان بنا کر اس کے مختلف پہلوؤں کو مربوط کریں، دولت اور اقتدار کو چند افراد اور چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں میں جمع ہوجانے سے روکیں، جماعت دشمن اغراض کو بڑھنے سے روکیں اور معدنی ذخیروں، آمد و رفت کے وسائل اور زمین، صنعت اور قومی سرگرمیوں کے دوسرے شعبوں پر جماعت کا اختیار رکھیں، تا کہ آزاد ہندوستان امداد باہمی پر مبنی ریاست ہوجائے۔

« بین اقوامی دنیا میں کانگریس چاہتی ہے کہ آزاد قوموں کا ایک وفاق قائم ہو۔ جب تک کہ ایسے وفاق کی تشکیل نہ ہوجائے،

اس کام سے جو انتخاب کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ الکشن جو ہو رہا ہے، ایک معمولی سی آزمائش ہے یہ ہمیں ان بہت بڑی باتوں کے لئے تیار کریگا جو آنے والی ہیں۔ آئیے ہم سب، جو ہندوستان کو آزاد اور خود مختار کرنے کی آرزو رکھتے ہیں اس آزمائش کا قوت اور اعتماد کے ساتھ سامنا کریں اور اس آزاد ہندوستان کی طرف، جس کے خواب ہم دیکھ رہے ہیں قدم ملا کر آگے بڑھیں »

جیسے کہ عام توقع تھی، کانگریس کو بنگال، پنجاب اور سندھ کے سوا باقی تمام صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہو گئی ان تین صوبوں میں معاملہ بہت الجھا ہوا تھا۔ بنگال میں مسلم لیگ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی اور اس نے تقریباً آدھی نشستوں پر قبضہ کر لیا تھا پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور لیگ کی تعداد تقریباً برابر تھی سندھ میں مسلم لیگ نے بہت سی نشستیں حاصل کیں مگر اکثریت حاصل نہ کر سکی ان تینوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلم لیگ نے مذہبی تعصب اور فرقہ واری جذبات پیدا کرنے کے لئے پروپگنڈا کیا تھا، اس کی وجہ سے سیاسی مسئلوں پر اس طرح پردہ پڑ گیا کہ وہ مسلمان جو کانگریس یا اور کسی پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے بڑی مشکل سے لوگوں کو اپنی بات سننے پر بھی آمادہ کر پاتے تھے۔ شمال مغربی سرحد کے صوبے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیگ کی کی تمام کوششیں ناکامیاب ہوئیں اور کانگریس برسر اقتدار آگئی۔

اس موقع پر ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر ایک نظر

فروگذاشتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کی تصحیح کرنے اور چھوٹے ہوئے نام چڑھانے کے موقع نہیں دئے گئے ہمارے بہت سے ہم خیال جانوں میں ہیں اور بہت سے جو چھوڑ دئے گئے ہیں الکشن وطن کے لئے کھڑے ہونے کے ناقابل ٹھہرائے گئے ہیں۔ کئی جگہوں پر اب بھی پبلک جلسے کرنے میں رکاوٹیں ہیں لیکن ان تمام بندشوں اور دشواریوں کے باوجود کانگریس نے انتخاب میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا ہے، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انتخابات چاہے جتنے محدود ہوں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آزادی کے معاملے میں رائے دینے والوں کی بہت بڑی تعداد متفق ہے اس لئے اس انتخاب میں چھوٹے موٹے مسائل اور افراد اور فرقہ واری نعروں کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ صرف ایک بات کا خیال کیا جائے گا اور وہ ہے ہمارے وطن کی آزادی اور خود مختاری، جس کی بدولت ہماری قوم کو دوسری ہر قسم کی آزادی حاصل ہوگی

«اس لئے کانگریس سارے ملک کے رائے دہندوں سے جو مرکزی اسمبلی کے لئے ووٹ دیں گے، اپیل کرتی ہے کہ انتخابات میں کانگریسی امیدواروں کی ہر طرح سے مدد کریں اور اس نازک موقعے پر جس میں مستقبل کے لئے ہر قسم کے امکانات ہیں کانگریس کا ساتھ دیں۔ ہندوستان کے لوگوں نے کئی مرتبہ آزادی حاصل کرنے کا عہد کیا، اُس عہد کو ابھی پورا کرنا ہے اور وہ عزیز مقصد جس کی یہ علامت ہے، اور جس نے ہمیں اپنی طرف بلایا ہے اب بھی ہم کو بلا رہا ہے لیکن وہ وقت آرہا ہے جب ہم اپنے عہد کو پورا کریں، انتخاب کے ذریعہ سے نہیں بلکہ

کمیونسٹوں کو حکومت سے مختلف طریقوں سے امداد ملتی رہی، کمیونسٹ پارٹی کے خلاف غیر قانونی ہونے کا جو حکم تھا وہ واپس لے لیا گیا اور پارٹی کے لوگ جنگ کا پروپگنڈا کرنے میں شریک ہوگئے

دوسری طرف کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی تھی کانگریسی بہت بڑی تعداد میں گرفتار ہو رہے تھے اور کمیونسٹ جو اب تک گرفتار رہے تھے یا چھپے ہوئے تھے اپنی پارٹی کے لئے علانیہ کام کر سکتے تھے. شملہ کانفرنس کے بعد بھی جب کانگریسی آزاد کر دئے گئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ اور وہ اس انتظار میں تھے کہ کانگریس کوئی فیصلہ کرے.

اس دوران میں سرکاری محکموں میں بڑی تبدیلی ہو گئی تھی، جنگ کے دوران میں بہت سے مختلف صوبوں اور طبقوں کے نوجوان حفاظتی فوجوں میں بھرتی ہوئے. کیونکہ جنگ کی ضرورتوں نے ایسا دباؤ ڈالا تھا کہ پرانا انگریزی طریقہ، کہ آبادی کے چند منتخب حصوں سے لوگ بھرتی کئے جائیں، چھوڑ دینا پڑا. وہ نوجوان جو اب فوجوں میں بھرتی ہوئے تھے برطانیہ کے اس قول کو کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا، صحیح اور سچا مانتے تھے اس عقیدہ کی وجہ سے انہوں نے لڑائی کے زمانے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا. اب جو لڑائی ختم ہو گئی تھی تو وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا فوج کے تینوں حصے بحری بری اور ہوائی میں قوم پرستی کی ایک نئی روح پیدا ہوگئی

اور ڈالنا مناسب ہوگا۔ جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو کمیونسٹ بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ اس لئے کہ ہٹلر اور اسٹالن نے ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ اقدامات سے پرہیز کرنے کا معاہدہ کرلیا تھا، نازسی سویٹ معاہدے سے پہلے کمیونسٹ ہٹلر پر حملے کرنے اور نازسی فلسفۂ حیات کی مذمت کرنے میں بہت پیش پیش تھے۔ ہندوستانی کمیونسٹ دل میں سمجھتے تھے کہ اسٹالن کا اس طرح معاہدہ کرلینا، بڑی سخت غلطی تھی لیکن دوسرے ملکوں کے کمیونسٹوں کی طرح ان کی بھی ہمت نہیں تھی کہ ایسا کہہ سکیں۔ اسلئے انھوں نے کہا کہ یہ سمجھوتہ ایک جنگ کو، جسے وہ امپریلسٹ لڑائی کہتے تھے، محدود رکھنے کی کوشش ہے۔ چونکہ وہ تقریباً بے بس ہوگئے تھے انھوں نے اپنی صفائی میں کہا کہ امپریلسٹ طاقتوں میں ہٹلر سب سے کم برا ہے۔ ایسی رائے رکھنے کی وجہ سے وہ انگریزوں کی مدد نہیں کرسکتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس خیال کی سختی سے تائید کی کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان ہندوستان کو غیر جانبدار رہنا چاہئے۔ لیکن جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو کمیونسٹوں نے پوری قلا باری کھائی انھوں نے کہا کہ یہ جنگ عوام کی جنگ ہے۔ اور برطانیہ کی امداد کے لئے وہ سب ہی کچھ کرنے لگے ہندوستان میں وہ کھلم کھلا جنگ کے پروپگنڈا میں شریک ہوئے اور برطانیہ کی جنگی سرگرمیوں میں پوری طرح مدد کرنے لگے۔ مسٹر ایم این رائے نے حکومت سے کھلم کھلا روپیہ لیا اور جنگ کی موافقت میں پروپگنڈا کرتے رہے

ایک مرتبہ جب میں کلکتہ میں لال بازار سے گذر رہا تھا، میری کار گاڑیوں کے ہجوم میں پھنس گئی بعض پولیس کانسٹبلوں نے مجھے پہچانا اور اپنے بارکوں میں جو قریب تھے خبر پہونچا دی چند منٹوں میں کانسٹبلوں اور ہیڈ کانسٹبلوں کے مجمع نے میری کار کو گھیر لیا انہوں نے مجھے سلام کیا اور بعض نے میرے پاؤں چھوئے. سب نے کانگریس سے اپنا تعلق ظاہر کیا اور کہا کہ وہ ہمارے حکم پر چلینگے ایک اور واقعہ بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے. بنگال کے گورنر نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی. جب میں گورنمنٹ ہاؤس کے اندر چلا گیا تو جو کانسٹبل ڈیوٹی پر تھے انہوں نے میری کار گھیر لی اور جب میں باہر نکلا تو وہ ایک ایک کرکے میرے پاس آئے اور مجھے سلام کیا اور سب نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری فرمانبرداری کریں گے چونکہ میں گورنر کے بلانے پر گورنمنٹ ہاؤس گیا تھا اس لئے مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ اس موقع پر نعرے لگائے جائیں، لیکن کانسٹبل کس طرح سے چپ نہیں رکھے جا سکے اور وہ میرے اعزاز میں نعرے لگانے لگے. یہ اس کا صاف ثبوت تھا کہ ان کی ہمدردی کانگریس کے ساتھ تھی اور ان کو اُسے ظاہر کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا. اگر حکومت انہیں کانگریس سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر سزا دیتی تو وہ اس کے لئے بھی تیار تھے

ظاہر ہے ان واقعات کی خبر حکام تک پہونچائی جاتی تھی. گورنمنٹ کو تفصیلی رپورٹیں ملتی تھیں اور وہ انہیں وزیر ہند کے پاس بھیج دیتی تھی انگریزوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی تاریخ

تھی، دراصل ان میں اتنا جوش تھا کہ جب ان کی کسی کانگریسی لیڈر سے ملاقات ہوتی تو وہ اسے چھپا نہ سکتے۔ میں اس دوران میں جہاں بھی گیا فوج کے نوجوان بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ان کے یورپین افسروں پر کیا اثر ہوگا، میرا خیر مقدم کرنے اور اپنی ہمدردی اور قدردانی ظاہر کرنے کے لئے آئے جب میں کراچی گیا تو بیڑے کے چند افسر مجھ سے ملنے آئے انہوں نے کانگریسی پالیسی کی تعریف کی اور کہا کہ اگر کانگریس نے حکم دیا تو وہ ہماری طرف آجائیں گے اگر کانگریس اور حکومت میں تصادم ہوا تو وہ حکومت کا نہیں کانگریس کا ساتھ دیں گے بمبئی میں بھی سیکڑوں بحری افسروں نے یہی خیالات ظاہر کئے

یہ خیالات صرف افسروں میں نہیں بلکہ معمولی سپاہیوں میں بھی بہت پھیلے ہوتے تھے۔ میں صوبے کی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں ہوائی جہاز سے لاہور گیا۔ ایک گورکھا رجمنٹ کی جو لاہور میں مقیم تھی، ہوائی اڈے کے پاس چھاؤنی تھی۔ جب سپاہیوں نے سنا کہ میں آرہا ہوں تو ان میں سے سیکڑوں صف بستہ کھڑے ہوگئے اور کہا کہ میرا درشن چاہتے ہیں۔ پولس والوں میں بھی ایسا ہی جذبہ تھا۔ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں پولس والے حکومت کے سب سے وفادار حامی تھے۔ انہیں سیاسی کارکنوں سے بہت کم ہمدردی تھی اور وہ اکثر ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اب ان کے خیالات بھی بدل گئے تھے اور وہ کانگریس کی وفاداری میں کسی اور گروپ کے پیچھے نہیں تھے۔

انوگرہ نرائن سنہا کے درمیان بہت شدید اور پرانی رقابت تھی۔ پھر ڈاکٹر سید محمود کا سوال تھا، جن کے قلعہ احمد نگر کے جیل جانے سے رہا ہونے کے بعد بعض کانگریسی مخالف ہوگئے تھے۔ آخر میں یہ تینوں وزارت میں شامل ہوگئے، اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور بہار کے دوسرے اہم کانگریسی لیڈروں کی تائید سے ہوا

میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ وزارتیں بنانے کے معاملے میں ہمیں لیگ کے ساتھ فیاضی سے کام لینا چاہئے۔ جہاں کہیں بھی امیدوار لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے تھے وہاں میں نے ان کو بلایا اور وزارت بنانے کے منصوبے میں اشتراک کی دعوت دی یہ میں نے ان صوبوں میں کیا جہاں کانگریس کو مکمل اکثریت حاصل تھی اور ان صوبوں میں بھی جہاں وہ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی مجھے معلوم تھا کہ کئی صوبوں اور خاص طور سے بہار، آسام اور پنجاب میں مسلم لیگی ممبر بہت خوشی سے شریک ہوتے۔ لیکن مسٹر جناح کی پالیسی تھی کہ انہیں کانگریس کے ساتھ اشتراک کرنے سے روکا جائے۔

پنجاب میں صورت حال خاص طور سے پیچیدہ تھی۔ صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اسمبلی میں کسی پارٹی کی اکثریت نہیں تھی مسلمان ممبر یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم ہوگئے تھے۔ میں نے دونوں گروہوں سے گفتگو کی لیکن مسٹر جناح کی ہدایت پر لیگی ممبروں نے میری دعوت قبول نہیں کی۔ پھر بھی میں اس نہج پر گفتگو کرسکا کہ یونینسٹ

میں پہلی دفعہ پوری قوم میں آزادی کی خواہش ایک شعلے کی طرح بھڑک اٹھی ہے۔ سیاسی آزادی اب صرف کانگریس کا نہیں بلکہ ہر طبقے کے لوگوں کا مقصد تھی۔ اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ سول فوجی محکموں کے ہر طبقے کے لوگ بھی اس جذبہ سے متاثر تھے۔ اب آزادی کی اس اُمنگ میں کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ حفاظتی فوجوں کے سپاہی اور افسر، سب کھلم کھلا کہتے تھے کہ انہوں نے اپنا خون اس وعدہ کے بھروسہ پر بہایا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان آزاد ہوجائے گا اب وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ یہ وعدہ پورا کیا جائے۔

عام انتخابات کے بعد ہر صوبے میں نئی وزارت بنانے کا سوال پیدا ہوا۔ اب میرے لئے ضروری ہوگیا کہ صوبوں کے دار الحکومت میں جاؤں اور وزارتیں بنانے کی کارروائی کی نگرانی کروں۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لیکن ہوائی سفر نے اس مشکل کو آسان کرنے میں مدد پہونچائی۔ جنگ کے زمانے میں تمام ہوائی آمد و رفت کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسی کے ذریعہ جگہ بھی ملتی تھی۔ لارڈ ویول نے ہدایتیں جاری کردیں کہ میرے لئے ہر طرح کی آسانی مہیا کی جائے اور اس کی وجہ سے میں تمام صوبوں کے دار الحکومت میں جاسکا۔

جب میں وزارت بنانے کے لئے بہار آیا تو میں نے دیکھا کہ کانگریس کے اندر مختلف گروپوں کی رقابتوں نے معاملہ کو بہت پیچیدہ کردیا تھا۔ ان رقابتوں کے علاوہ ممتاز کانگریسی لیڈروں کے ذاتی جھگڑے تھے۔ ڈاکٹر شری کرشن سنہا اور ڈاکٹر

ان کے خاندان سے میرے دوستانہ تعلقات پنڈت موتی لال نہرو کے زمانے سے تھے۔ شروع میں، میں جواہر لال کو اپنے بھائی کا لڑکا سمجھتا تھا اور وہ مجھے اپنے والد کا دوست سمجھتے تھے۔

جواہر لال کی طبیعت میں محبت اور فیاضی ہے اور وہ رشک کے جذبہ سے نا آشنا ہیں۔ لیکن ان کے عزیزوں اور دوستوں میں بعض لوگ تھے جن کو ہمارے دوستانہ تعلقات پسند نہیں تھے اور جو چاہتے تھے کہ ہمارے درمیان غلط فہمیاں اور رشک و رقابت پیدا کرادیں۔ جواہر لال کی کمزوری ہے کہ وہ ہر معاملے کو اصولی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور ان لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر ان کو میرے خلاف کردیا۔ انہوں نے ان کو سمجھایا کہ کانگریس کا یونینسٹ پارٹی سے اتحاد اصولاً غلط ہے۔ کانگریس کو یونینسٹ پارٹی سے نہیں بلکہ مسلم لیگ سے اتحاد کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ مسلم لیگ عوامی پارٹی ہے۔ یہ بحث کا ایک اندازہ تھا جسے کمیونسٹوں نے کھلم کھلا اختیار کیا تھا۔ جواہر لال پر کسی حد تک ان لوگوں کے خیالات کا اثر تھا اور ممکن ہے انہوں نے یہ سوچا ہو کہ یونینسٹ پارٹی سے اتحاد کرکے میں انقلاب پسندی کے اصولوں کو قربان کررہا ہوں

جو لوگ جواہر لال کے اور میرے درمیان اختلافات پیدا کرنا چاہتے تھے وہ ان سے کہتے رہے کہ جس طرح میرے گن گائے جاتے ہیں اس سے دوسرے کانگریسی لیڈروں کے حیثیت میں فرق آتا ہے۔ وہ ان کی شرافت سے واقف تھے، اس لئے انہوں نے اس سلسلے میں دوسروں کا زیادہ اور جواہر لال کا کم ذکر کیا۔

پارٹی کو کانگریس کی مدد سے وزارت بنانے کا موقع مل گیا۔ گورنر خود مسلم لیگ کی طرف مائل تھا لیکن اس نے دیکھا کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر، خضر حیات خاں کو وزارت بنانے کی دعوت دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پنجاب میں کانگریس پہلی دفعہ حکومت میں شریک ہوئی تھی اور یہ ایسی صورت حال تھی جسے اب تک ناممکنات میں سے سمجھا جاتا تھا۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں میں اس کا اعتراف کیا گیا کہ ان گفتگوؤں میں جن کا نتیجہ پنجاب کی نئی وزارت تھی، میں نے بڑی ہوشیاری اور تدبر سے کام لیا۔ اور ایسے لوگوں نے، جو کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، میری بے تکلف تعریف کی۔ نیشنل ہیرلڈ نے، جو یو پی کانگریس کا اخبار ہے، میرے اس طریقے کو سراہا جس سے میں نے پنجاب کے پیچیدہ اور مشکل مسئلے کو حل کیا تھا اور یہاں تک کہا کہ جس موقع شناسی سے میں نے کام لیا تھا وہ کانگریسی لیڈروں کے تدبر اور معاملہ فہمی کے ساتھ گفتگو کرنے کی بہترین مثالوں میں سے ہے۔

مجھے ملک سے اس طرح داد ملنے پر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے ایک نتیجے سے، جس کا اثر خوش قسمتی سے وقتی تھا، مجھے خاصا رنج ہوا جب سے میں نے کانگریس میں کام کرنا شروع کیا تھا جواہر لال کی اور میری بڑی اچھی دوستی رہی۔ ہم ہمیشہ ایک خیال کے رہے اور ایک نے دوسرے کو سہارا دیا۔ ہمارے درمیان رقابت اور رشک کا سوال کبھی پیدا نہیں ہوا اور میں سمجھتا تھا کہ کبھی پیدا بھی نہ ہوگا۔ دراصل

ہے۔ اس کی وجہ سے وہ سودا کرنے پر مجبور ہوگی اور ممکن ہے وہ اپنے اصولوں سے منحرف ہوجائے۔ میں نے کہا کہ اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ کانگریس اپنے اصولوں کو چھوڑ دے گی، مگر ساتھ ہی صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کو میرا لاہور کا فیصلہ منظور نہیں ہے تو وہ جو پالیسی چاہے اختیار کرسکتی ہے کانگریس نے وزارت میں شریک رہنے کی کوئی ذمہ داری نہیں لی ہے اور جب چاہے اسے چھوڑ سکتی ہے

گاندھی جی نے بہت شدت کے ساتھ میری تائید کی انہوں نے کہا کہ اگرچہ پنجاب میں کانگریس کی اقلیت تھی، مگر اس نے وزارت کے بنانے اور اس کا کام چلانے میں فیصلہ کن حیثیت حاصل کرلی ہے، اور کانگریس کے نقطۂ نظر سے مسئلے کا کوئی اور بہتر حل نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے وہ میرے فیصلے میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے خلاف تھے جب گاندھی جی نے اس طرح ایک قطعی بات کہہ دی تو کانگریس کمیٹی کے دوسرے ممبر میرے ساتھ ہوگئے اور جواہر لال کو سب کی رائے ماننی پڑی

ممکن ہے جواہر لال نے محسوس کیا ہو کہ بات بہت بڑھ گئی اور شاید اس سے مجھے دکھ ہوا ہو۔ میں حسب معمول بھولا بھائی دیسائی کے یہاں ٹھہرا تھا۔ جواہر لال دوسرے صبح تڑکے میرے پاس آئے اور بہت محبت اور خلوص سے مجھے اطمینان دلایا کہ تنقید کرنے میں ان کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ میری قیادت پوری طرح قابل اعتماد نہیں رہی ہے۔ انہوں نے اس کا بے تکلف اعتراف

لیکن انہوں نے کہا کہ اگر خود ان کا اصرار اس طرح میری مدح سرائی کرتا رہا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس میں میرا کوئی ہمسر نہیں رہ جائے گا، اور یہ کانگریس کے اندر مساوات قائم رکھنے کے لئے مفید نہ ہوگا۔

میں یہ نہیں سمجھتا کہ جواہر لال پر شخصیات کا کچھ اثر ہوا، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ اصولی معاملوں میں فتنہ انگیز استدلال اپنا کام کر گیا ہو۔ بہر حال، بمبئی کی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں میں نے دیکھا کہ وہ ہر مسئلے میں میرے طرز عمل پر اعتراض کررہے ہیں، جوکہ اس وقت سے جب کہ ہم نے کانگریس میں ساتھ کام شروع کیا تھا، اب تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ جواہر لال نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ میں نے پنجاب میں جو پالیسی اختیار کی وہ صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ میں نے کانگریس کا اعتبار کم کردیا ہے اس پر مجھے تعجب بھی ہوا اور تکلیف بھی میں نے پنجاب میں کیا یہ تھا کہ کانگریس کو وزارت میں شامل کردیا، اگرچہ گورنر کی کوشش تھی کہ مسلم لیگ کی وزارت بنے میری جد و جہد کی وجہ سے مسلم لیگ کونے میں ڈال دی گئی تھی، اور اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کی سیاست میں کانگرس فیصلہ کن طاقت بن گئی تھی۔ خضر حیات خاں کانگریس کی حمایت کے بل پر چیف منسٹر ہوئے تھے اور ظاہر ہے اس وجہ سے کانگریس کے اثر میں آگئے۔

جواہر لال کی رائے تھی کہ ایسی صورت میں جب اس کی اکثریت نہ ہو، کانگریس کا وزارت میں شریک ہونا صحیح نہیں

اس نے حفاظت کی خاطر برطانوی فوج تعینات کر دی اور ہندوستانی بیڑے کے تمام جہازوں پر انگریز افسر اور ملاح مقرر کر دئیے۔

میرے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ یہ عوامی تحریک یا عملی احتجاج کے لئے مناسب موقع نہیں ہے۔ ہم کو دیکھنا تھا کہ کیا ہوتا ہے اور برطانوی حکومت سے گفتگو ہی کرنا تھا اس لئے میرے نزدیک ہندوستانی بیڑے کے افسروں کی یہ چال غلط تھی۔ اگر نسلی امتیاز کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچتی تھی تو یہی تکلیف فوج اور ہوائی بیڑے کے لوگوں کو بھی تھی۔ ان کا احتجاج کرنا تو حق بجانب تھا، لیکن اس طرح کا عملی احتجاج مجھے مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔

مسز آصف علی نے بیڑے کے افسروں کے معاملے کو اپنا لیا اور ان کی بہت جوشیلی حمایتی بن گئیں۔ وہ میری تائید حاصل کرنے کے لئے دہلی آئیں، میں نے ان سے کہا کہ بیڑے کے افسروں نے مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیا ہے اور انہیں بغیر کسی شرط کے اپنی جگہوں پر واپس جانا چاہیے۔ بمبئی کانگریس کمیٹی نے مشورے کے لئے مجھے ٹیلیفون کیا اور میں نے اس کو بھی تار کے ذریعے یہی جواب دیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس وقت بمبئی میں تھے، انہوں نے بھی مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بیڑے کے افسروں نے غلط قدم اٹھایا ہے اور انہیں اپنے کام پر واپس جانا چاہیے۔ سردار پٹیل نے پوچھا کہ اگر حکومت ان لوگوں کو کام پر واپس آنے کا موقع نہ دے تو انہیں

کیا کہ وہ معاملے کو ٹھیک سمجھ نہیں سکے تھے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم دونوں اس واقعے کو بھول جائیں. مجھے ان سے اسی کی توقع تھی ان کی طبیعت ایسی ہے کہ اگر ان پر کسی خیال کا اثر ہوتا ہے تو وہ بغیر کسی محفوظ ذہنی کے اسے بیان کردیتے ہیں، اور اگر بعد میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر تھے تو وہ بے تکلف اس کا اعتراف بھی کرلیتے ہیں. میں ان کی صاف گوئی پر بہت خوش ہوا. ہم دونوں میں بڑی اچھی دوستی رہی ہے اور مجھے اس کا بہت بڑا دکھ ہوا تھا کہ ہمارے درمیاں غلط فہمی ہوگئی.

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستانی بیڑے کے کچھ افسر کراچی میں مجھ سے ملے تھے منجملہ اور شکایتوں کے انہوں نے نسلی امتیاز کا بھی ذکر کیا تھا، اور کہا تھے کہ اب تک اس امتیاز کے خلاف انہوں نے جو اجتماعی درخواستیں دی تھیں اور احتجاج کیا تھا اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے ان کی بےاطمینانی بڑھتی رہی اور دہلی میں، میں نے ایک بارگی یہ خبر پڑھی کہ انہوں نے عملی احتجاج شروع کردیا ہے اور حکومت کو مطلع کیا ہے کہ اگر ایک مقرر تاریخ تک ان کے مطالبے پورے نہ کئے گئے تو وہ سب ایک ساتھ استعفاء دیدیں گے یہ تاریخ گذر گئی ہے اور انہوں نے اپنے فیصلے کے مطابق بمبئی میں ایک عام جلسہ کیا ہے، اس خبر کو سن کر سارے ملک میں بجلی کی لہر سی دوڑ گئی اور قوم کی بہت بڑی اکثریت ان کے ساتھ ہوگئی. حکومت بھی اس سے بہت پریشان ہو گئی،

کیا جس میں بیڑے کے افسروں کو کام پر واپس جانے کو کہا گیا تھا اور انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ انہیں کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔

موجودہ حالات کے پس منظر میں بیڑے کے افسروں کی بغاوت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب کہ حفاظتی فوج کے ایک حصہ نے سیاسی اختلاف کی بنا پر انگریزوں کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی۔ یہ بغاوت ایک تنہا مثال نہیں تھی، کیونکہ اس سے پہلے سبھاش بوس کی سرکردگی میں ہندوستانی فوج کے قیدیوں نے انڈین نیشنل آرمی (ہندوستان کی قومی فوج) قائم کی تھی اس فوج نے سنہ ۱۹٤٤ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک موقع پر امپھال پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا۔ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد انگریزوں نے برھما پر دوبارہ قبضہ کیا اور قومی فوج کے بہت سے افسر گرفتار ہو گئے۔ انہیں قومی فوج میں شامل ہونے پر ندامت نہیں تھی اور کئی غداری کے الزام میں عدالت کے سامنے پیش کئے گئے تھے ان باتوں سے انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان سے سیاسی مسئلے کا اطمینان بخش حل نہ سوچا گیا وہ فوج کی وفاداری پر اعتبار نہ کر سکیں گے۔

میں نے قومی فوج کے افسروں کی گرفتاری کی خبر اس وقت سنی جب میں شملہ کانفرنس کے بعد گلمرگ گیا ہوا تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج پرتاب سنگھ صاحب ایک دن بہت پریشانی کی حالت میں میرے پاس آئے اور کہا کہ چند

کیا کرنا چاہئے، میں نے کہا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ حکومت انہیں واپس آجانے کی اجازت دیدے گی. اگر حکومت کوئی دشواریاں پیدا کرے تو پھر ہمیں مناسب کارروائی کرنا چاہیئے.

مجھے اگلے روز وزارت بنانے کے سلسلے میں پیشاور جانا تھا لیکن میں نے اپنا سفر ملتوی کرکے کمانڈر چیف سے ملاقات کی درخواست کی لارڈ اوکن لک نے مجھے دوسرے روز صبح دس بجے پارلیمنٹ ہاؤس میں بلایا. میں نے دو معاملے ان کے سامنے غور کرنے کے لئے پیش کئے.

۱- کانگریس نے بیڑے کے افسروں کے فعل کو ناپسند کیا ہے اور انہیں بغیر کسی شرط کے کام پر واپس جانے کا مشورہ دیا ہے. مگر کانگریس چاہتی ہے انہیں سزائیں نہ دی جائیں اگر حکومت نے کینہ پروری کا طریقہ اختیار کیا تو کانگریس ان لوگوں کے معاملے کو اپنا مسئلہ بنا کر ان کی طرف سے پیروی کرے گی.

۲- نسلی امتیاز کی اور دوسری شکایتیں جو بیڑے کے افسروں کو ہیں ان کی تحقیق کرکے انہیں دور کر دینا چاہیئے.

لارڈ اوکن لک نے بہت دوستانہ انداز سے گفتگو کی، بلکہ ان کا خلوص میری توقع سے بہت زیادہ تھا. انہوں نے کہا کہ بیڑے کے افسر بغیر کسی شرط کے کام پر واپس آگئے تو انہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی جہاں تک نسلی امتیاز کا تعلق ہے وہ پوری کوشش کریں گے کہ اسے بالکل دور کر دیا جائے. ان کے جواب سے مجھے اطمینان ہو گیا اور میں نے ایک بیان شایع

قیدیوں کی حیثیت سے جاپان کی جنگی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان سے سڑکیں بنوائی جاتیں اور کارخانوں میں مختلف کام کرائے جاتے وہ جاپانیوں کے ہاتھ میں کھلونے ہوتے اور ممکن تھا کہ انھیں ہندوستان کو فتح کرنے میں جاپان کا آلۂ کار بنایا جاتا۔ انھوں نے دوسرا رویہ اختیار کیا اور خود ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جب تک کہ وہ جاپان کے قیدی تھے، برطانوی حکومت ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی اگر وہ مجبور ہوکر جاپانیوں کے طرف دار ہوجاتے تو بھی یہ عمل حق بجانب ثابت کیا جاسکتا تھا۔ انھوں نے جو کیا وہ اس سے بہتر تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے مصلحت اسی میں تھی کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرنے کی فوج بنائیں جو جاپانی فوج سے اپنے نظام کو الگ رکھے، کیونکہ اس طرح انھوں نے اس کا انتظام کرلیا کہ اگر انگریز ملک سے نکال دئے گئے تو اس پر قبضہ جاپانیوں کا نہیں بلکہ ہندوستان کی قومی فوج کا ہوگا۔ میرے نزدیک قومی فوج کے لوگوں پر مقدمہ چلانے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

کانگریس کی رائے یہ تھی کہ اگر حکومت کا منشا ہو کہ قومی فوج کے افسروں پر مقدمہ چلائے تو یہ مقدمہ کھلی عدالت میں ہونا چاہئے اور کانگریس کو ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ میں نے اس کے بارے میں لارڈ ویول کو لکھا اور اصرار کیا کہ وہ کانگریس کی رائے کو مان لیں۔ لارڈ ویول راضی ہوئے اور حکم دے دیا کہ لال قلعہ میں افسروں کو کھلی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔ مقدمہ کئی مہینے

ہندوستانی افسر جو سبھاش چندر بوس کے ماتحت انگریزوں سے لڑے تھے گرفتار ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ایک عزیز بھی انھیں میں تھا۔ اس لئے انھیں ان نوجوانوں کے انجام کی بہت فکر تھی، ان کی اپنی حیثیت سرکاری ملازم کی روایتی حیثیت تھی، اور اس وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ اگر کانگریس نے کسی صورت سے اس معاملے میں مداخلت کی تو اس سے ان قیدیوں کو نقصان ہوگا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ کانگریس قومی فوج کے مسئلے سے کوئی تعلق نہ رکھے اور اس طرح مقدمہ سیاست سے پاک رکھا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کی رائے بالکل غلط ہے۔ اگر کانگریس نے اس معاملہ میں دلچسپی نہ لی تو حکومت قومی فوج کے افسروں کو سزا دے گی اور بعض کو سزائے موت بھی ملے گی ان افسروں میں سے بعض ہندوستان کے بہترین نوجوان ہیں اور ان کا قید رہنا یا موت کی سزا پانا بہت بھاری قومی نقصان ہوگا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ قومی فوج کے افسروں کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کانگریس کرے گی اور اسی مضمون کا ایک بیان فوراً پریس میں دے دیا۔

میری رائے کے مطابق برطانوی حکومت کو ان لوگوں کے طرز عمل پر شکایت کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہندوستانی فوج کا ایک حصہ برما اور سنگاپور بھیجا گیا تھا، اور جب جاپانیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کیا تو یہ فوج اپنے حال پر چھوڑ دی گئی، بلکہ ایک برطانوی افسر نے اس فوج کو جاپانیوں کے حوالے کیا۔ اگر ہندوستانی مسکین بنے رہتے تب بھی جنگ کے

میں نے کہا ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مظاہرے ہوئے کلکتہ میں مظاہروں کے سلسلے میں مار پیٹ ہوئی، دہلی میں لوگوں نے سرکاری عمارتوں اور دوسری ملکیتوں کو آگ لگادینے اور ضائع کرنے کی کوشش کی۔ جب میں دہلی واپس آنے کے بعد لارڈ ویول سے ملا تو انہوں نے ان حادثوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ان واقعات سے کانگریس کے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ پر امن فضا میں طے ہوگا۔ میرے لئے اس شکایت کو حق بجانب ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا میں نے دہلی کے تمام کانگریسی کارکنوں کو بلایا اور کہا کہ کانگریس کے سامنے بہت نازک وقت ہے۔ تمام قومی تحریکوں میں ایک منزل آتی ہے جب لیڈروں کو طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ عوام کی رہنمائی کریںگے یا خود ان کے پیچھے پیچھے چلیں گے ہندوستان میں ہم اس منزل پر پہونچ گئے ہیں اور اگر کانگریس کا خیال ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ صرف پر امن طریقوں سے حل ہوسکتا ہے تو اُسے یہ پیغام عوام تک پہونچانا چاہئے اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ کم از کم میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کہ سب سے آسان طریقہ اختیار کروں اور عوام جو کچھ کریں اسے سرجھکا کر مان لوں۔ میری رائے میں دہلی میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ میں اس کی کوشش کرونگا کہ عام رائے کی رہنمائی کروں اور اس کو قابو میں رکھوں۔ میں عوام کی خواہش پوری کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اگر کانگریس کے کارکنوں کو میرا طریقہ پسند نہیں ہے

تک چلا اور اس کی وجہ سے پبلک میں بہت جوش پیدا ہوا۔ آخر کار عدالت کے فیصلے کے مطابق یا وائسرائے کے معاف کردینے کی بنا پر تمام افسر رہا کردئیے گئے۔

لیکن تھوڑے سے ایسے بھی تھے جو قید رہے یا جن کے بارے میں عدالت نے حکم صادر نہیں کیا۔ اس سے پبلک میں بہت ناگواری پھیلی اور ملک کے مختلف حصوں میں مظاہرے کئے گئے۔ جب میں وزارت سازی کے سلسلے میں لاہور گیا تو طالب علموں نے ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور شہر سے ہوتے ہوئے اس مکان تک آئے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا میں نے طالب علموں سے سخت الفاظ میں گفتگو کی اور کہا کہ کانگریس نے جو رویہ اختیار کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے مظاہرے کرنا بالکل بے محل ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ قیدیوں کی طرف سے مقدمہ لڑیںگے اور انہیں رہا کرائیں گے، اور جب تمام قانونی اور دستوری ذریعے استعمال کئے جارہے ہوں اس وقت بے قاعدہ مظاہرے مقصد کے لئے مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا پورا سیاسی مستقبل زیر بحث ہے، برطانیہ میں لیبر پارٹی نے مکمل اکثریت حاصل کی ہے اور وہاں ایک نئی وزارت بنی ہے جس نے ہندوستان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اسے ضروری کارروائی کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ اس لئے کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال کوئی تحریک نہ شروع کی جائے، اور مناسب ہوگا کہ لوگ انتظار کریں اور دیکھیں کہ انہیں کانگریس سے کیا ہدایتیں ملتی ہیں۔

بھولا بھائی کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی اس لئے میں نے ان کو اپنی نئی ورکنگ کمیٹی میں شامل نہیں کیا۔ وہ سنہ ۱۹۴۲ء میں قید نہیں ہوئے اور چوٹی کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو جیل جانے کے باہر رہے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کی رہائی کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ میں بیان کرچکا ہوں انہوں نے پہلے ہندوستان کی جنگ کی سرگرمیوں میں شرکت کی مخالفت کی تھی لیکن رہائی کے بعد انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے بدلے میں ہندوستان کا تعاون پیش کیا تھا۔ ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں اور سیاسی دنیا میں سکوت کی کیفیت طاری رہی دہلی میں بعض لوگوں نے سوچا کہ یہ کیفیت بدلی جاسکے گی اگر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان گفتگو ہونے کے بجائے مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی اور لیگ پارٹی کے درمیان سمجھوتے کی کوشش کی جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ ایسا سمجھوتا کسی خاص مقصد کے لئے اور وقتی ہوگا لیکن اگر جنگ کے دوران میں بھی اس کے مطابق عمل ہو سکا تو اس کی وجہ سے کانگریس اور لیگ کے درمیان جنگ کے بعد مفاہمت کی کوئی مستقل شکل پیدا کرنا زیادہ آسان ہو جائیگا۔

مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر لیاقت علی اور بھولا بھائی دیسائی کے دوستوں نے اس پر گفتگو چھیڑی۔ لیاقت علی اس پر راضی ہوگئے کہ مقدمہ واضح کرنے کے لئے بات چیت ہو اور ان کے اور بھولا بھائی کے درمیان ملاقات ہوئی

بھولا بھائی کو تجویز سے دلچسپی تھی، مگر انہوں نے یہ بات

تو انہیں کوئی دوسرا رہنما تلاش کرلینا چاہئے۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں چند واقعات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے بھولا بھائی ڈیسائی مرکزی اسمبلی کی نئی منتخب شدہ کانگریس پارٹی سے الگ کر دئے گئے۔ بہت سے لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تھا کہ انہیں الگ کر دیا گیا لیکن معاملے کی پوری تفصیل کم ہی لوگوں کو معلوم تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اندرونی واقعات، لوگوں کے علم میں نہ آئیں گے اگر میں انہیں یہاں بیان نہ کردوں۔

بھولا بھائی ڈیسائی بمبئی کے سب سے کامیاب وکیلوں میں تھے اور وقت کے ساتھ ان کا ہندوستان کے ممتاز وکیلوں میں شمار ہونے لگا شروع میں وہ کانگریس کے سرگرم کارکنوں میں نہیں تھے لیکن جب سنہ ۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند منظور ہوا اور کانگریس نے انتخابات میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا تو وہ مرکزی اسمبلی میں کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے وہ مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر چنے گئے اور انہوں نے اپنے فرائض نمایاں کامیابی کے ساتھ انجام دئے۔ اپنی قابلیت اور جوش کی وجہ سے انہوں نے بہت جلد کانگریس کے اندرونی حلقوں میں مرتبہ حاصل کر لیا۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنائے گئے اور اس کے سب سے ممتاز لیڈروں میں شمار ہونے لگے، مگر اس کی وجہ سے ان پر کانگریس کے پرانے ممبر رشک کرنے لگے کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ایک نسبتاً نئے آدمی کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہئے۔

وقت یہ سب بتا دیا، مگر بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر گفتگو بند کر دی گئی اور یہ معاملہ یہیں رہ گیا۔

جب ہم سب سنہ ۱۹۴۵ء میں جیل سے نکلے تو یہ واقعات سننے میں آئے اور کانگریسیوں میں بڑی بحثیں ہوئیں اسوس کا مقام ہے کہ ان بحثوں میں یہ بات بالکل نظر انداز کر دی گئی کہ بھولا بھائی نے جو کچھ کیا تھا گاندھی جی کے علم میں لاکر اور ان کی اجازت سے کیا تھا سردار پٹیل نے اس معاملے میں خاص دلچسپی لی، اور کسی طرح سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ بھولا بھائی نے کانگریس کے پیٹھ پیچھے لیاقت علی سے سمجھوتا کرکے ایکزیکیوٹیو کاؤنسل میں آنے کی کوشش کی تھی۔ میں بتا چکا ہوں کہ بھولا بھائی نے جس تیزی کے ساتھ کانگریس میں ترقی کی تھی اس پر بہت سے کانگریسی رشک کرتے تھے، اور اب وہ اس وجہ سے آپے سے باہر ہوگئے کہ ان کے خیال میں بھولا بھائی نے پارٹی کے ساتھ پوری وفاداری نہیں برتی۔ بھولا بھائی کے مخالف ان کی ذاتی زندگی سے متعلق الزامات لگا کر گاندھی جی کو ان کے خلاف کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان الزامات میں بیشتر جھوٹے تھے، لیکن ان کا کئی مہینے تک مسلسل چرچا کیا گیا اور اس سے بھولا بھائی کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا

بعض ایسے لوگ تھے جو گاندھی جی کے قریبی ساتھیوں کے کانوں میں باتیں ڈال کر گاندھی جی کو متاثر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اور انہیں طرح طرح کی خبریں اس امید میں

صاف کر دی کہ وہ کانگریس کی منظوری کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھا سکیں گے۔ انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ مفاہمت صرف اسمبلی میں دونوں پارٹیوں کے نمائندوں کے درمیان نہ ہو بلکہ خود پارٹیوں کے درمیان ہو۔ مگر کانگریس کے تمام لیڈر جیل میں تھے اور ان سے مشورہ کرنے کا امکان نہ تھا۔ پھر انہوں نے تجویز کیا کہ گاندھی جی کے پاس جائیں اور ان سے مشورہ کریں۔

بھولا بھائی گاندھی جی سے ملے اور لیاقت علی اور دوسرے دوستوں سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کا خلاصہ بیان کیا۔ گاندھی جی کے لئے دوشنبہ کا دن خاموشی کا دن ہوا کرتا تھا، اور چونکہ بھولا بھائی ان سے دوشنبہ کو ملے تھے، گاندھی جی نے اپنا جواب گجراتی میں لکھ کر دیا۔ جواب کا منشا یہ تھا کہ بھولا بھائی کو گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے اور تفصیلات معلوم کرنے کے بعد پھر رپورٹ دینا چاہئے۔

گاندھی جی کی اس اجازت سے تقویت حاصل کرنے کے بعد بھولا بھائی نے گفت و شنید جاری رکھی اور آخر کو اس بات پر دونوں فریق متفق ہو گئے کہ ایگزیکیوٹیو کاؤنسل کی از سر نو تشکیل کی جائے اور اس میں کانگریس پارٹی اور لیگ پارٹی کے نمائندے ہوں، گفتگو کرنے والوں کی خواہش تھی کہ کانگریس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے بھولا بھائی ایگزیکیوٹیو کاؤنسل میں شامل ہوں، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو اس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر عبدالقیوم خان کاؤنسل کے رکن بنیں۔ بھولا بھائی نے گاندھی جی کو رپورٹ دیتے

کانگریس کی طرف سے امیدوار نہیں بنایا گیا۔

اس سے بھولا بھائی کو بہت صدمہ ہوا اور ان کی صحت بگڑ گئی دل کے دورے ان کو پہلے بھی ہوتے تھے، اب یہ جلد جلد ہونے لگے وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے کانگریس کی وفاداری کے ساتھ خدمت کی ہے اس کی خاطر تکلیفیں برداشت کی ہیں، مگر اس کا صلہ انہیں یہ ملا کہ کانگریس برادری سے خارج کر دئیے گئے اور بدنام ہوئے میں اسی زمانے میں بمبئی گیا اور حسب معمول بھولا بھائی دیسائی کے ساتھ ٹھہرا وہ بستر پر لیٹے تھے اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا مزاج کیسا ہے تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کے آنسو بہنے لگے اُنہیں سب سے زیادہ رنج اس کا تھا کہ اصل واقعات سے واقف ہوتے ہوئے بھی گاندھی جی نے انہیں ان کے معترضین سے نہیں بچایا میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے گاندھی جی سے یہ کیفیت بیان کی لیکن اس وقت تک وہ بھولا بھائی کے خلاف اتنی باتیں سن چکے تھے کہ ان کا دل ان کی طرف سے بالکل پھر گیا تھا۔ اس کے تھوڑے دن بعد بھولا بھائی کا حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ مجھے جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بہت رنجیدہ ہوجاتا ہوں اس لئے کہ بھولا بھائی نے کانگریس کی قابل قدر خدمت انجام دی تھی اور بغیر کسی معقول وجہ کے انہیں قصوروار ٹھہرایا گیا۔

سنایا کرتے تھے کہ یہ گاندھی جی تک پہنچ جائیں گی۔ گاندھی جی میں اس کا مادہ تھا کہ اشارے کنائے میں کہی ہوئی یا طعن آمیز باتوں کو نظر انداز کردیں، مگر جب ان کے خاص لوگ کسی بات کو بار بار دہراتے رہتے تو ان پر اثر بھی ہو جایا کرتا تھا مجھے ایک موقع یاد ہے کہ جب انہیں اس طرح پنڈت موتی لال نہرو کی طرف سے بدظن کردیا گیا تھا۔ جواہر لال کے خلاف بھی ایسی ہی ایک مہم شروع کی گئی تھی لیکن دونوں مرتبہ گاندھی جی کو اصل واقعات معلوم ہوئے تو وہ انصاف پسندی اور غیرجانب داری کے ساتھ معاملے پر غور کرسکے۔ بد قسمتی سے بھولا بھائی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، اور گاندھی جی کا دل ان سے ہٹ گیا

میں بتا چکا ہوں کہ جب بھولا بھائی گاندھی جی سے مسلم لیگ سے گفتگو کرنے کی اجازت لینے گئے تھے، تو گاندھی جی کا خاموشی کا دن تھا، جس کی وجہ سے گاندھی جی نے جواب لکھ کر دیا، بھولا بھائی نے اس پرچی کو محفوظ رکھا تھا اور اسے سردار پٹیل اور دوسرے لوگوں کو دکھا کر سمجھایا کہ انھوں نے گفتگو معاملے کو گاندھی جی کے علم میں لاکر اور ان کی اجازت سے کی تھی، اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں آتا۔

دراصل بھولا بھائی کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا، مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا اس کی کسی نے پرواہ نہیں کی اور یہ بات پھیلتی رہی کہ انھوں نے لیگ کے ساتھ سازش کی تھی۔ لوگ اس قدر ان کے خلاف ہو گئے کہ سنہ ۴۶ ـ ۱۹۴۵ء کے جاڑوں میں جب عام انتخابات ہوئے تو انہیں

پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ برطانوی حکومت، ہندوستان کو ایک کیبنٹ مشن بھیجے گی، جو ہندوستان کے نمایندوں سے ملک کی آزادی کے سوال پر گفت و شنید کرے گا. یہی بات اس پروگرام میں بیان کی گئی، جس کا خاکہ وائسرائے کی اسی دن کی تقریر میں پیش کیا گیا معلوم ہوا کہ یہ مشن، لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، تجارتی بورڈ کے پریزیڈنٹ سر اسٹیفرڈ کرپس اور محکمۂ بحر کے پہلے لارڈ، اے وی الگزنڈر پر مشتمل ہوگا، کوئی آدھے گھنٹے کے اندر ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک نمایندہ آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرے اوپر اس خبر کا کیا اثر ہوا؟ میں نے اس سے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ لیبر حکومت نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا ہے، مجھے اس کی بھی مسرت ہے کہ سر اسٹیفرڈ کرپس بھی مشن کے ایک رکن ہوں گے. وہ ہم سے گفتگو کر چکے ہیں، اس لئے ایک پرانے دوست کی طرح ہیں.

میں نے یہ بھی کہا کہ میرے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ نئی حکومت، ہندوستان کے مسئلے سے جی نہیں چرا رہی ہے، بلکہ جراءت کے ساتھ دشواریوں کا مقابلہ کررہی ہے. یہ بہت اہم تبدیلی ہے.

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۴٦ء کو مسٹر ایٹلی نے دار العلوم میں ہندوستان کی صورت حال کے متعلق ایک بیان دیا. اس بیان کی، ہندوستانی، برطانوی تعلقات کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے. انہوں نے صاف تسلیم کرلیا کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور

برطانوی کیبنٹ مشن

میں نے فروری سنہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ ملک کی کایا پلٹ ہوگئی ہے اور ایک بالکل نیا ہندوستان وجود میں آگیا ہے اور تمام ہندوستانی، خواہ سرکاری ملازم ہوں یا عام شہری، آزادی کے ایک نئے جذبے سے لبریز تھے۔ برطانیہ کا رویہ بھی کچھ بدل گیا تھا۔ مجھے شروع ہی سے توقع تھی کہ لیبر حکومت ہندوستان کے معاملے کا صحیح زاوئیے سے مطالعہ کرے گی، اور ایسا ہی ہوا بھی اختیار حاصل ہونے کے جلد بعد اس نے ایک پارلیمنٹری ڈیلیگیشن ہندوستان بھیجا۔ یہ ڈیلیگیشن سنہ ۴۶ـ ۱۹۴۵ء کی سردیوں میں ہندوستان آیا۔ اس کے ارکان سے گفتگو کرکے مجھے اطمینان ہوگیا کہ انہوں نے ملک کے بدلے ہوئے مزاج کا اندازہ کرلیا ہے۔ انہیں یقین ہوگیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کو اب عرصے تک ٹالا نہیں جاسکتا اور انہوں نے حکومت کو جو رپورٹ دی ہوگی، اس سے یقیناً لیبر کیبنٹ کے اس ارادے کو تقویت پہنچی ہوگی کہ جلد سے جلد دوستانہ سمجھوتہ کرلے۔

۱۷ فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو رات کے ساڑھے نو بجے میں ریڈیو سن رہا تھا، جب مجھے برطانیہ کے نئے فیصلے کی خبر ملی، لارڈ

اپنی تقریر کو اس اعلان پر ختم کیا کہ کیبنٹ مشن کا مزاج کچھ کر کے دکھانے کی طرف مائل ہے اور وہ کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ کرکے جارہا ہے۔

کیبنٹ مشن ۲۳ مارچ کو ہندوستان پہنچا سر اسٹیفرڈ کرپس اس سے پہلے جب ہندوستان آئے تھے تو بنگال کے ممتاز کانگریسی لیڈر مسٹر جے۔ سی گپتا نے میزبان کے فرائض انجام دئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ کرپس سے ملنے کے لئے دہلی جارہے ہیں۔ میں نے سر اسٹیفرڈ کے نام ان کو ایک خط دیا، جس میں ان کے دوبارہ ہندوستان آنے پر ان کا خیر مقدم کیا تھا

۲ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کو میں دہلی پہنچا میرا خیال تھا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ، جس پر غور کرنا چاہیے، ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے شملہ کانفرنس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ سیاسی سوال مفاہمت کی ایک منزل تک پہنچ چکا ہے، مگر فرقہ وارانہ اختلافات اب بھی جوں کے توں باقی ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت ہی فکر مند تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صوبوں میں ان کی اکثریت مسلّم تھی، اس لئے ان کو صوبجاتی معاملات میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا، مگر مجموعی حیثیت سے وہ ہندوستان میں اقلیت میں تھے۔ اس لئے وہ اس خوف سے پریشان رہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت اور ان کا مرتبہ محفوظ نہیں رہے گا۔

ان پر ایک نئے نقطۂ نظر سے غور کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ ان کے اس اعلان نے ہندوستان پر بہت اچھا اثر ڈالا کہ اگر پرانے طریقوں پر قائم رہنے کی کوشش کی گئی، تو اس سے مسئلہ حل نہ ہوگا، بلکہ تعطل پیدا ہوجائے گا۔

چند نکتے جو مسٹر ایٹلی نے اپنی تقریر میں بیان کئے تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے یہ بات تسلیم کی کہ دونوں فریق نے غلطیاں کی ہیں اور ساتھ ہی کہا کہ پچھلی باتوں کو دہرانے کے بجائے، ہمیں مستقبل پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ انہوں نے یہ سمجھایا کہ پچھلے نسخوں کو نئی صورت حال پر منطبق کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ جو مزاجی کیفیت سنہ ۱۹٤٦ء میں ہے، وہ سنہ ۱۹۲۰ء، سنہ ۱۹۳۰ء، یہاں تک کہ سنہ ۱۹٤۲ء میں بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کہا کہ وہ نہیں چاہتے کہ ہندوستانیوں میں جو اختلافات ہیں ان کی اہمیت کو نمایاں کریں، کیونکہ اختلافات اور آپس کی پھوٹ کے باوجود تمام ہندوستانی آزادی کی خواہش میں متحد ہیں یہی تمام ہندوستانیوں کا بنیادی مطالبہ ہے، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ یا مرہٹے، سیاست داں یا سول سروس کے لوگ، مسٹر ایٹلی نے صاف طور پر اس کا اعتراف کیا کہ قومیت کا تصور بتدریج ترقی کرتا رہا ہے اور اب یہ ان فوجیوں میں بھی سرایت کرچکا ہے، جنہوں نے دوران جنگ میں شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان میں کچھ سماجی اور معاشی دقتیں ہیں، تو ان کو خود ہندوستان کے لوگ ہی دور کرسکیں گے۔ انہوں نے

جنہیں صوبائی حکومتیں چاہیں تو مرکز کے سپرد کرسکیں۔ انہیں
مرکزی حکومت کی اختیاری فہرست میں شامل سمجھا جاسکے
اور اگر کوئی صوبہ چاہے تو اس فہرست کے تمام یا چند معاملات
میں اپنے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کرسکے۔

میرے نزدیک یہ بات صاف تھی کہ دفاع، رسل و رسائل اور
امور خارجہ ایسے معاملے ہیں، جن کا حق اسی حالت میں ادا
ہوسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مرکزی معاملے سمجھے جائیں۔
ان کو صوبائی سطح پر لانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وفاقی حکومت
کا مقصد فوت ہوجائے گا اور اس کی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔
ٹھیک اسی طرح کچھ امور ہیں صوبائی حکومت کی ذمہ داری
میں ہونے چاہئیں، مگر اس کے علاوہ امور کی ایک تیسری فہرست
بھی ہونی چاہیے، جن کے بارے میں صوبائی قانون ساز اسمبلیاں
طے کریں کہ وہ انہیں اپنے ماتحت رکھیں گی یا مرکز کو
سونپ دیں گی

جتنا میں نے اس پر غور کیا، اتنی ہی یہ بات میرے ذہن میں
صاف ہوتی گئی کہ ہندوستان کا مسئلہ اسی طریقے سے حل ہوسکتا
ہے اگر اس اصول کی بنیاد پر دستور بنایا گیا، تو اس کا یقین
ہوگا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں تین معاملوں کے سوا باقی
تمام امور کا انتظام خود صوبہ کرے گا اس سے مسلمانوں کا یہ
ذہنی خوف کہ وہ ہندؤں کے ماتحت ہوجائیں گے، دور ہوجائے گا۔
جب ایک مرتبہ یہ خوف دور ہوا، تو اس کا امکان ہوگا کہ صوبوں
کو کچھ اور اختیارات مرکز کو سونپنے میں اپنا فائدہ نظر آئے۔

میں اس مسئلے پر مسلسل غور کرتا رہا اور اس کی وجہ سے بہت فکر مند بھی تھا۔ تمام دنیا کا رجحان حکومت کے اختیار کی عدم مرکزیت کی طرف ہے ہندوستان جیسے بڑے ملک میں، جہاں آبادی کے اندر زبان، روایات اور جغرافیائی حالات کا اس قدر اختلاف ہے، وحدانی طرز کی حکومت یقینی طور پر ناموزوں ہوگی وفاقی حکومت، جس میں اختیارات بٹے ہوں، اقلیتوں کے اندیشوں کو دور کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہاں کا دستور وفاقی ہونا چاہیے۔ نیز اس کو اس طرح وضع کرنا چاہیے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ امور میں خود مختاری حاصل ہو۔ ہمیں صوبجاتی خود مختاری اور قومی وحدت میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنا تھا اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان، اختیارات اور منصوبوں کی تقسیم کا کوئی اطمینان بخش اصول دریافت کرلیا جائے کچھ اختیارات اور منصب بنیادی طور پر مرکز سے متعلق ہوں گے اور کچھ صوبوں کے پاس کچھ ایسے ہوں گے جو نہ مرکز سے متعلق ہوں گے نہ صوبوں سے، بلکہ ان کو باہمی رضامندی سے مرکز یا صوبے عمل میں لائیں گے۔ پہلا قدم یہ تھا کہ ایک ایسا فارمولا مرتب کیا جائے، جس کی رو سے یہ طے کردیا جائے کہ کم سے کم کتنے معاملات ہیں، جو لازمی طور پر مرکزی حکومت کے ذمے ہوں گے۔ یہ ضرور یونین گورنمنٹ کے تحت ہوں۔ اس کے علاوہ ایسے معاملات کی بھی ایک فہرست ہونا چاہیے،

سر اسٹیفرڈ کرپس نے خاص طور پر میری تجویز میں دلچسپی لی اور بڑی دیر تک مجھ سے جرح کرتے رہے۔ آخر میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے نقطۂ نظر سے مطمئن ہیں۔

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۱۲ اپریل کو منعقد ہوا، جس میں میں نے کیبنٹ مشن سے اپنی گفتگو کی رپورٹ پیش کی۔ میں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا جو حل پیش کیا تھا، اس کو میں نے کافی تفصیل سے بیان کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی جی اور دوسرے ساتھیوں کو میری اس اسکیم پر گفتگو کا موقع ملا۔ ورکنگ کمیٹی کو شروع میں اس حل کے بارے میں بہت سے شکوک تھے۔ چنانچہ ممبروں نے طرح طرح کی دقتیں اور شبہات بیان کئے۔ میں نے ان کے اعتراضات کے جواب دئے اور جو پہلو صاف نہیں تھے، ان کی وضاحت کی، بالآخر ورکنگ کمیٹی کو تجویز کے صحیح ہونے کا یقین ہوگیا اور گاندھی جی نے ظاہر کردیا کہ وہ اس حل سے پورے طور پر متفق ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہہ کر مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا، جس نے ہر ایک کو زچ کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میرا حل سب سے کٹر مسلم لیگیوں کے خوف کو بھی دور کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اس کی پشت پر فرقہ وارانہ رجحانات کے بجائے سچی قومیت کی روح ہے۔ گاندھی جی مصر تھے کہ ہندوستان جیسے ملک میں صرف وفاقی دستور ہی قابل عمل ہوسکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی انہوں نے میرے حل کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگرچہ اس میں

مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کے علاوہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے یہ بہترین سیاسی حل ہے۔ ہندوستان بہت وسیع ملک ہے، جس کی آبادی متعدد اکائیوں پر مشتمل ہے، جو اپنے اندر یکسانیت رکھتی ہیں اور مختلف صوبوں میں آباد ہیں قانونی مصلحت اور انتظامی سہولت کے لحاظ سے بھی صوبوں کو یقین دلانا ضروری تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہوگی۔

یہ نقشہ میرے ذہن میں بتدریج قائم ہوا تھا اور کیبنٹ مشن کے ہندوستان آنے تک بالکل صاف ہوگیا تھا، لیکن اب تک میں نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے اس پر گفتگو نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب اس کا مناسب موقع آئے گا، تو اپنے نقطۂ نظر کو صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دوں گا

میں کیبنٹ مشن کے ممبروں سے پہلی مرتبہ ٦ اپریل سنہ ١٩٤٦ء کو ملا مشن نے تبادلۂ خیال کے لئے پہلے سے کچھ سوالات تیار کرلئے تھے۔ پہلا سوال ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے سے متعلق تھا۔ جب مشن نے مجھ سے سوال کیا کہ میں فرقہ وارانہ گتھی" کو کس طرح سلجھا سکتا ہوں، تو میں نے وہی حل پیش کیا، جو میں نے پہلے سوچ لیا تھا۔ جونہی میں نے کہا کہ لازمی اختیارات کی فہرست جو کم سے کم ہوں گے، مرکز کے پاس ہوگی اور اس کے علاوہ اختیاری امور کی بھی فہرست ہوگی، تو لارڈ پیتھک لارنس نے کہا در اصل آپ فرقہ وارانہ مسئلہ کا ایک نیا حل پیش کررہے ہیں۔

مشن کے ممبروں سے گفتگو کر لی تھی، تو میں نے سوچا کہ اس کو ملک کے سامنے پیش کرنے کا وقت آگیا ہے. چنانچہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کو میں نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبے کے بارے میں ایک بیان جاری کیا. ہندوستان کی تقسیم ایک حقیقت ہے اور اس کو دس سال ہو چکے ہیں. اب جو میں اپنے بیان پر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہوں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں نے جو کچھ کہا تھا. وہی ہوا چونکہ اس بیان میں ہندوستانی مسئلے کے حل کے متعلق میری قطعی رائے ظاہر کی گئی ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر مجھے اس بیان کو درج کر دینا چاہئے یہ سب میں نے اس وقت کہا تھا اور اب بھی کہوں گا

«مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے، اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے. ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں نے سوچا ہے کہ پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس کا کیا اثر ہوگا، ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑسکتا ہے.

«اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان کے لئے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہوگی، اور در اصل جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے، ان سے زیادہ نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے.

«مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میری حلق سے

کوئی انوکھا اصول پیش نہیں کیا گیا ہے، مگر اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ماحول میں وفاقیت کے اصول کے معنی کیا ہیں.

سردار پٹیل نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا مرکزی حکومت کا دائرہ عمل صرف تین معاملوں تک محدود رہے گا؟ انہوں نے کہا کہ کچھ ایسے امور ہیں، جیسے کہ سکہ اور مالیات، جن کا اپنی نوعیت کے لحاظ سے مرکز میں ہونا ضروری ہے انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تجارت اور صنعت کو صرف کل ہند بنیاد پر ترقی دی جاسکے گی اور یہی صورت تجارتی پالیسی کی بھی ہے

مجھے ان اعتراضات کے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی گاندھی جی نے خود ہی میرے نقطۂ نظر کو اپنا لیا اور سردار کو جواب دینے لگے. انہوں نے کہا کہ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صوبجاتی حکومتیں کرنسی اور محصول جیسے مسائل پر مرکز سے اختلاف کریں گی اس میں ان کا اپنا فائدہ ہوگا کہ ان معاملات میں کوئی متفقہ پالیسی اختیار کی جائے. اس لئے اس پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کرنسی یا مالیات کو مرکزی امور کی لازمی فہرست میں شامل کیا جائے.

مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے لاہور کے رزولیوشن میں، جو بعد میں پاکستان رزولیوشن کے نام سے مشہور ہوگیا، ہندوستان کی تقسیم کا ذکر کیا تھا میں نے جو حل پیش کیا تھا، اس میں مسلم لیگ کے اندیشہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی. اب جب کہ میں نے اپنی اسکیم پر اپنے ساتھیوں اور کیبنٹ

کم از کم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لئے
بھی اپنے اس حق کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندوستان کو
میدان عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور معاشی زندگی کی تشکیل
میں شرکت کروں۔ میرے نزدیک بزدلی کی بات ہے کہ میں اپنی
آبائی جائداد سے دست بردار ہو جاؤں اور اس کے ایک ٹکڑے
پر قناعت کروں۔

«جب کہ سب کو معلوم ہے کہ مسٹر جناح کی پاکستان کی اسکیم
دو قومی نظریہ پر مبنی ہے ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان میں
بہت سی قومیں آباد ہیں، جن کے درمیان مذہب نمائے امتیاز ہے۔
ان میں جو دو بڑی قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان ان کی اس
اعتبار سے کہ وہ دو الگ قومیں ہیں، دو الگ ریاستیں ہونی چاہئیں،
ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامس نے ایک مرتبہ مسٹر جناح سے کہا کہ ہندو اور
مسلمان ہندوستان کے ہزاروں شہروں، قصبوں اور گاؤں میں مل جل
کر رہتے ہیں۔ تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا ان کی جداگانہ
قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مسٹر جناح کے نظریے کے مطابق
چونکہ یہ دونوں قومیں ہر بستی، ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایک
دوسرے سے دو چار ہوتی رہتی ہیں، اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں
کہ ان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

«میں اس کے لئے تیار ہوں کہ اس مسئلے کے باقی تمام
پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس پر صرف مسلمانوں کے
مفاد کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ میں اس سے بھی آگے
جانے اور یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر یہ ثابت کردیا جائے

نہیں اترتا، اس سے یہ خیال پیدا کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے، بلکہ اسلام سے انحراف ہے اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا آنحضرت صلعم فرماتے ہیں۔
' خدا نے پوری دنیا کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔'

«اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم شکست کی علامت ہے اور اس کا خیال اسی طرح پیدا ہوا ہے، جیسے یہودیوں میں قومی وطن کا خیال۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان، ہندوستان میں اپنی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی ہیں کہ ایک کونے میں، جو ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو، سمٹ کر بیٹھ جائیں۔

«یہودیوں کی اس آرزو سے ہمدردی کی جا سکتی ہے کہ ان کا ایک قومی وطن ہو، کیونکہ وہ پوری دنیا میں منتشر ہیں اور کسی ایک علاقے میں بھی وہ حکومت کے انتظامات پر اثر نہیں ڈال سکتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نو کروڑ سے اوپر ہے اور کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندوستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں۔ کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن حد تک اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت نے ان کو چند مخصوص علاقوں میں بڑی تعداد میں یکجا بھی کر دیا ہے اور اس طرح انہیں تقویت پہنچائی ہے۔

«ان حالات میں پاکستان کے مطالبے میں کوئی جان نہیں رہتی،

خالص ہندو راج بن گئی ہوگی۔

"دوسری طرف خود ریاست پاکستان میں وہ غیر محفوظ اور کمزور ہوں گے۔ پاکستان کے اندر کہیں بھی ان کی اتنی بڑی اکثریت نہیں ہوگی، جتنی ہندوستان کی ریاست میں ہندوؤں کی۔

"دراصل مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہوگی کہ ان علاقوں کے غیر مسلموں نے جو تعلیمی اور سیاسی سبقت حاصل کر لی ہے، وہ اس کو بے اثر کر دے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، تب بھی اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل نہ ہوتا۔

"اس بات سے کہ دو ملک ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں، ان دونوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اس سے صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اقلیتوں کو یرغمال سمجھنے کا طریقہ جاری ہو جائے اور سزا دینے اور بدلہ لینے کی کارروائیاں ہونے لگیں۔ اس وجہ سے پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کی کسی دشواری کا علاج نہیں ہے۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں، وہاں وہ ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی اور پاکستان کے شہری ہوتے ہوئے انہیں ہندوستانی یا، بین‌الاقوامی امور میں وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی جو کہ انڈین یونین جیسی کسی بڑی ریاست کے شہری بن کر وہ کر سکتے ہیں۔

بحث کی خاطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے لئے اس قدر مضر ہے۔ تو مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اس کے فریب حسن میں کیونکر مبتلا ہو گئی؟ اس کا جواب

کہ پاکستان کی اسکیم سے مسلمانوں کو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں خود اس کو منظور کرلوں گا اور دوسروں کو اسے منظور کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کوشش کروں گا مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا خود مسلمانوں کے جماعتی مفاد کے نقطۂ نظر سے جائزہ لوں، تو مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اس سے ان کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہو سکتا، اور ان کے جائز اندیشے دور نہیں ہو سکتے.

«آئیے ذرا ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کریں، جو پاکستان بن جانے سے بر آمد ہوں گے ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہوجائیگا، جن میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی، اور دوسری میں ہندؤں کی ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان باقی رہ جائیں گے، جو پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں گے وہ یوپی میں ۱۷ فیصدی، بہار میں ۱۲ فیصدی اور مدراس میں ۹ فیصدی ہوں گے، یعنی آج کل کے مقابلے میں وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اور زیادہ کمزور ہوں گے. انہوں نے تقریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں کو اپنا وطن سمجھا ہے اور ان میں اسلامی تہذیب اور تمدن کے مشہور مرکز تعمیر کئے ہیں.

«ان لوگوں کی ایک روز صبح کو آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھیں گے کہ راتوں رات اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں. وہ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہوں گے اور ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے جو

کی اکثریت ہوگی. کانگریس اس خوف کو اس طرح دور کرتی ہے کہ صوبوں کو پوری خود مختاری دی جائے گی اور جو اختیارات مرکز کو نہ دئے جائیں گے، وہ بھی صوبوں کو حاصل ہوں گے. اس نے مرکزی معاملات کی دو فہرستیں رکھی ہیں، ایک لازمی اور دوسری اختیاری. اس طرح اگر کوئی صوبہ چاہے تو سوائے ان اختیارات کے جو مرکز کے سپرد کئے جائیںگے اور کم سے کم ہوں گے، وہ باقی تمام معاملات اپنے انتظام میں رکھ سکتا ہے. اس بنا پر کانگریس کی اسکیم کے ذریعے اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو اندرونی معاملات میں آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہیں اپنی ترقی کی تدبیریں کریں اور اسی کے ساتھ ان معاملوں میں جن کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے، وہ مرکز پر اپنا اثر ڈال سکیں،

«ہندوستان کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ مرکزیت پر پر مبنی وحدانی حکومت قائم کرنے کی ہر کوشش لازمی طور پر ناکام ہوگی، اسی طرح ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی کوشش بھی ناکام ہوکر رہے گی، اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بالآخر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسائل کا حل صرف اس طریقے پر ممکن ہے، جو کانگریس کے فارمولا میں مضمر ہے، اور جس میں صوبوں اور پورے ہندوستان کے لئے ترقی کی گنجائش ہے. کانگریس کا فارمولا، مسلم اکثریت کے علاقوں کے اس خوف کو دور کرنے کے لئے بالکل کافی اور مناسب ہے، جس کی وجہ سے پاکستان کی اسکیم بنائی گئی

ہمیں انتہا پسند فرقہ پرست ہندوؤں کے رویہ میں ملتا ہے۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کی گفتگو چھیڑی تو انہیں اس میں اتحاد اسلامی کی ایک ناپاک سازش نظر آنے لگی اور انہوں نے اس خوف میں اس کی مخالفت شروع کی کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں اور مسلمانوں کی ریاستوں کے درمیان جتھا بندی کا پیش خیمہ ہے۔

"اس مخالفت نے لیگ کے حامیوں کو اور اُکسایا انہوں نے ایک سیدھے سادے مگر نامعقول منطقی استدلال سے کام لے کر کہا کہ چونکہ ہندو اتنی شدت سے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے یقیناً اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔ اس طرح جذباتی ہیجان کی ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں سوچ سمجھ کر اچھے برے کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہو گیا اور خاص طور پر مسلمانوں کا نوجوان اور اثر پذیر طبقہ جذبات کی رو میں بہ گیا۔ مگر مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جب موجودہ جوشی کیفیت دور ہو جائے گی اور اصل مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے گا، تو جو لوگ اس وقت پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں، وہ خود ہی اس کو مسلم مفاد کے لئے مضر ٹھرا کر اس سے منھ پھیر لیں گے

"میں نے کانگریس کو جو فارمولا قبول کرنے پر راضی کرلیا ہے، اس میں وہ تمام خوبیاں جو پاکستان کی اسکیم میں ہیں، حاصل ہوجائیں گی اور اس میں جو خامیاں اور خرابیاں ہیں، ان سے بچا جاسکے گا۔ پاکستان کی بنیاد مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں مرکز کی مداخلت کا خوف ہے، کیونکہ مرکز میں ہندوؤں

ثابت نہ ہو، تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ بہرحال ۹ کروڑ مسلمان ایک عنصر ہیں، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور حالات چاہے جیسے بھی ہوں، ان میں اتنی طاقت ہے کہ اپنے مستقبل کو خطرات سے محفوظ رکھ سکیں»

لاہور رزولیوشن کے بعد، لیگ تقسیم پسندی کی راہ پر کچھ قدم اور آگے بڑھا چکی تھی، مگر اس نے یہ بات پوری طرح واضح نہیں کی تھی کہ در اصل اس کا مطالبہ کیا ہے۔ رزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس کی کئی تاویلیں کی جاسکتی تھیں، مگر اس کا منشا صاف تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جائے۔ سکندر حیات خاں نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے اس کی یہی تاویل کی تھی، مگر اب لیگ کے لیڈروں نے اپنے مطالبے کے معنی میں بہت زیادہ وسعت پیدا کردی تھی وہ ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک آزاد ریاست کے قیام کی مبہم باتیں کرنے لگے تھے۔ کیبنٹ مشن اس مطالبہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا اس کے برعکس مشن ایک ایسے حل کے حق میں تھا، جو کم و بیش میری تجویز کے مطابق تھا۔

گفتگو کا سلسلہ تقریباً آخر اپریل تک جاری رہا۔ مشن کے ساتھ ہماری ملاقاتیں ہوئیں اور مشن کے ارکان آپس میں بھی گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں مشن نے کام میں وقفہ کیا اور کشمیر چلا گیا۔ اب گرمی شروع ہوگئی تھی اور دہلی کی گرمی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا آرام

ہے۔ دوسری طرف اس میں پاکستان کی اسکیم کی خرابیاں نہیں ہیں اور اس کی بدولت وہ مسلمان جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں، خالص ہندو حکومت کے ماتحت نہ ہوجائیں گے۔

«میں ان لوگوں میں سے ہوں، جو فرقہ وارانہ تلخی اور اختلافات کی موجودہ کیفیت کو ہندوستانی زندگی کا ایک عارضی دور سمجھتے ہیں مجھے پورا یقین ہے کہ یہ اختلافات اس وقت دور ہوجائیں گے، جب ہندوستان پر اپنے مستقبل کی تعمیر کی ذمہ داری آجائے گی۔ مجھے اس وقت گلیڈ سٹون کا ایک قول یاد آرہا ہے کہ جو شخص پانی سے ڈرتا ہو اس کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ اسے پانی میں ڈال دیا جائے ٹھیک اسی طرح خدشوں اور شبہوں کو رفع کرنے کے لئے ہندوستان کو اپنے معاملات کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔

«جب ہندوستان اپنی قسمت کا مالک ہوجائے گا، تو وہ فرقہ وارانہ بدگمانی اور کشمکش کی موجودہ کیفیت کو بالکل بھول جائے گا اور دور جدید کی زندگی کے مسائل کو جدید نقطۂ نظر سے حل کرے گا، بلا شبہ اختلافات باقی رہیں گے، مگر وہ معاشی ہوں گے، فرقہ وارانہ نہ ہوں گے۔ سیاسی پارٹیوں کی باہمی مخالفتیں جاری رہیں گی مگر ان کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ معاشی اور سیاسی مسائل پر ہوگی، مستقبل کی جماعت بندی کی بنیاد طبقہ واری ہوگی، فرقہ واری نہ ہوگی اور اسی لحاظ سے پالیسی کی تشکیل بھی ہوگی، اگر یہ کہا جائے کہ یہ محض ایک عقیدہ ہے، جو ممکن ہے بعد کے واقعات سے برحق

قطعی سمجھا اور آگئے۔ گاندھی جی کو ان کا آنا کچھ ناگوار ہوا، مگر میں نے ان سے کہا کہ راجا جی میرے خط لکھنے پر آئے ہیں۔ میں نے گاندھی جی کو یہ بھی سمجھایا کہ راجا جی کو دہلی آنے سے اس طرح روکنا مناسب نہیں تھا۔

مشن ۲۴ اپریل کو دہلی واپس آیا اور وائسرائے کے ساتھ مل کر دستور کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی اس پر نظر ثانی کی۔ کئی مرتبہ بحثیں کرنے کے بعد، سر اسٹیفرڈ کرپس مجھ سے ان مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے آئے، جو اس دوران میں پیدا ہوئے تھے ۲۷ اپریل کو مشن نے ایک بیان جاری کیا کہ بڑی پارٹیوں کے درمیان باہمی رضامندی سے معاہدہ کرنے کے لئے گفتگو کرنا مناسب ہوگا، اس لئے مشن نے کانگریس اور لیگ کے صدر کو دعوت دی کہ وہ اپنی اپنی پارٹیوں کی ورکنگ کمیٹی کے نمایندے شملہ میں مشن سے مل کر گفتگو کرنے کے لئے نامزد کردیں۔ ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن سے گفتگو کرنے کے لئے نمایندوں کو مقرر کرنے کا اختیار مجھے دے دیا۔ چنانچہ میں نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو اپنے رفیق کار کی حیثیت سے کانگریس کی نمایندگی کے لئے نامزد کیا حکومت نے شملہ میں ہمارے قیام کا انتظام کردیا۔ گاندھی جی باضابطہ طور پر گفتگو کرنے والوں میں شامل نہیں تھے، مگر مشن نے ان کو شملہ آنے کی دعوت دی، تاکہ ضرورت کے وقت ان سے مشورہ کیا جاسکے۔ انہوں نے مشن کی دعوت قبول کرلی اور آ کر «مینور ولا» میں ٹھہر گئے۔ ہم وہاں ورکنگ کمیٹی کے غیر رسمی جلسے کرتے

کرلوں اور اس خیال سے کہ کشمیر جاؤں گا، وہاں کچھ احباب کو لکھ بھی دیا تھا. جب مجھے معلوم ہوا کہ مشن کشمیر جارہا ہے، تو میں نے اپنا پروگرام بدل دیا. میں نے سوچا کہ کشمیر جانے کا مطلب یہ نکالا جاسکتا ہے کہ میں مشن سے رابطہ رکھنا اور اس کی رائے پر اثر ڈالنا چاہتا ہوں، اس لئے میں مسوری چلا گیا.

میں بیان کرچکا ہوں کہ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد شری راج گوپال اچاری نے یہ تحریک شروع کی تھی کہ کانگریس کو مسلم لیگ کے مطالبے منظور کرلینا چاہیئے. وہ یہاں تک کہتے تھے کہ ملک کی تقسیم کو اصولی طور پر مان لینا چاہیئے. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ورکنگ کمیٹی سے علیحدہ ہوگئے اور عام کانگریسی ان سے خفا ہوگئے. گاندھی جی نے بھی راجاجی کی کوششوں کو پسند نہیں کیا تھا. اس لئے وہ چاہتے تھے کہ راجاجی ہماری گفتگو کے دوران میں کیبنٹ مشن سے نہ ملیں. انہوں نے راجاجی سے کہہ دیا کہ وہ مدراس ہی میں رہیں. راجاجی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی. مگر کچھ عرصے تک وہ خاموش رہے. وقفہ کے زمانے میں جب میں مسوری گیا تو میرے پاس ان کا خط آیا. اس وقت مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے ان کو دہلی آنے سے روک دیا تھا. میں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی اب بھی نہیں چاہتے ہیں کہ راجاجی دہلی آئیں، اس لئے ان سے مشورہ کئے بغیر میں نے اپنی ذمہ داری پر راجاجی کو لکھا کہ اگر وہ چاہتے ہوں تو آجائیں. راجاجی نے میری بات کو

فکر و احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے.
لارڈ ویول نے کہا کہ حکومت کا مرکز دہلی میں ہے اور اگر وہ
زیادہ عرصے تک باہر رہے تو کام میں ہرج ہوسکتا ہے، اس
پر میں نے یہ کہا کہ دہلی میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی، اس لئے
کہ وائسرائیگل لاج ایرکنڈیشنڈ ہے اور انہیں اس کے باہر نکلنے
کی ضرورت پیش نہیں آتی، مگر کیبنٹ مشن کے ممبروں اور ہمارے
لئے صورت کچھ اور ہے. دہلی کی کیفیت ایک بھٹی کی سی ہوگئی
ہے اور ہمارے لئے اس میں کام جاری رکھنا بہت دشوار ہوگا.
لارڈ ویول نے جواب دیا کہ یہ صرف چند دنوں کی بات ہے.

آخر میں ہوا یہ کہ ہم نے مئی کے باقی دن اور پورا جون
دہلی میں گذارا. اس سال گرمی غیر معمولی تھی، کیبنٹ مشن کے
ممبروں پر اس کا اثر ہوا اور سب سے زیادہ لارڈ پیتھک لارنس
پر، جو ایک روز گرمی کی شدت سے بے ہوش ہوگئے وائسرائے
نے میرے لئے ایک ایرکنڈیشنڈ کمرے کا انتظام کردیا تھا، جس
سے مدد ضرور ملی، مگر موسم ایسا صبر آزما تھا کہ ہر شخص
چاہتا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ جلد سے جلد تکمیل کو پہنچ جائے،
بد قسمتی سے کانگریس اور لیگ کے اختلافات آسانی سے طے
ہونے والے نہیں تھے اور ہماری گفتگو سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ
ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے

کیبنٹ مشن اور اس کے پلان کی درد سری کچھ کم نہ تھی،
کشمیر کے واقعات نے ایک اور درد سر کا اضافہ کردیا. نیشنل
کانفرنس شیخ عبداللہ کی قیادت میں، کشمیر کے عوام کے سیاسی

رہے۔ تاکہ گاندھی جی بھی ان میں شریک ہوسکیں۔

۲ مئی کو شملہ میں گفتگو شروع ہوئی اور ۱۲ مئی تک جاری رہی۔ باضابطہ کانفرنس کے علاوہ ہم نے بہت سی بے ضابطہ طور پر بحثیں بھی کیں میرا قیام « ریٹریٹ » (Retreat) میں تھا اور مشن کے ممبر کئی موقعوں پر مجھ سے ملنے وہاں آئے۔ میں بھی ان سے ملنے کے لئے گیا۔ کبھی انفرادی طور پر کبھی اجتماعی طور پر، جیسا بھی مناسب معلوم ہوا ان ملاقاتوں میں آصف علی یا ہمایوں کبیر کبھی کبھی میرے ساتھ گئے۔

کوئی دو ہفتے کے بعد ہم دہلی واپس آئے، مشن کے ممبروں نے آپس میں مزید گفتگو کرنے کے بعد اپنی تجاویز مرتب کیں ان کا ۱۶ مئی کو مسٹر اٹلی نے دار العوام میں اعلان کیا۔ پارلیمنٹ میں عام اطلاع کے لئے ایک تحریر بھی شائع کی گئی، جس میں یہ پلان درج تھا اور یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کا ایک نیا دستور جلد سے جلد تیار کرنے کے لئے برطانوی کیبنٹ اس انتظام کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ میں نے کیبنٹ مشن پلان کو ضمیمہ میں درج کردیا ہے اور اگر کوئی شخص چاہے تو اس کا میری اسکیم سے مقابلہ کرسکتا ہے، جسے میں نے اپنے ۱۵ اپریل کے بیان میں پیش کیا تھا

میں چاہتا تھا کہ ہم کیبنٹ مشن پلان پر گفتگو کا سلسلہ شملہ میں جاری رکھیں۔ میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ ہمارا شملہ میں اپنی گفتگو کو مکمل کرلینا بہتر ہوگا، اس لئے کہ دہلی کا موسم ان اہم مسائل پر جو زیر بحث تھے ٹھنڈے دل سے اور

اور کشمیر کی حکومت نے ان کو گرفتار کرلیا۔ ظاہر ہے اس نے ملک میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا۔

یہ حالات میرے لئے کچھ خوشی کا باعث نہ تھے۔ جہاں مجھے ایک طرف کشمیر کی حکومت کی اس کارروائی پر غصہ آرہا تھا وہاں دوسری طرف میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ کشمیر کے متعلق ایک نیا جھگڑا کھڑا کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے وائسرائے سے اس بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ حکومت ہند کو اس کا انتظام کر دینا چاہئے کہ میں ٹیلیفون پر جواہر لال سے بات کر سکوں جواہر لال ایک ڈاک بنگلہ میں نظر بند تھے اور مجھے ان سے فون پر گفتگو کرنے میں کچھ دیر لگی۔ میں نے جواہر لال سے کہا کہ میری رائے ہے کہ ان کو جس قدر جلد ممکن ہو، دہلی واپس آجانا چاہئے۔ موجودہ حالات میں ان کا کشمیر میں داخل ہونے پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک کشمیر کے سوال کا تعلق ہے، میں نے بحیثیت صدر کانگریس کے، ان کو یقین دلایا کہ میں اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لوں گا۔ میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا کرنے کے لئے بھی کارروائی شروع کر دونگا، مگر جواہر لال کو فوراً واپس آنا چاہئے۔

پہلے جواہر لال نے عذر کیا، مگر کچھ بحث کے بعد اور میرے یقین دلانے پر کہ میں کشمیر کے معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لوں گا، وہ واپس آنے پر راضی ہو گئے۔ پھر میں نے لارڈ ویول سے درخواست کی کہ جواہر لال اور آصف علی کو واپس

حقوق کی لڑائی لڑ رہی تھی. جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا، تو انھوں نے سوچا کہ اپنے مطالبوں کو منوانے کے لئے اس موقع سے فائدہ اٹھائیں. انھوں نے «کشمیر چھوڑ دو» کا نعرہ بلند کیا اور اپنے معاملے کو کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کیا. ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کشمیر کا مہاراجہ، شخصی حکومت کو ختم کرکے عوام کی خود مختاری حکومت قائم کرے. مہاراجا کی حکومت نے اس کے جواب میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا. اس سے کچھ عرصہ پہلے نیشنل کانفرس کا ایک نمایندہ حکومت میں شامل کر لیا گیا تھا اور سمجھوتا ہو جانے کا امکان نظر آرہا تھا شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری سے اس امید پر پانی پھر گیا.

جواہرلال نے کشمیر میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی جد وجہد میں ہمیشہ دلچسپی لی تھی. جب یہ واقعات رونما ہوئے، تو انھوں نے سوچا کہ ان کو کشمیر جانا چاہئے. یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ نیشنل کانفرس کے لیڈروں کی طرف سے مقدمے کی پیروی کا کوئی انتظام ہو. میں نے آصف علی سے کہا کہ وہ اس کام کو سنبھال لیں. جواہرلال نے کہا کے وہ بھی آصف علی کے ساتھ جائیں گے اور اس طرح دونوں روانہ ہوگئے. مہاراجا کی حکومت اس فیصلے پر برہم ہوئی اور کشمیر میں ان لوگوں کے داخلے کی ممانعت کردی. جب یہ لوگ راولپنڈی سے چل کر کشمیر کی سرحد کے قریب پہنچے تو اوری میں ان کو روک دیا گیا. انھوں نے امتناعی حکم کو ماننے سے انکار کر دیا

مشن نے میرے اس خیال کو بھی تسلیم کر لیا تھا کہ بیشتر امور صوبوں کے اختیار میں ہوں گے۔ اس طرح مسلمانوں کو مسلم اکثریت کے صوبوں میں تقریباً پوری خود مختاری حاصل ہوتی، محض چند امور، بہ شرط اتفاق علاقائی نظام کے ماتحت رکھے جاتے۔ اس لحاظ سے بھی سکشن بی اور سی میں مسلمانوں کی اکثریت یقینی تھی اور انہیں اس کا موقع تھا کہ اپنی تمام جائز توقعات کو پورا کریں۔ جہاں تک مرکز کا سوال تھا، اس کے ماتحت صرف تین امور تھے، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے صوبوں کے انتظام میں نہیں دئے جا سکتے تھے۔ چونکہ کیبنٹ مشن پلان کی روح وہی تھی، جو میری اسکیم کی اور صرف تین حصوں یا سکشنوں کے قیام کا اضافہ کیا گیا تھا، اس لئے میری رائے تھی کہ ہمیں اس اسکیم کو منظور کر لینا چاہئے۔

پہلے پہل مسٹر جناح اسکیم کے بالکل خلاف تھے مسلم لیگ ایک الگ اور آزاد ریاست کے مطالبے میں اس قدر شدت دکھا چکی تھی کہ اب اس کے لئے کم پر راضی ہونا مشکل تھا مشن نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ ملک کی تقسیم اور آزاد ریاست کے قیام کی کسی حالت میں بھی سفارش نہیں کرسکتا۔ لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس نے بار بار کہا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پاکستان جیسی ریاست، جو مسلم لیگ کے مد نظر ہے کیسے زندہ رہ سکتی ہے اور پائدار ہوسکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مسئلے کو حل کرنے کا واحد طریقہ میرا فارمولا ہے، جس کے مطابق صوبوں کو

لانے کے لئے ہوائی جہاز کا انتظام کردیں۔ جب میں نے یہ درخواست کی اس وقت شام کے سات بج گئے تھے، مگر انہوں نے اسی رات کو ایک ہوائی جہاز بھیج دیا، جو سری نگر تقریباً دس بجے پہنچ گیا اور جواہرلال اور آصف علی کو لیکر دو بجے رات کو واپس آگیا اس پورے معاملے میں لارڈ ویول کا طرز عمل انتہائی دوستانہ تھا اور مجھے بہت پسند آیا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ کیبنٹ مشن نے ۱۶ مئی کو اپنی اسکیم شائع کی۔ بنیادی طور پر یہ وہی تھی، جس کا خاکہ میرے ۱۵ اپریل کے بیان میں تھا کیبنٹ مشن پلان کے مطابق صرف تین محکمے لازمی طور پر مرکزی حکومت کے ماتحت رکھے گئے تھے۔ یہ تھے دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل، جنہیں میں نے اپنی اسکیم میں تجویز کیا تھا مگر مشن نے اپنے پلان میں ایک نئی تجویز کا اضافہ کر دیا تھا اس نے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا اے، بی اور سی۔ اس لئے کہ مشن کے ممبروں کا خیال تھا کہ اس سے اقلیتوں کے دلوں میں زیادہ اطمینان اور اعتماد پیدا ہوگا۔ حصہ «بی» پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان پر مشتمل تھا۔ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ «حصہ سی» جس میں بنگال اور آسام شامل تھے، ایسا حصہ تھا، جس میں مسلمانوں کی دوسروں کے مقابلے میں تھوڑی اکثریت تھی۔ کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ یہ انتظام مسلم اقلیت کو مکمل طور پر مطمئن کر دیگا اور لیگ کے تمام جائز خدشوں کو دور کر دے گا۔

کی تھی. انھوں نے صاف صاف کہا کہ اگر مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن پلان ہی منظور کرنا تھا، تو آخر اس نے ایک آزاد ریاست کا نعرہ بلند کرکے مسلمانوں کو گمراہ کیوں کیا؟ میں نے ان سے اس مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کی. آخر میں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلم لیگ کا نقطۂ نظر جو بھی رہا ہو، ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے بہتر شرائط کی توقع نہیں ہونی چاہیے تھی، جو کیبنٹ مشن میں پیش کی گئی ہیں.

ورکنگ کمیٹی میں جو بحثیں ہوئیں ان میں، میں نے سمجھایا، کہ کیبنٹ مشن پلان بنیادی طور پر وہی اسکیم ہے جو کہ کانگریس منظور کرچکی ہے. اس طرح کانگریس کو پلان کے بنیادی سیاسی فیصلہ کو منظور کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی. البتہ کامن ویلتھ کے ساتھ ہندوستان کے تعلق کا سوال ابھی باقی تھا. میں نے مشن سے کہا کہ اس کا فیصلہ وہ ہندوستان پر چھوڑ دیں. مجھے یقین تھا کہ ہم صرف اسی طریقے سے صحیح فیصلہ کرسکیں گے. میں نے یہ بھی کہا کہ میرا خیال ہے کہ اگر یہ سوال ہندوستان پر چھوڑ دیا گیا، تو یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ کامن ویلتھ میں بدستور شامل رہنے کا فیصلہ کرے گا. سر اسٹیفرڈ کرپس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہی کیا جائے گا. چنانچہ کیبنٹ مشن پلان میں یہ معاملہ آزاد ہندوستان کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا تھا. اس وجہ سے بھی ہمیں کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے میں آسانی ہوگئی. سمجھوتے کی طویل گفتگوؤں کے بعد ورکنگ کمیٹی نے اپنے ۲۶ جون کے رزولیوشن میں کیبنٹ

زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہوگی اور مرکزی حکومت کے لئے صرف تین امور مخصوص ہوں گے۔ لارڈ پیتھک لارنس نے ایک مرتبہ نہیں، کئی بار کہا کہ اس فارمولا کو منظور کرلینے کے معنی یہ ہوں گے کہ شروع میں مسلم اکثریت کے صوبے صرف تین امور مرکزی حکومت کے حوالے کریں گے اور اس طرح اپنی مکمل خود مختاری کا یقین کرلیں گے۔ دوسری طرف ہندو اکثریت کے صوبے خود سے مرکزی حکومت کو کئی اور معاملے منتقل کرنے پر راضی ہوجائیں گے کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ سچے وفاق میں شریک ہونے والے ارکان کو طے کرنے کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کتنے اور کس نوعیت کے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کریں گے۔

مسلم لیگ کونسل تین روز تک اجلاس کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرپائی۔ آخری دن مسٹر جناح کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اقلیتوں کے مسئلہ کا جو حل کیبنٹ مشن پلان میں پیش کیا گیا ہے، اس سے زیادہ منصفانہ کوئی اور فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ بہر حال وہ اس سے بہتر شرطیں نہیں منوا سکتے۔ انہوں نے کونسل سے کہا کہ کیبنٹ مشن نے جو اسکیم پیش کی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ہے جسے وہ حاصل کرسکے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ اسکیم کو منظور کرلے اور کونسل نے بالاتفاق اس کے حق میں رائے دی۔

میں مسوری ہی میں تھا، جب مسلم لیگ کے کچھ ممبر مجھ سے ملے تھے اور اپنی حیرانی اور تعجب کی کیفیت مجھ سے بیان

احساس تھا اور تمام لوگ آزادی کے مطالبے میں متحد ہو گئے تھے ہم خوشیاں منا رہے تھے، مگر اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ ہماری شادمانی قبل از وقت ہے اور تقدیر مایوسی کا کڑوا گھونٹ پلانے والی ہے

پلان کو مستقل کے لئے منظور کرلیا، البتہ وہ اِنٹرم حکومت کی تجویز کو منظور نہ کرسکی۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر کیبنٹ مشن نے جس خوبی کے ساتھ سمجھوتے کی گفتگو کی، اس پر بھی اسے خراج تحسین ادا کروں۔ سر اسٹیفرڈ کرپس میرے پرانے دوست ہیں اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرچکا ہوں۔ لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر الکزینڈر سے اس سے پہلے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر ان دونوں کے بارے میں بھی میں نے بہت اچھی رائے قائم کی۔ لارڈ پیتھک لارنس نے جس ہمدردی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا اس سے میں خاص طور پر متاثر ہوا وہ تھے تو بوڑھے، مگر ان میں نوجوانوں کی زندہ دلی تھی، ان کا نمایاں خلوص، ہندوستان سے ان کی گہری محبت اور ہماری دشواریوں کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت، ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے ہم ان کی ہر رائے کی طرف بہت توجہ کرتے تھے مسٹر الکزینڈر بولتے کم تھے، مگر جب کبھی وہ کوئی رائے دیتے تو اس میں ان کی قابلیت اور سیاسی بصیرت نمایاں ہوتی۔

کانگریس اور مسلم لیگ کا کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنا، ہندوستانی آزادی کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ہندوستانی آزادی کا پیچیدہ معاملہ گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے طے پایا، نہ کہ تشدد اور جنگ کے ذریعے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات قطعی طور پر ماضی کی داستان بن گئی ہیں۔ سارے ملک میں شادمانی کا

اور شملہ کانفرس کے موقع پر، سیاسی مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں پہلی مرتبہ مجھے کامیابی حاصل ہوئی تھی، اگرچہ فرقہ وارانہ اختلاف کی وجہ سے بالآخر گفتگو ناکام رہی تھی. کانگریس کے اندر عام خیال یہ تھا کہ چونکہ اب تک ہر گفتگو میری رہنمائی میں اور میری ذمہ داری پر ہوئی تھی، اس لئے اب تکمیل اور تعمیل کا کام بھی میرے ہی سپرد ہونا چاہئے. بنگال، بمبئی، مدراس بہار اور یوپی کے کانگریسی حلقوں میں کھلم کھلا یہ رائے ظاہر کی جاری تھی کہ کیبنٹ مشن پلان کی تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری مجھ پر ہونی چاہئے

میں نے محسوس کیا کہ کانگریس ہائی کمانڈ کے خواص میں اس مسئلے پر اختلاف رائے ہے سردار پٹیل اور ان کے احباب کی خواہش ہے کہ انہیں کانگریس کا صدر منتخب کیا جائے. یہ میرے لئے بہت ہی نازک معاملہ ہو گیا. پہلے پہل میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ چونکہ میں سنہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک سات سال صدر رہ چکا ہوں، اس لئے مجھے ریٹائر ہو جانا چاہئے. اس بنا پر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا نام تجویز کرنے کی اجازت نہیں دوں گا.

دوسری بات یہ طے کرنا تھی کہ میرا جانشین کون ہو. مجھے اس کی فکر تھی کہ میرے بعد جو صدر ہو، وہ میرے نقطۂ نظر سے متفق ہو اور ایسی پالیسی پر عمل کرے، جسے میں نے اختیار کیا تھا اس کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلیلوں کو جانچنے

تقسیم ہند کا پیش خیمہ

اب خیال ہورہا تھا کہ سیاسی مسائل حل ہو گئے ہیں. مگر اس وقت مجھے ایک نئے معاملہ کی طرف توجہ کرنی پڑی. میں سنہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کا صدر منتخب ہوا تھا کانگریس. کے دستور کے مطابق میری مدت کار صرف ایک سال کی تھی معمولی حالات میں سنہ ۱۹۴۰ء میں نئے صدر کا انتخاب ہونا چاہئیے تھا، مگر اسی اثنا میں جنگ چھڑ گئی اور اس کے بعد انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوگئی. ہمارے معمول کے کام بند ہو گئے. ہم لوگ سنہ ۱۹۴۰ء اور پھر سنہ ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لئے گئے. کانگریس بھی غیر قانونی جماعت قرار دیدی گئی، اس لئے میرے جانشین کے انتخاب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور میں اس پورے عرصہ میں صدر رہا.

اب حالات غیر معمولی نہیں رہے تھے، اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ کانگریس کا نیا انتخاب کیا جائے اور دوسرا صدر چنا جائے جونہی اخبارات میں یہ سوال اٹھایا گیا، لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مجھے مزید ایک سال کے لئے صدر منتخب کر لیا جائے. اس کے لئے خاص دلیل یہ تھی کہ کرپس، لارڈ ویول اور اس وقت کیبنٹ مشن سے میں نے ہی گفتگو کی تھی

کارروائی ہوگی، کیونکہ اب تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ہمیشہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی تصدیق کی ہے چنانچہ ۷ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا جب ایک مرتبہ اس کا فیصلہ ہوگیا تو میں سمجھا کہ میرا دہلی میں قیام کرنا ضروری نہیں ہے یہاں گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، اس لئے میں ۳۰ جون کو کلکتہ واپس چلا گیا اور ۴ جولائی کو کلکتہ سے بمبئی کے لئے روانہ ہوا سرت چندر بوس بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے. تقریباً ہر اسٹیشن پر بہت سے لوگ جمع ہوتے اور سب کا کہنا یہ تھا کہ مجھے کانگریس کی صدارت سے الگ نہیں ہونا چاہئے سرت بابو تقریباً ہر بڑے اسٹیشن پر میرے ڈبے میں آتے اور بار بار کہتے کہ «دیکھئے پبلک کیا چاہتی ہے اور اس کے باوجود آپ نے کیا کیا ہے»

۶ جولائی کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے تجویزوں کے مسودے تیار کئے. پہلا رزولیوشن کیبنٹ پلان سے متعلق تھا، اسے پیش کرنا میرے سپرد کیا گیا، کیونکہ سوشلسٹ خیال کے لوگوں کی طرف سے شدید مخالفت کا اندیشہ تھا.

جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ شروع ہوا، تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ نئے صدر کی حیثیت سے میری جگہ صدارت کے عہدے کو سنبھالیں. سردار پٹیل نے شکریہ کی تجویز پیش کی، جس میں انہوں نے میری ان خدمات کو سراہا، جو میں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اس نازک زمانے میں

کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جواہر لال کو صدر ہونا چاہئیے. چنانچہ ۲۶ اپریل سنہ۱۹۴۶ء کو میں نے ایک بیان جاری کیا، جس میں ان کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا اور کانگریس کے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ جواہر لال کو بالاتفاق منتخب کریں. غالباً گاندھی جی کسی حد تک سردار پٹیل کو صدر بنانے کی طرف مائل تھے، لیکن جب میں نے جواہر لال کا نام تجویز کر دیا، تو انہوں نے پھر اپنی رائے کا پبلک میں اظہار نہیں کیا. کچھ لوگوں نے سردار پٹیل اور آچاریہ کرپلانی کے نام تجویز کئے مگر آخر میں سب جواہر لال کو صدر بنانے پر متفق ہو گئے

میں نے اس سلسلے میں اپنی عقل سلیم کے مطابق عمل کیا، مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دیکھتے ہوئے مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید میں غلطی پر تھا اور جو لوگ چاہتے تھے کہ میں کم سے کم ایک سال اور صدر رہوں، وہ حق بجانب تھے.

میرے فیصلے سے پورے ملک میں کانگریس کے اندر ہلچل پیدا ہوگئی. کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے کئی ممتاز لیڈر مجھے اس پر راضی کرنے کے لئے آئے کہ میں اپنا بیان واپس لے لوں اور اپنے نام کو پیش کرنے کی اجازت دیدوں. اخبارات میں بھی اسی قسم کی اپیلیں شائع ہوئیں. لیکن میں ایک فیصلہ کرچکا تھا اور اپنی رائے بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی.

مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا. ایسا ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی کیا تھا، مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظوری ضروری تھی. ہم نے سوچا تھا کہ یہ محض رسمی

اپنی کامیابی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ کریں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کیبنٹ مشن پلان میں کانگریس کے تمام اہم اصولوں کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ کانگریس چاہتی تھی کہ ہندوستان آزاد ہو اور متحد رہے اور انتشار پیدا کرنے والے رجحانات کو روکا جائے، اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کانگریسی سوشلسٹوں جیسے لوگ کیسے کہتے ہیں کہ ہم نے فتح نہیں حاصل کی ہے، شکست کھائی ہے

میری تقریر کا حاضرین پر فیصلہ کن اثر ہوا، جب ووٹ لئے گئے تو رزولیوشن بھاری اکثریت سے منظور ہوگیا۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کرلینے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس پر منظوری کی مہر لگ گئی۔

چند دنوں کے بعد مجھے لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس کے مبارک باد کے تار موصول ہوئے۔ جس میں انہوں نے اس پر خوشی ظاہر کی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے رزولیوشن منظور کرلیا اور مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ میں نے کیبنٹ مشن پلان کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔

اب ان افسوسناک واقعات میں سے ایک پیش آیا، جنہوں نے ہماری سیاست اور زندگی کے رخ کو پلٹ دیا۔ ۱۰ جولائی کو بمبئی میں جواہر لال نے ایک پریس کانفرس بلائی۔ اس میں انہوں نے ایک ایسا بیان دیا، جو عام حالات میں قابل توجہ نہ سمجھا جاتا، مگر بدگمانی اور منافرت کی فضا میں اس سے انتہائی افسوسناک نتائج کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ کچھ پریس کے

انجام دی تھیں اور تفصیل کے ساتھ بتلایا کہ بہت سی ہمت شکن دشواریوں کو کس طرح دور کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے کیبنٹ مشن پلان کے بارے میں رزولیوشن پیش کیا اور اختصار کے ساتھ اس کی خاص خاص باتوں کا ذکر کیا۔ سوشلسٹ خیال کے لوگوں نے بڑی شد و مد سے اس کی مخالفت کی۔ کانگریس سوشلسٹوں نے مخالفت میں پیش قدمی کی، کیونکہ یہ ایک عام اور عامیانہ طریقہ بن گیا تھا کہ انتہا پسندی کا نقطۂ نظر اختیار کرکے ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان سوشلسٹوں نے حقیقت کو پس پشت ڈال کر اداکاری کے انداز دکھائے۔ یوسف مہر علی اس وقت بہت بیمار تھے، مگر حاضرین جلسہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ ان کو اسٹریچر پر لے آئے۔ انھوں نے بھی کیبنٹ مشن پلان کے خلاف تقریر کی۔

میں نے اپنے جواب میں تفصیل کے ساتھ پلان کے امکانات اور نتائج کو واضح کیا اور بتلایا کہ در اصل یہ پلان کانگریس کی فتح کی علامت ہے میں نے کہا کہ اس کے ذریعہ تشدد اور خوں ریزی کے بغیر آزادی حاصل ہوجائے گی۔ برطانیہ کا ہندوستان کے قومی مطالبے کو تسلیم کرلینا، جب کہ پر امن ایجی ٹیشن اور گفتگو کے سوا کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا تھا، ایک ایسا واقعہ ہے، جس کی دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ چالیس کروڑ کی ایک قوم، فوجی اقدامات کی بدولت نہیں بلکہ گفتگو اور مفاہمت کے ذریعہ آزاد ہو رہی ہے۔ صرف اس نقطۂ نظر سے ہی دیکھا جائے تو یہ بڑی حماقت ہوگی، اگر ہم

میں شریک ہونے والی دوسری جماعتوں کی رضامندی کے بغیر کوئی تبدیلی کرنے کی مجاز نہیں تھی۔

مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کر لیا تھا، کیونکہ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی حکومت اس سے زیادہ رعایت نہیں کرے گی مسٹر جناح نے لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے پوری وضاحت کے ساتھ کہا تھا کہ وہ پلان کو منظور کر لینے کی سفارش صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ اس سے بہتر چیز حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اس لئے مسٹر جناح مصالحت کی گفتگو کے نتائج سے کچھ بہت خوش نہیں تھے۔ وہ صرف اس لئے راضی ہوگئے تھے کہ اس کے سوا چارہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جواہر لال کا بیان ان کے لئے ایک غیر متوقع حادثہ ثابت ہوا۔ انہوں نے فوراً ہی ایک بیان جاری کیا کہ کانگریس کے صدر کے اس اعلان کے بعد پوری صورت حال پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے لیاقت علی خاں کو لیگ کاؤنسل کا اجلاس طلب کرنے کی ہدایت دی اور ایک بیان دیا کہ مسلم لیگ کاؤنسل نے دہلی میں کیبنٹ مشن پلان کو اس لئے تسلیم کیا تھا کہ اس کو یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس نے بھی اس اسکیم کو منظور کر لیا ہے اور ہندوستان کا جو دستور بنے گا، اس کے لئے یہ پلان بنیاد کا کام دے گا۔ اب چونکہ کانگریس کے صدر نے اعلان کردیا ہے کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل پر اسکیم میں تبدیلی کر سکے گی، اس لئے اقلیتیں اکثریت

نمایندوں نے جواہر لال سے سوال کیا کہ کیا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس رزولیوشن کو منظور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کانگریس نے پلان کو بحیثیت مجموعی تسلیم کرلیا ہے اور اسی کے ساتھ انٹرم حکومت کی تشکیل بھی طے ہوگئی ہے

جواہر لال نے اس کے جواب میں کہا کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرتے ہوئے اپنے آپ کو معاہدوں کا پابند نہ سمجھے گی اور جس قسم کے حالات پیدا ہوں گے، اس کے مطابق آزادی کے ساتھ فیصلے کرے گی۔

اس پر پریس کے نمایندوں نے سوال کیا کہ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔

جواہر لال نے پرزور طریقے پر جواب دیا کہ کانگریس نے محض دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے آپ کو کیبنٹ مشن پلان میں تبدیلی اور کمی بیشی کرنے کی مجاز سمجھتی ہے

میں یہاں صاف صاف لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواہر لال کا بیان غلط تھا یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ کانگریس اپنی مرضی کے مطابق پلان میں جو ترمیم چاہتی کرسکتی تھی در اصل ہم نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی اور مرکز کے ماتحت تین محکمے لازمی طور پر ہوں گے، بقیہ محکمے صوبوں کے حدود اختیار میں رہیں گے ہم نے یہ بھی مان لیا تھا کہ صوبے کے تین گروپ، اے، بی، سی میں تقسیم کردئے جائیں گے ان شرائط میں کانگریس اپنی طرف سے معاہدہ

کے صدر کی عزت پر حرف آتا تھا، دوسری طرف جو سمجھوتہ اتنی مشکلوں سے حاصل کیا گیا، خطرے میں تھا. صدر کے بیان کی تردید کرنے سے کانگریس کمزور ہوتی، لیکن کیبنٹ مشن پلان کو چھوڑنا ملک کو تباہی کی نذر کرنا تھا. بالآخر ہم نے ایک ایسے رزولیوشن کا مسودہ تیار کیا، جس میں پریس کانفرنس کا کوئی ذکر نہیں تھا، مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلے کی حسب ذیل الفاظ میں دوبارہ توثیق کی گئی تھی

« ورکنگ کمیٹی کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کاؤنسل نے اپنے پچھلے فیصلے کو منسوخ کرتے ہوئے طے کیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوگی. ایسے دور میں جبکہ ہم بیرونی حکومت کی ماتحتی سے مکمل آزادی کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں اور ہم وسیع اور پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل کا سامنا کرنا اور ان کو حل کرنا ہے، ہندوستان کے عوام اور ان کے نمائندوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اشتراک عمل درکار ہے. تاکہ یہ تبدیلی خوشگوار طریقے پر عمل میں آئے اور تمام متعلقہ لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو. کمیٹی اس بات سے واقف ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں فرق ہے، پھر بھی ملک کے اجتماعی مفاد اور ہندوستانی قوم کی آزادی کی خاطر کمیٹی ان تمام لوگوں سے اشتراک عمل کی اپیل کرتی ہے. جو ملک کی آزادی اور بہبودی چاہتے ہیں. اس امید میں کے قومی فرائض کی ادائیگی میں اتحاد عمل کرنے سے ہندوستان کے بہت سے مسائل کو حل

کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ انھوں نے کہا کہ جواہرلال کے اعلان کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا ہے اس لئے وائسرائے کو چاہئے کہ مسلم لیگ کو، جس نے پلان کو قبول کر لیا ہے، وزارت بنانے کی دعوت دیں۔

مسلم لیگ کاؤنسل کا اجلاس ۲۷ جولائی کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ مسٹر جناح نے اپنی افتتاحی تقریر میں پاکستان کے مطالبے کو دہرایا اور کہا کہ مسلم لیگ کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے تین روز کی بحث کے بعد کاؤنسل نے ایک رزولیوشن منظور کیا، جس میں کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پاکستان کو حاصل کرنے کے لئے ڈائرکٹ ایکشن کی پالیسی پر عمل کرے۔

میں اس نئی صورت حال سے سخت پریشان ہوا میں دیکھ رہا تھا کہ جس اسکیم کے لئے میں نے اتنی جدوجہد کی تھی، وہ خود ہمارے ہاتھوں برباد ہو رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملہ کی موجودہ صورت پر غور کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ فوراً طلب کرنی چاہئے۔ چنانچہ ۸ اگست کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ میں نے کہا کہ اگر ہم صورت حال کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف کر دینا چاہئے کہ کانگریس کی رائے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن میں ظاہر کردی گئی ہے اور کوئی شخص، چاہے وہ کانگریس کا صدر ہی کیوں نہ ہو، اس کو بدلنے کا مجاز نہیں ہے۔

ورکنگ کمیٹی بڑی مشکل میں پڑگئی۔ ایک طرف کانگریس

قدرتی بات ہے کہ وہ اپنے منصب کو ادا کرتے وقت ان حدود کا لحاظ رکھے گی، جو اس کے عمل کے ساتھ وابستہ ہیں. اس لئے وہ آزاد ہندوستان کا دستور مرتب کرنے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کی گنجائش رکھے گی کہ ان تمام لوگوں کو جن کے مطالبے یا اعتراض حق بجانب معلوم ہوتے ہوں، زیادہ سے زیادہ آزادی اور اطمینان حاصل ہو اس مقصد کی خاطر اور اسی خواہش کے تحت کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں با عمل شرکت کرے اور اس کو کامیاب بنائے، ورکنگ کمیٹی نے اپنا رزولیوشن ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کو منظور کیا تھا، جس کی بعد میں ۷ جولائی سنہ ۱۹۴٦ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تصدیق کر دی کانگریس، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس فیصلے پر قائم ہے اور اس کے مطابق وہ دستور سازاسمبلی میں کام کرے گی

ورکنگ کمیٹی کو توقع ہے کہ مسلم لیگ اور دوسری پارٹیاں قوم کے اور خود اپنے مفاد کی خاطر اس عظیم کام میں شریک ہوں گی

ہمیں امید تھی کہ ورکنگ کمیٹی کا یہ رزولیوشن معاملے کو بگڑنے سے بچا لے گا اب اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو پورا پورا منظور کرلیا ہے. اگر مسلم لیگ ہمارے رزولیوشن کو تسلیم کرلیتی تو وہ اپنے وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر اپنے پچھلے مقام پر واپس آسکتی تھی مگر مسٹر جناح نے اس کو منظور نہیں کیا اور کہا

کرنے کی صورت نکل آئے گی۔

«کمیٹی کے علم میں مسلم لیگ کے اعتراضات آئے ہیں، جن کا منشا یہ دکھانا ہے کہ کانگرس نے ان تجویزوں کو جو ۱۶ مئی کے بیان میں درج تھیں، مشروط طریقے پر تسلیم کر لیا ہے، کمیٹی اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس نے اسکیم کو پورا پورا تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ وہ ان تمام تجویزوں کو جو ۱۶ مئی کے بیان میں درج ہیں، پسند نہیں کرتی۔ اس نے اس کی تشریح اس مقصد سے کی ہے کہ اسکیم میں جو تضاد نظر آتے ہیں، ان کو دور کر دیا جائے اور ان اصولوں کی روشنی میں، جو حکومت کے «بیان» میں درج ہیں، ان باتوں کا ذکر کر دیا جائے، جو غلطی سے نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ کمیٹی یہ سمجھتی ہے کہ صوبجاتی خودمختاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ہر صوبے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی «گروپ» میں شامل ہو یا نہ ہو۔ تشریح کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوں گے، ان کا فیصلہ اس طریقِ کار کے مطابق کیا جائے گا جو «بیان» میں مقرر کیا گیا ہے۔ اور کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندوں کو ہدایت دے گی کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں۔

«ورکنگ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو فرماں روا کی حیثیت سے آخری فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا، یعنی اسے حق ہوگا کہ کسی بیرونی طاقت یا اقتدار کی مداخلت کے بغیر ہندوستان کے لئے ایک دستور وضع کرے لیکن یہ

کیونکہ اس میں ان ہی خیالات کی تکرار ہے ، جن کا اظہار کانگریس بالکل شروع میں کرچکی ہے ، بس الفاظ بدل گئے ہیں. انہوں نے جواہر لال کی دعوت کو کہ انٹرم حکومت کے قیام میں تعاون کریں ، نامنظور کردیا. اس کے بعد ۱۵ اگست کو جواہر لال ، مسٹر جناح سے ان کے مکان پر ملے ، مگر ان کی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور صورت حال بہت جلد بد سے بد تر ہونے لگی.

جب جولائی کے اواخر میں مسلم لیگ کونسل کا جلسہ ہوا اور اس نے ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا تو اس نے مسٹر جناح کو مختار کیا کہ پروگرام کی تعمیل میں جو اقدام مناسب سمجھیں کریں. مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ ۱٦ اگست ڈائرکٹ ایکشن کا دن ہوگا . مگر انہوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ اس دن کا پروگرام کیا ہوگا. یہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ تفصیلات طے کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل کی دوسری میٹنگ ہوگی ، مگر یہ نہیں ہوئی ، دوسری طرف میں نے کلکتہ میں دیکھا کہ عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو رہی ہے . اس سے قبل مخصوص دن منانے کے لئے سیاسی پارٹیاں ہڑتال کیا کرتی تھیں ، جلوس نکالتی تھیں اور جلسے کرتی تھیں ، مگر لیگ کا « ڈائرکٹ ایکشن » کا دن کچھ اور ہی قسم کا معلوم ہوتا تھا . کلکتہ میں میں نے دیکھا کہ لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ ۱٦ اگست کو مسلم لیگی ، کانگریسیوں پر حملے کریں گے اور کانگریس کی املاک لوٹیں گے . بنگال کی حکومت نے ۱٦ اگست کو سرکاری چھٹی کا دن قرار دیا تو

کہ جواہر لال کا بیان ہی کانگریس کے ذہن کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر کانگریس اس قدر جلد جلد اپنی رائے بدل سکتی ہے، جبکہ انگریز ابھی ملک میں موجود ہیں اور اس کے ہاتھوں میں اختیار نہیں آیا ہے، تو اقلیتیں کس بھروسے پر یقین کرلیں کہ جب انگریز چلے جائیں گے، تو کانگریس پھر بدل نہیں جائے گی اور اس کا نقطۂ نظر وہی نہ ہوجائے گا، جو جواہر لال نے اپنے بیان میں اختیار کیا ہے

ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن نے کیبنٹ مشن پلان کو مکمل طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اِنٹرم حکومت اور وہ تجاویز جن پر بعد کو عمل ہونے والا تھا دونوں تسلیم کی گئی تھیں ورکنگ کمیٹی کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کی اس غیر مبہم منظوری کا وائسرائے نے فوراً جواب دیا اور ۱۲ اگست کو ان الفاظ میں جواہر لال کو مرکز میں اِنٹرم حکومت قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔

« ہر اکسلنسی وائسرائے، ہر مجسٹی کی حکومت کی منظوری سے کانگریس کے پریزیڈنٹ کو دعوت دی ہے کہ وہ اِنٹرم حکومت کے فوری قیام کے بارے میں تجاویز پیش کریں اور صدر کانگریس نے اس دعوت کو قبول کرلیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جلد ہی نئی دہلی آکر ہر اکسلنسی وائسرائے سے اس تجویز پر گفتگو کریں گے۔»

مسٹر جناح نے اسی دن ایک بیان جاری کیا، جس میں انہوں نے کہا کہ ورکنگ کمیٹی کے تازہ ترین رزولیوشن سے، جو ۱۵ اگست کو وردھا میں منظور کیا گیا ہے، کوئی بات نہیں بنتی،

بنگال کانگریس کے لیڈر، سرت چندر بوس گورنر سے ملے اور صورت حال پر قابو حاصل کرنے کے لئے فوری اقدام کا مطالبہ کیا انہوں نے گورنر کو یہ بھی بتلایا کہ انہیں اور مجھے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے دہلی جانا ہے۔ گورنر نے وعدہ کیا کہ وہ ہوائی اڈے تک ہماری حفاظت کے لئے فوجی دستے کا انتظام کردیں گے۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب کوئی نہیں آیا تو تن تنہا روانہ ہوگیا۔ سڑکیں سنسان تھیں اور شہر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا جب میں اسٹرینڈ روڈ سے گذر رہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ بہت سے ٹھیلے والے اور چوکیدار لٹھ لئے کھڑے ہیں۔ انہوں نے میری کار پر حملہ کیا میرے ڈرائیور نے چلا کر کہا کہ یہ کانگریسی لیڈر کی کار ہے پھر بھی انہوں نے پروا نہیں کی غرض کہ میں بڑی مشکلوں سے ہوائی جہاز کی روانگی سے چند منٹ پہلے ڈم ڈم پہنچا میں نے وہاں دیکھا کہ ایک بہت بڑا فوجی دستہ ملٹری لاریوں میں انتظار کررہا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ امن و امان بحال کرنے میں وہ مدد کیوں نہیں کررہے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے، مگر کچھ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ کلکتہ کے پورے شہر میں فوج اور پولیس تیار کھڑی تھی اور بے قصور مردوں اور عورتوں کے قتل کا تماشہ دیکھتی رہی۔

۱۶ اگست سنہ ۱۹۴۶ء کا دن صرف کلکتہ ہی کے لئے نہیں، بلکہ پورے ہندوستان کے لئے سیاہ دن تھا۔ حالات نے جو پلٹا کھایا تھا، اس کی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان

سراسیمگی کی کیفیت اور پھیل گئی۔ بنگال اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا اور جب اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، تو احتجاجاً واک آوٹ کیا کہ حکومت نے پالیسی کے طور پر ایک پارٹی کے فیصلے کو نافذ کرنے کے لئے سرکاری وسائل کو استعمال کیا ہے۔ کلکتہ میں عام طور پر بے اطمینانی اور پریشانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہاں حکومت مسلم لیگ کے اختیار میں تھی اور مسٹر ایچ۔ ایس۔ سہروردی چیف منسٹر تھے

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۹ اگست کو ایک پارلیمنٹری سب کمیٹی مقرر کی تھی، جو سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مجھ پر مشتمل تھی ۱۳ اگست کو ہم نے اس کی ایک میٹنگ کی، جس میں اِنٹرم حکومت کے قیام کے سلسلے میں وائسرائے کو پیش کرنے کے لئے تجویز پر گفتگو ہوئی ۱۷ کو جواہر لال نے پارلیمنٹری کمیٹی کی میٹنگ طلب کی اس میں شرکت کے لئے میں ۱۶ کو ہوائی جہاز سے دہلی روانہ ہوا

۱۶ اگست کا دن ہندوستان کی تاریخ میں ماتمی دن رہے گا۔ کلکتہ کے عظیم الشان شہر میں عوام کے تشدد نے، جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، خوف، قتل اور غارت گری کا طوفان برپا کیا۔ سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں، ہزاروں زخمی ہوئے اور کروڑوں روپے کی جائداد برباد ہوگئی۔ لیگ نے لوگوں کے جلوس نکالے، جنھوں نے لوٹنا اور آگ لگانا شروع کردیا۔ بہت جلد پورے شہر پر مسلمان اور ہندو غنڈوں کا قبضہ ہوگیا۔

کی کامیابی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ لیگ نے اس طرح دوسرے مسلم اکثریت کے صوبوں میں جیسے کہ پنجاب، سندھ اور صوبۂ سرحد، بڑا نقصان اٹھایا تھا۔ بمبئی میں اس نے کئی نشستیں حاصل کیں، مگر سب سے بڑی کامیابی یو پی میں ہوئی، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہاں لیگ کو جمعیۃ علمائے ہند کی حمایت حاصل ہوگئی۔ جمعیۃ نے اس خیال کے ماتحت لیگ کی حمایت کی تھی کہ انتخاب کے بعد مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی۔

چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں اس وقت یو پی مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب میں وزارت بنانے کے سلسلے میں لکھنؤ آیا تو ان دونوں سے بات کی۔ ان دونوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف کانگریس سے تعاون کریں گے، بلکہ کانگریس کے پروگرام کی پوری پوری حمایت کریں گے۔ قدرتی طور پر ان کو امید تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ بھی شریک کی جائے گی۔ مقامی حالات کچھ ایسے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو چھوڑ کر وزارت میں شامل نہیں کیا جاسکتا تھا، یا دونوں لئے جاتے یا دونوں چھوڑ دئے جاتے۔ اس لئے میں نے امید دلائی تھی کہ دونوں لے لئے جائیں گے۔ اگر وزارت صرف سات ارکان پر مشتمل ہوئی، تو ان میں دو مسلم لیگی ہوتے اور باقی سب کانگریسی۔ اگر کابینہ نو ممبروں کی ہوتی تو کانگریس کی اکثریت میں اور اضافہ ہوجاتا۔ مجھ سے گفتگو کے بعد ایک نوٹ تیار کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس سے اشتراک

مفاہمت کے ذریعہ مسائل کے پُر امن طریقے پر حل ہونے کی امید جاتی رہی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کے عظیم ترین حادثات میں سے ہے اور مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ لازمی اور ناگزیر نتیجہ تھا اس کا کہ مسلم لیگ کو سیاسی اور فرقہ وارانہ سمجھوتے کے مسئلے کو دوبارہ بحث میں لانے کا موقع دیا گیا۔ مسٹر جناح نے اس غلطی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لیگ نے شروع میں کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس سے وہ بری ہوگئی۔

جواہر لال میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی قومی زندگی کو ترقی دینے میں کسی سے کم حصہ نہیں لیا ہے انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے محنت کی ہے اور تکلیفیں اٹھائی ہیں اور آزادی کے بعد وہ ہمارے قومی اتحاد اور ترقی کی علامت بن گئے ہیں۔ پھر بھی مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں۔ یہی نہیں، بسا اوقات وہ معاملوں کے خالص نظری پہلو سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ واقعی صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں کرپاتے۔

دستور ساز اسمبلی کے بارے میں انہوں نے جو بیان دیا، اس کا ذمہ دار بھی یہی مجرد علمی بحث کا شوق ہے۔ اسی نظری رجحان کی وجہ سے انہوں نے اسی قسم کی غلطی سنہ ۱۹۳۷ء میں کی تھی۔ ان انتخابات میں بمبئی اور یو پی کے علاوہ پورے ملک میں مسلم لیگ بری طرح ناکام رہی تھی۔ بنگال میں گورنر نے لیگ کی حکومت بنانے کا تقریباً فیصلہ کرلیا تھا، مگر کریشک پرجا پارٹی

میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور جواہر لال کی رائے اور فیصلہ پر اثر ڈالا تھا۔ مجھے ٹنڈن کے خیالات کبھی قابل لحاظ نہیں معلوم ہوئے اور میں نے جواہر لال کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی رائے پر سختی سے عمل نہ کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم لیگ کو وزارت میں شامل نہ کرنا ان کی بہت بڑی غلطی ہے میں نے ان کو اس سے بھی آگاہ کیا کہ ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلم لیگ میں نئی جان پیدا ہوجائے گی اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی راہ میں نئی مشکلات کھڑی ہوجائے گی۔ جواہر لال نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور اپنے نقطۂ نظر کو صحیح قرار دیا۔ انہوں نے یہ دلیل دی کہ جب مسلم لیگ کے کل چھبیس ممبر ہیں تو وہ کیبنٹ میں ایک سیٹ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرسکتی جب میں نے دیکھا کہ جواہر لال اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، تو میں وردھا گیا اور گاندھی جی سے ہدایت حاصل کرنی چاہی جب میں نے ان سے پوری صورت حال وضاحت کے ساتھ بیان کی، تو انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ وہ جواہر لال کو مشورہ دیں گے کہ اپنے فیصلہ میں مناسب ترمیم کریں۔ جب جواہر لال نے معاملہ کو دوسرے رنگ میں پیش کیا تو گاندھی جی ان کی بات مان گئے اور جتنا اصرار ان کو کرنا چاہیے تھا، نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یو پی میں مسلم لیگ سے سمجھوتا نہیں ہوسکا۔ مسٹر جناح نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور پوری لیگ کو کانگریس کا مخالف بنا دیا۔ انتخابات

عمل کریگی اور کانگریس کا پروگرام قبول کرے گی نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں دونوں نے اس پر دستخط کردئیے۔ اس کے بعد بہار کی وزارت کے قیام کے لئے میں لکھنؤ سے پٹنہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد میں الہ آباد واپس آیا اور یہ معلوم کرکے سخت افسوس ہوا کہ جواہر لال نے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو لکھ دیا ہے کہ ان میں سے صرف ایک ہی کو وزارت میں لیا جاسکے گا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مسلم لیگ پارٹی طے کرسکتی ہے کہ ان میں سے کون لیا جائے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ان میں سے صرف ایک شامل نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے ان دونوں نے معذرت کردی اور لکھا کہ وہ جواہر لال کی پیش کش قبول نہیں کرسکتے

یہ واقعہ بہت ہی افسوسناک تھا مگر یو پی مسلم لیگ کی طرف سے تعاون کی جو پیش کش کی گئی تھی وہ منظور کرلی جاتی، تو عملی طور پر مسلم لیگ کانگریس میں مدغم ہوگئی ہوتی۔ جواہر لال نے اپنے عمل سے یو پی میں لیگ کو نئی زندگی بخش دی۔ ہندوستانی سیاست کا جس نے بھی مطالعہ کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ مسلم لیگ کی دوبارہ تنظیم یو پی میں کی گئی۔ مسٹر جناح نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جارحانہ اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کردیا، جس کا آخری نتیجہ پاکستان کا قیام تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ پرشوتم داس ٹنڈن نے ان تمام معاملات

ہے کہ مسلم لیگ اپنے اقرار سے ہٹ گئی، مگر اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ تمام مسائل پر دوبارہ گفتگو ہو۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ برطانیہ سے ہماری گفت و شنید کبھی کوئی آخری شکل اختیار نہیں کرے گی۔ اس کا رائے عامہ پر بہت برا اثر پڑے گا اور اس سے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے جواب دیا کہ انہیں مجھ سے اتفاق ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ حکومت کا رویہ بھی یہی ہوگا۔ جیسا میں سمجھتا تھا ویسا ہی ہوا۔ میں ذکر کرچکا ہوں کہ ۱۲ اگست سنہ ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے ایک سرکاری اطلاع کے ذریعہ جواہر لال کو انٹرم حکومت بنانے کی دعوت دی۔

ہم ۱۷ اگست کو ایسے حالات میں دہلی میں جمع ہوئے جبکہ کلکتہ اور دوسرے مقاموں کے فسادات نے فضا کو تاریک کردیا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ مسٹر جناح، حکومت میں شامل ہونے کی جو دعوت جواہر لال نے دی تھی، اسے قبول نہ کریں گے۔ دراصل، ان کا جواب، جس میں انہوں نے دعوت کو نامنظور کیا تھا، ۱۶ ہی کو آچکا تھا۔ جواہر لال نے تعاون کے لئے دوبارہ درخواست کی اور کہا کہ مسلم لیگ کے لئے ہمیشہ دروازہ کھلا رہے گا، مگر اب بات اس قدر بڑھ گئی تھی کہ دوستانہ سمجھوتے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

کے بعد مسٹر جناح کے بہت سے حامی ان کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوگئے تھے، مگر اب وہ دوبارہ ان کو اپنے حلقہ میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

جواہر لال کی ۱۹۳۷ء کی غلطی کافی اہم تھی، مگر ۱۹۴۶ء کی غلطی اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی۔ جواہر لال کی مدافعت میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کو اس کی توقع نہیں تھی کہ مسلم لیگ ڈائرکٹ ایکشن شروع کردے گی۔ مسٹر جناح عوامی تحریک کے کبھی بھی قائل نہیں تھے۔ میں نے خود بھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مسٹر جناح میں یہ تبدیلی کس طرح ہوگئی۔ غالباً ان کو توقع تھی کہ جب مسلم لیگ، کیبنٹ مشن پلان کو نامنظور کردے گی، تو برطانوی حکومت پورے معاملہ پر از سر نو غور کرے گی اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوگا۔ وہ وکیل تھے اور غالباً انہوں نے سوچا ہوگا کہ اگر دوبارہ گفتگو ہوئی تو وہ اپنے مطالبوں کو اصرار کے ساتھ پیش کرکے کچھ اور حاصل کرلیں گے۔ مگر ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ برطانوی حکومت نے مسٹر جناح پر احسان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور از سر نو گفتگو نہیں شروع کی۔

سر اسٹیفرڈ کرپس اس پوری مدت میں مجھ سے خط و کتابت کرتے رہے تھے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ کیبنٹ مشن نے کانگریس اور مسلم لیگ سے کچھ اوپر دو ماہ تک بحث و گفتگو کی ہے اور اس کے بعد ایک پلان مرتب کیا ہے، جس کو کانگریس اور لیگ دونوں نے منظور کرلیا ہے۔ یہ افسوس کی بات

رہ کر زیادہ خدمت کر سکوں گا. لیکن اب میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت کابینہ کی رکنیت، کام کا زیادہ موقع فراہم کرتی.

شملہ کانفرنس کے وقت میں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ کابینہ میں پارسیوں کا بھی ایک نمائندہ ہونا چاہئیے. اب جب کہ کانگریس حکومت بنا رہی تھی، میں نے اس بات پر پھر زور دیا. کچھ بحث و مباحثے کے بعد میرے ساتھیوں نے تجویز مان لی. چونکہ پارسی زیادہ تر بمبئی اور آس پاس کے علاقوں میں رہتے ہیں، اس لئے ہم نے سوچا کہ پارسی نمائندے کے انتخاب میں سردار پٹیل زیادہ صحیح مشورہ دے سکتے ہیں چنانچہ ہم نے پارسی رکن کا انتخاب پٹیل پر چھوڑ دیا انہوں نے مسٹر ایچ. سی بھابھا کا نام تجویز کیا بعد کو پتہ چلا کہ مسٹر بھابھا سردار پٹیل کے لڑکے کے دوست ہیں اور کسی طرح بھی پارسیوں کے لیڈر یا ان کے نمائندہ نہیں تصور کئے جاسکتے ہیں. ہمارا انتخاب غلط ثابت ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ کابینہ سے الگ ہوگئے.

ہم نے یہ بھی طے کیا کہ حکومت میں کوئی تجربہ کار ماہر معاشیات بھی ہونا چاہئیے جو ہندوستان کا پہلا وزیر مالیات ہو. اس کے لئے ہم نے ڈاکٹر جان متھائی کو منتخب کیا اگرچہ وہ کسی لحاظ سے بھی کانگریسی نہیں تھے لیکن اس وقت صرف پارٹی کے لوگوں کو لینے کی کوئی سخت پابندی نہیں تھی.

مسلم لیگ کو صرف مایوسی ہی نہیں تھی بلکہ اُس پر انتہائی غصے کی کیفیت طاری تھی اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ برطانیہ

انٹرم حکومت

میں ذکر کر چکا ہوں کہ کانگریس نے انٹرم حکومت کی تشکیل کا کام پارلیمنٹری پارٹی کے سپرد کیا تھا. چنانچہ میں ، جواہر لال ، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد اس سلسلے میں ۱۷ تاریخ کو ملے میرے ساتھیوں کا اصرار تھا کہ مجھے انٹرم حکومت کی کابینہ میں شامل ہونا چاہئے ، گاندھی جی کا بھی یہی خیال تھا. میرے لئے یہ مسئلہ بہت نازک تھا لیکن بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے الگ رہنا چاہئے . اس لئے میں نے مشورہ دیا کہ آصف علی کو کابینہ میں لے لیا جائے آصف علی نے جب سنا تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ خود مجھی کو کابینہ میں شامل ہونا چاہئے لیکن میں راضی نہ ہوا میرے کئی احباب اس وقت سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ میرا فیصلہ غلط تھا . ان کا خیال تھا کہ جس نازک دور سے ہم گذر رہے ہیں اس کا اور ملک کے مفاد کا تقاضہ یہی ہے کہ میں حکومت میں شامل ہوں. میں اس پر اکثر غور کرتا رہا ہوں اور اب میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا فیصلہ واقعی درست تھا. ممکن ہے کہ الگ رہنے کے بجائے حکومت میں شامل ہوکر میں ملک کی زیادہ خدمت انجام دے سکتا. اس وقت میرا خیال تھا کہ میں الگ

کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے بعد جب میں لارڈ ویول سے ملا تو اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ اُنہیں میری بات بہت پسند آئی تھی اور اُنہوں نے میرے بیان کی ایک نقل لیاقت علی خاں کو بھیجی تھی، اس درخواست کے ساتھ کہ اُسے مسٹر جناح کو دکھلا دیں۔

اس موقع پر چند الفاظ اُن لوگوں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں جنہیں مسٹر جناح نے کابینہ کے لئے نامزد کیا تھا۔ لیاقت علی خاں کے علاوہ مسلم لیگ کے سب سے ممتاز اور تجربہ کار لیڈروں میں بنگال کے خواجہ ناظم الدین اور یوپی کے نواب اسماعیل خاں تھے۔ یہ تقریباً ایک طے شدہ بات سمجھی جاتی تھی کہ اگر لیگ نے حکومت میں شریک ہونا منظور کیا تو یہی تینوں لیگ کے نمائندے ہوں گے شملہ کانفرنس کے دوران میں یہی تین نام بار بار لئے جاتے تھے اب جب کہ لیگ نے حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا تو مسٹر جناح نے ایک عجیب حرکت کی۔ خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خاں نے کانگریس اور لیگ کے جھگڑوں میں کبھی انتہا پسندی کا رویہ نہیں اختیار کیا تھا مسٹر جناح اس پر ناخوش ہو گئے انہوں نے سوچا کہ یہ دونوں ان کے اشاروں پر چلنے سے انکار کریں گے۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اِن دونوں کو نہیں لیں گے۔ لیکن اگر یہ بات قبل از وقت معلوم ہوجاتی تو لیگ کی کونسل میں ہنگامہ برپا ہوسکتا تھا اس لئے انہوں نے پہلے لیگ کی کونسل سے ایک تجویز منظور کرائی جس کے مطابق اُن کو نامزدگی کا اختیار کلی سونپ دیا گیا۔

اس کے بعد انہوں نے ناموں کی فہرست لارڈ ویول کے پاس

نے اُس کو دھوکا دیا ہے۔ اس نے دلی اور دوسرے مقامات پر مظاہرے کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی بہر حال ملک میں ہر طرف تلخی اور بے چینی تھی اور لارڈ ویول سمجھے کہ لیگ کو انٹرم حکومت میں شامل ہونے پر راضی کرنا ضروری ہو گیا ہے اس لئے اُنھوں نے مسٹر جناح کو دلی بلایا وہ آئے اور لارڈ ویول سے اُن کی کئی ملاقاتیں ہوئیں آخر کار ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ نے اِنٹرم حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا

اِس عرصے میں لارڈ ویول سے میں کئی بار ملا اُن کا کہنا تھا کہ اِنٹرم حکومت میں لیگ شامل نہ ہوئی تو کیبنٹ مشن کے منصوبے میں رخنہ پڑ سکتا ہے انھوں نے کہا کہ فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں اور جب تک لیگ حکومت میں نہیں شامل ہوگی یہ ہوتے رہیں گے میں نے کہا کہ کانگریس کی طرف سے لیگ کے شامل ہونے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ در حقیقت میں نے اس بات پر بار بار زور دیا تھا کہ لیگ کو مرکزی حکومت میں شامل ہونا چاہئے جواہر لال نے حکومت میں شامل ہونے سے قبل اور بعد میں بھی کئی بار مسٹر جناح سے اشتراک عمل کی اپیل کی تھی۔

اس موقع پر میں نے ایک اور بیان شائع کیا جس میں میں نے کہا کہ کیبنٹ مشن کی تجاویز سے مسلم لیگ کے تمام وہ اندیشے، جنھیں حق بجانب کہا جا سکتا ہے، دور ہو جاتے ہیں مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ آزادی کے ساتھ کام کر سکتی تھی اور اپنا نظریہ اُس کے سامنے پیش کرسکتی تھی۔ اس لئے مسلم لیگ کے پاس مجلس دستور ساز کو بائیکاٹ کرنے کا مطلق

کو نامزد کرے لیکن اس کے باوجود کانگریس نے ہندؤں کے
کے علاوہ مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی اور شیڈیول کاسٹ کے
نمائندوں کو ایکزیکیوٹیو کونسل کے لئے نامزد کیا۔ مسٹر جناح نے
سوچا کہ انھیں یہ ظاہر کرنا چاہئے کہ لیگ بھی دوسرے فرقوں
کی نمائندگی کرسکتی ہے اس لئے انھوں نے ایک غیر مسلم کو
اپنے نمائندوں میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس خیال سے
انھوں نے جوگیندر ناتھ منڈل کو منتخب کیا یہ بات ان کے
ذہن میں نہیں آئی کہ وہ اس طرح اپنے ہی مطالبے کی تردید
کر رہے ہیں کہ کانگریس کو صرف ہندو اور مسلم لیگ کو
صرف مسلمان نامزد کرنے چاہئیں اس کے علاوہ ان کے انتخاب
پر لوگوں کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ بنگال میں جب مسٹر
سہروردی نے مسلم لیگ کی وزارت بنائی تھی تو اس میں
جوگیندر ناتھ منڈل تنہا غیر مسلم ممبر تھے اس وقت بنگال میں
یہ بالکل غیر معروف تھے اور ہندوستان میں ان کی کوئی حیثیت
ہی نہیں تھی لیکن اب چونکہ لیگ نے انھیں نامزد کیا تھا اور
انھیں کوئی نہ کوئی پورٹ فولیو دینا ضروری تھا اس لئے انھیں
ممبر قانون بنایا گیا اس زمانے تک بیشتر محکموں کے سکریٹری
انگریز تھے منڈل صاحب کو بھی ایک انگریز سکریٹری ملا تھا
جو برابر شکایت کیا کرتا تھا کہ منڈل جیسے ممبر کے ساتھ کام
کرنا بڑا مشکل ہے۔

اب چونکہ لیگ نے حکومت میں شامل ہونا منظور کرلیا تھا
اس لئے کانگریس کو لیگ کے نمائندوں کے لئے جگہ نکالنے

نہیجدی، نام یہ تھے، لیاقت علی خاں، چندریگر، عبدالرب نشتر غضنفر علی خاں اور جوگیندر ناتھ منڈل۔ منڈل کے بارے میں تو میں بعد میں کچھ کہونگا، لیکن دوسرے تین آدمی بالکل غیر معروف تھے۔ یہ ایسے چھپے رستم تھے جن کے بارے میں خود لیگ کے ممبر کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ لیگ میں قومی حیثیت کے چند ہی لیڈر تھے اس لئے کہ اس نے سیاسی جد و جہد میں شرکت نہیں کی تھی۔ تاہم اس کے ممبروں میں خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خاں جیسے تجربہ کار حاکم تھے۔ ان سب کو مسٹر جناح کے تین جی حضوریوں کی خاطر نظر انداز کردیا گیا۔

انٹرم حکومت کے لئے لیگ کے ممبروں کے نام کا اعلان ۲۵ اکتوبر کو ہوا، خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خاں لیگ کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ امپیریل ہوٹل میں اس اعلان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں اور ان کے حامیوں کو پورا یقین تھا کہ انہیں کے نام پیش کئے جائیں گے اور مسلم لیگ کے بہت سے ممبر ہار اور گلدستے لیکر آئے تھے۔ جب ناموں کا اعلان ہوا تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے غصے اور مایوسی کی کیا کیفیت ہوگی۔ مسٹر جناح نے ان کی ساری امیدوں پر پانی ہی نہیں برف کا پانی پھیر دیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز حرکت یہ تھی کہ مسلم لیگ نے اس فہرست میں- جوگیندر ناتھ منڈل کا نام شامل کیا۔ مسٹر جناح نے ہر امکانی کوشش کی تھی کہ کانگریس صرف ہندوں

سمجھتے تھے کہ اس دقت کے پیش نظر لیگ اس پیش کش کو منظور نہیں کرے گی اگر ایسا ہُوا تو کانگریس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اس کے بر عکس اگر لیگ نے منظور کرلیا تو جو بھی اس کا ممبر ہوگا وہ خود حماقتیں کرلے گا۔ دونوں شکلوں میں کانگریس کا فائدہ تھا۔

سردار پٹیل نے اس تجویز کو غنیمت سمجھا اور انہوں نے اس کی پرزور تائید کی۔ میں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ مالیات بہت اہم شعبہ ہے اور اگر اِسے لیگ کو دیدیا گیا تو ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن سردار پٹیل نے اس کا جواب یہ دیا کہ چونکہ لیگ اس شعبے کو سنبھال ہی نہیں سکے گی اس لئے وہ اسے منظور نہیں کرے گی۔ میں اس فیصلے پر خوش نہیں تھا لیکن چونکہ سب متفق تھے اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ چنانچہ وائسرائے کو اطلاع دیدی گئی کہ کانگریس مالیات کا شعبہ لیگ کے ممبر کو دینے پر تیار ہے۔

لارڈ ویول نے مسٹر جناح کو یہ اطلاح دیدی۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس بارے میں اپنا جواب دوسرے روز دینگے۔ غالباً شروع میں مسٹر جناح کو تامل تھا کہ اس پیش کش کو قبول کریں یا نہ کریں۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کابینہ میں لیگ کے خاص نمائندے لیاقت علی خاں ہوں گے۔ لیکن انھیں شک تھا کہ وہ مالیات کے کام کو مناسب طریقے سے کر بھی سکیں گے۔ محکمہ مالیات کے چودھری محمد علی نے جیسے ہی یہ خبر سنی ویسے ہی انہوں نے مسٹر جناح سے کہا کہ کانگریس کی پیش کش ایک

کی خاطر حکومت کی از سر نو تشکیل کرنی تھی، اور یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کانگریس کے موجودہ اراکین میں سے کوئی علیحدہ ہوجائے۔ مناسب سمجھا گیا کہ سرت چندر بوس، علی ظہیر اور سر شفاعت احمد خاں مستعفی ہوجائیں تاکہ لیگ کے نمائندوں کو جگہ دی جا سکے۔ لارڈ ویول کی تجویز تھی کہ ایک اہم پورٹ فولیو لیگ کے نمائندے کو ملنا چاہئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم داخلی امور کے محکمے کو چھوڑ دیں لیکن سردار پٹیل نے جو اس وقت داخلی امور کے ممبر تھے، اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی۔ میرا خیال تھا کہ امن و امان در اصل صوبائی ذمہ داری ہے اور کیبنٹ مشن پلان میں جو خاکہ بنایا گیا تھا، اس میں مرکز کو امن و امان سے متعلق امور میں برائے نام ہی دخل تھا۔ اس لئے مرکزی وزارت داخلہ کو نئی تنظیم میں کوئی اہم حیثیت حاصل نہیں تھی۔ اس لئے میں لارڈ ویول کی تجویز کو منظور کرلینے کے حق میں تھا لیکن سردار پٹیل اپنی بات پر اڑے رہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم نے اس پر اصرار کیا تو وہ حکومت سے دست بردار ہوجائیں گے مگر اس محکمے کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوں گے۔

تب ہم لوگوں نے دوسرے امکانات پر غور کیا، رفیع احمد قدوائی نے تجویز کیا کہ محکمہ مالیات لیگ کو دیدیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مالیات اہم ترین شعبوں میں سے ہے لیکن اس کے لئے خصوصی علم اور تجربہ درکار ہے اور لیگ کے پاس کوئی ایسا ممبر نہیں تھا جو اس کام کو سنبھال سکے۔ قدوائی

وہ محسوس کرنے لگے کہ لیگ کو محکمہ مالیات دیکر انہوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیا ہے۔ لیاقت علی خان ان کی ہر تجویز کو یا تو نا منظور کر دیتے یا اس میں اتنے ردوبدل کردیتے کہ وہ اصل سے بالکل مختلف ہوجاتی ان کی اس مسلسل مداخلت کی وجہ سے کانگریسی ممبروں کے لئے موثر طریقے سے کام کرنا ناممکن ہو گیا. شعبوں کے درمیان اختلافات ہونے لگے جو دن بدن بڑھتے رہے.

حقیقت یہ ہے کہ انٹرم حکومت نے اُس وقت جنم لیا جب لیگ اور کانگریس کو ایک دوسرے پر ذرا بھی اعتماد اور اعتبار نہ تھا لیگ کے انٹرم حکومت میں شریک ہونے سے پہلے ہی وہ شبہات جو لیگ کو کانگریس کی طرف سے تھے، نئی کونسل کی تشکیل پر اثر انداز ہونے لگے تھے ۱۹۴۶ء میں پہلی بار جب کونسل کی تشکیل ہوئی تو یہ سوال اٹھا تھا کہ محکمہ دفاع کس کے تحت ہو، ہم بیان کر چکے ہیں کہ دفاع کے معاملے میں اختلاف، کریس مشن کی ناکامی کا ایک بڑا سبب تھا کانگریس چاہتی تھی کہ دفاع اس کے کسی معتبر آدمی کے اختیار میں ہو، لیکن لارڈ ویول کا کہنا تھا کہ اس کی وجہ سے مشکلات پیدا ہونگی ان کی خواہش تھی کہ دفاع کے مسئلے کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے . اگر یہ محکمہ کسی کانگریسی کے تحت رہا تو مسلم لیگ کو بے بنیاد الزامات تراشنے کا بہانہ مل جائے گا ساتھ ہی انہوں نے یہ بات بھی واضح کردی کہ اگر لیگ حکومت میں شامل ہوئی تو وہ دفاع کا محکمہ لیگ کے نمائندے کو سونپنے

نعمت غیر متوقع اور لیگ کے لئے بہت بڑی فتح ہے۔ ان کو بالکل امید نہ تھی کہ کانگریس مالیات کا محکمہ لیگ کو سونپنے پر تیار ہو جائے گی مالیات کا محکمہ لیگ کے ہاتھ میں ہوا تو اس کا حکومت کے ہر شعبے میں دخل ہو جائے گا۔ انہوں نے مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ ڈرنے کی قطعی کوئی بات نہیں ہے وہ لیاقت علی خاں کی پوری مدد کریں گے اور اس کے ذمہ‌دار ہونگے کہ لیاقت علی خاں اپنے فرائض موثر طریقے سے انجام دیں چنانچہ مسٹر جناح نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور لیاقت علی خاں مالیات کے ممبر بن گئے جلد ہی کانگریس نے محسوس کر لیا کہ لیگ کو مالیات کا شعبہ دیدینا بہت سخت غلطی تھی۔

ساری دنیا کے ملکوں میں وزیر مالیات کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے ہندوستان میں اسکی اہمیت اور بھی زیادہ تھی کیونکہ برطانوی حکومت وزیر مالیات کو اپنے مفاد کا امین سمجھتی تھی یہ شعبہ ہمیشہ منتخب انگریزوں کے ہاتھ میں رہا جو خاص کر اس کام کے لئے لائے جاتے تھے وزیر مالیات ہر شعبے میں دخل دے سکتا تھا اور اس کی پالیسی طے کرتا تھا لیاقت علی خاں مالیات کے ممبر ہو گئے تو حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی۔ ہر شعبے کی ہر تجویز چھان بین کے لئے ان کے پاس آتی تھی اس کے علاوہ انہیں ہر تجویز کو نامنظور کرنے کا حق تھا ان کے شعبے کی منظوری کے بغیر ایک چپراسی بھی کہیں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

سردار پٹیل امور داخلہ اپنے پاس رکھنے پر مصر تھے۔ اب

یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لیگ کس حد تک کانگریس کے ساتھ عدم تعاون پر تُلی ہوئی تھی۔

آخری نصف اکتوبر میں جواہر لال نے ایک ایسا قدم اٹھایا جو غیر ضروری تھا اور جس سے میں نے اختلاف کیا۔ مگر ان کی طبیعت کچھ ایسی ہے کہ وہ اکثر باتیں جذبات سے متاثر ہو کر کر ڈالتے ہیں۔ عام طور پر وہ دوسروں کی رائے سننے پر آمادہ رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاملے کے ہر پہلو پر غور کئے بغیر وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے وقت اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔

صوبہ سرحد میں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں تھے ۱۹۳۷ء اور ۱۹٤٦ء میں وہاں جو وزارتیں بنیں ان پر کانگریس حاوی تھی۔ یہ خوش آئند صورت حال عبدالغفار خاں اور خدائی خدمت گاروں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سرحد کے ہر معاملے میں ہم عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔

عارضی حکومت کے قائم ہوتے ہی احکام جاری کئے گئے کہ وزیرستان کے قبائیلیوں پر بمباری بند کی جائے۔ اس اثنا میں جواہر لال کو سرکاری اطلاعات مل رہی تھیں کہ صوبہ سرحد کا کافی بڑا طبقہ کانگریس اور خاں بھائیوں کے خلاف ہے۔ مقامی افسر بار بار یہ کہتے تھے کہ کانگریس کی مقبولیت کم ہوگئی ہے اور بہت سے لوگ کانگریس کی جگہ لیگ کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ جواہر لال ان اطلاعات کو غلط اور ان انگریز افسروں

پر رضامند نہ ہوں گے۔ ان کی تجویز تھی کہ دفاع کا ممبر نہ ہندو ہونا چاہئے اور نہ مسلمان۔ سردار بلدیو سنگھ اس وقت پنجاب کے ایک وزیر تھے ہم نے لارڈ ویول کی یہ تجویز مان لی کہ انھیں دفاع کا ممبر بنا دیا جائے۔

اس موقع پر ایک اور چھوٹے سے واقع کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ لیگ کے نمائندوں کے دماغ میں کس قدر شبہات تھے، اِنٹرم حکومت بننے کے بعد یہ طے پایا تھا کہ کابینہ کے رسمی جلسوں سے پہلے سارے ممبروں کا غیر رسمی جلسہ ہوا کرے گا۔ خیال تھا کہ اگر ممبر غیر رسمی طور پر تبادلۂ خیال کرلیا کریں گے تو ایک طرح کی رسم سی پڑ جائے گی کہ وائسرائے کی حیثیت صرف ایک آئینی صدر کی سی ہے۔ یہ جلسے باری باری سے ممبران کونسل کے کمروں میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن اکثر جواہرلال ممبروں کو چائے پر مدعو کیا کرتے تھے۔ عموماً دعوت نامے جواہرلال کا پرائیویٹ سکریٹری بھیجتا تھا مسلم لیگ کے حکومت میں شامل ہونے کے بعد پرائیویٹ سکریٹری نے دعوت نامہ کو دوسرے ممبروں کے ساتھ لیگ کے نمائندوں کو بھی بھیجا۔ لیاقت علی خاں کو اس پر بڑا اعتراض ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں ان کی بڑی توہین ہوئی کہ جواہرلال کے سکریٹری نے انھیں چائے پر بلایا۔ اس کے علاوہ وہ سمجھتے تھے کہ کونسل کے نائب صدر کی حیثیت سے جواہرلال کو اس کا حق نہیں پہنچتا تھا کہ ایسے غیر رسمی جلسے کریں۔ اگرچہ انھوں نے جواہرلال کو یہ حق نہیں دیا لیکن خود لیگ کے نمائندوں کے ایسے ہی جلسے اپنے یہاں کرنے لگے۔

ان کی حامی ہے لیکن انھوں نے اپنے اثر کا اندازہ کرنے میں کچھ مبالغے سے کام لیا تھا یہ بات قدرتی تھی، عموماً لوگ اپنی طاقت کو حقیقت سے زیادہ سمجھتے ہیں غالباً خان بھائی ہم لوگوں پر یہ بھی جتانا چاہتے ہوں گے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اختلافات ہیں مگر صوبہ سرحد مکمل طور پر کانگریس کے ساتھ ہے بہر کیف حقیقت یہ تھی کہ وہاں کا کافی بڑا اور با اثر طبقہ خان بھائیوں کے خلاف تھا ان کے مخالف عناصر کو خان صاحب کی وزارت کے زمانے میں اور بھی طاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا تھا خان صاحب کو پورے صوبے کو اپنا حامی بنانے کا بڑا اچھا موقع ملا تھا لیکن ان کی کچھ غلطیوں کی وجہ سے ان کے مخالفوں کے ہاتھ بہت مضبوط ہوگئے تھے ان میں سے بعض غلطیاں خالص ذاتی اور آداب زندگی سے متعلق تھیں سرحد کا پٹھان بہت خاطِر مشہور ہے وہ اپنی روٹی کے ٹکڑے میں بھی مہمان کو خوشی سے شریک کرتا ہے اور اس کا دسترخوان ہر شخص کے لئے بچھا رہتا ہے وہ دوسروں سے بھی اور خصوصاً ان لوگوں سے جو سوسائٹی میں اعلیٰ حیثیت رکھتے ہیں ایسی ہی تواضع کی توقع کرتا ہے کنجوسی اور اخلاق کی کمی پٹھان کو بہت جلد برگشتہ کردیتی ہے بد قسمتی سے اس معاملے میں خان بھائی اپنے پیروؤں کی توقعات کسی طرح پوری نہ کرسکے

یہ دونوں کھاتے پیتے لوگ تھے لیکن بد قسمتی سے ان میں اخلاق کا مادہ نہیں تھا. ڈاکٹر خان صاحب نے چیف منسٹر بنے

کی اختراع سمجھتے تھے جو کانگریس کے دشمن تھے لارڈ ویول جواہر لال سے متفق نہیں تھے لیکن ساتھ ہی وہ ان اطلاعات کو حرف بہ حرف صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صوبہ سرحد میں دونوں پارٹیوں کی مقبولیت تقریباً برابر برابر ہے لیکن کانگریس یہ سمجھتی تھی کہ صوبہ سرحد کی بہت بڑی اکثریت خان بھائیوں کے ساتھ ہے جواہر لال نے کہا کہ وہ صوبہ سرحد کا دورہ کریںگے اور خود حالات کا جائزہ لیںگے

مجھے جب معلوم ہوا تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ انہیں عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے صوبہ سرحد کی صحیح صورت حال کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، تقریباً ہر صوبے میں فرقہ بندی ہے اور صوبہ سرحد میں بھی خان بھائیوں کے خلاف کوئی جماعت ہوگی حال ہی میں کانگریس نے مرکزی حکومت کی ذمہ داری سنبھالی ہے اور ابھی اس کے قدم ٹھیک سے جمے بھی نہیں ہیں، اس موقعے پر اگر انھوں نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو مخالفوں کو کانگریس کے خلاف تنظیم کا اچھا موقع مل جائے گا۔ چونکہ افسروں کی اکثریت بھی کانگریس کے خلاف ہے اس لئے یہ لوگ اگر عملاً ان عناصر کی مدد نہیں کریںگے تو ان سے ہمدردی ضرور کریںگے، اس لئے مناسب ہے کہ وہ اپنا دورہ آئندہ کسی مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ گاندھی جی کی بھی یہی رائے تھی لیکن جواہر لال اپنے فیصلے پر قائم رہے اور انھوں نے کہا کہ نتیجہ چاہے جو کچھ بھی ہو وہ جائیںگے ضرور

خان بھائیوں کا دعویٰ بھی غلط نہیں تھا کہ سرحد کی اکثریت

وزارت سمجھی جاتی تھی۔ میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ انگریز افسر کانگریس کے خلاف تھے اور انہوں نے لوگوں کو وزارت کے خلاف لوگوں کو کافی اُکسا رکھا تھا۔ چنانچہ جب جواہر لال پیشاور کے ہوائی اڈے پر اترے تو پٹھانوں نے مخالفانہ نعروں اور کالی جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے وزرا جواہر لال کے خیر مقدم کے لئے پولیس کی پناہ میں آئے تھے اور ان کی موجودگی بالکل بے اثر ثابت ہوئی۔ جواہر لال کے باہر نکلتے ہی نعرے بلند کئے گئے اور مجمع میں سے کچھ لوگوں نے جواہر لال کی کار پر حملہ کرنا چاہا۔ ڈاکٹر خان صاحب اتنے پریشان ہوئے کہ انہوں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ صرف اس دھمکی سے ڈر کر لوگوں نے راستہ دے دیا۔ لیکن کار کو پولیس کی پناہ میں جانا پڑا۔

دوسرے ہی روز جواہر لال قبائلی علاقے کے دورے پر روانہ ہوگئے انہوں نے ہر جگہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا مخالف پایا۔ ان کے خلاف جو مظاہرے کئے گئے ان کے ذمہ دار وزیرستان کے َملک تھے۔ بعض مقامات پر تو ان کی کار پر پتھر پھینکے گئے، اور ایک پتھر جواہر لال کی پیشانی پر لگا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے ساتھی اتنے بے بس معلوم ہوتے تھے کہ جواہر لال کو حالات پر قابو پانے کی تدبیریں خود کرنی پڑیں۔ انہوں نے نہ کمزوری دکھائی، نہ خوف بلکہ بڑی جراءت سے کام لیا اور پٹھان ان کی مردانہ ہمت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں سے واپسی پر لارڈ ویول نے ان واقعات پر اظہار افسوس کیا۔ وہ چاہتے تھے

کے بعد بھی شاید ہیں کسی کو کھانا کھلایا ہو۔ اگر اتفاق سے کوئی شخص کھانے یا چائے کے وقت آجاتا تو اس سے بھی اخلاقاً کھانے پینے کے لئے نہ کہا جاتا۔ ان کی طبیعت کا بخل سرکاری روپئے کے خرچ میں بھی ظاہر ہوتا تھا۔ عام انتخابات کے زمانے میں کانگریس نے خرچ کے لئے انہیں کافی بڑی رقم دی لیکن اس میں سے انہوں نے کم سے کم خرچ کیا۔ بہت سے امیدوار صرف اس لئے ہار گئے کہ انہیں وقت سے مالی مدد نہیں ملی۔ بعد کو جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ روپیہ تھا اور بیکار پڑا رہا تو یہ خان بھائیوں کے کٹر دشمن ہوگئے

ایک بار پیشاور سے کچھ لوگ انتخابات کے اخراجات کے سلسلے میں کلکتہ آئے۔ چائے کا وقت تھا اس لئے میں نے چائے اور بسکٹ پیش کئے۔ ان میں سے کچھ لوگ بسکٹوں کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے بسکٹ ہاتھ میں لے کر مجھ سے اس کا نام پوچھا۔ معلوم ہوتا تھا انہیں یہ بسکٹ بہت پسند آئے تھے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ایسے ہی بسکٹ انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کے یہاں بھی دیکھے تھے لیکن وہاں انہیں کبھی یہ بسکٹ یا ایک پیالی چائے تک نہیں پیش کی گئی۔

سنہ ۱۹٤٦ء میں واقعی صورت حال یہ تھی کہ خان بھائیوں کو سرحد کے اتنے لوگوں کی حمایت حاصل نہیں تھی جتنی کہ دلی میں ہم سب سمجھتے تھے۔ جواہر لال جب پیشاور پہنچے تو ان پر یہ حقیقت بہت ناخوشگوار طریقے سے ظاہر ہوئی۔ اس وقت ڈاکٹر خان صاحب چیف منسٹر تھے اور صوبے کی وزارت کانگریسی

رکھنے کی تجویز کے خلاف ورکنگ کمیٹی میں ایک میمورینڈم پیش کیا کمیٹی میں ہم لوگوں کا خیال تھا کہ اب اس مسئلے کو نہیں اٹھانا چاہیے اپنے آسام کے ساتھیوں کے اعتراض کو ایک حد تک دور کرنے کے لئے، مگر بیشتر اصول کی بنا پر، ہم نے مجلس دستور ساز کے انتخابات میں یوروپین ممبروں کی شرکت کا سوال اٹھایا۔ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ اگر مجلس دستور ساز کے انتخابات میں بنگال اور آسام کی اسمبلیوں کے یوروپین ممبر امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے یا انہوں نے انتخاب میں حصہ لیا تو شاید کانگریس اس پورے پلان ہی کو نامنظور کردے۔ یہ اعتراض اس طرح ختم ہوا کہ یوروپین ممبروں نے خود اعلان کیا کہ وہ اپنی نمائندگی نہیں چاہیں گے مگر اس اثنا میں گاندھی جی کے خیالات بدل گئے تھے اور اب وہ باردولی کی پوری حمایت کرنے لگے تھے جواہر لال مجھ سے متفق تھے کہ آسام کے لیڈروں کے شبہات بے جا ہیں اور انہوں نے ان لیڈروں کو سمجھانے کی اپنے بس بھر کوشش بھی کی بدقسمتی سے یہ لوگ نہ میری بات سننے پر راضی تھے اور نہ جواہر لال کی۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ گاندھی جی ان کے ساتھ تھے اور ان کی حمایت میں بیانات جاری کررہے تھے۔ بہرحال جواہر لال ثابت قدم رہے اور میری حمایت کرتے رہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ کیبنٹ مشن کے پلان کو لیگ کے نامنظور کردینے کی وجہ سے ہم بہت متفکر تھے۔ لیگ کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی نے جو قدم اٹھایا اس کا بھی ذکر

کہ افسروں کے رویئے کے بارے میں باقاعدہ تحقیقات کی جائے.
جواہر لال اس پر راضی نہیں ہوئے کہ ان افسروں کے خلاف
کوئی کارروائی کی جائے. لارڈ ویول اس سے بہت متاثر ہوئے اور
مجھے بھی جواہر لال کی فراخ دلی بہت پسند آئی

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے شروع میں کیبنٹ مشن کے
پلان کو منظور کیا تھا. جس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس دستور ساز
کی تجویز بھی انہیں منظور ہے کانگریس اب بھی اس پلان کے
حق میں تھی اس کی طرف سے صرف ایک اعتراض آسام کے
کچھ لیڈروں نے گروپ « سی » کی تشکیل کے بارے میں کیا
تھا ان کے ذہن پر یہ جانے کیوں بنگال کا خوف طاری تھا.
ان کا کہنا تھا کہ اگر بنگال اور آسام کو ایک گروپ میں رکھا
گیا تو اس پورے علاقے پر مسلمانوں کا تسلط ہوجائے گا آسام
کے لیڈروں نے یہ اعتراض کیبنٹ مشن پلان کا اعلان ہوتے ہی
کیا تھا شروع میں گاندھی جی نے کیبنٹ مشن کے پلان کو منظور
کرلیا تھا اور یہ کہا تھا کہ یہ پلان اس بدقسمت خطۂ زمین کو
مصائب اور آلام سے نجات دلانے کے امکانات رکھتا ہے.
انہوں نے یہ ہریجن میں لکھا تھا کہ « کیبنٹ مشن کے اعلان
پر چار روز تک غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ
موجودہ حالات میں برطانوی حکومت اس سے بہتر تجویز تیار
نہیں کرسکتی تھی »

آسام کے چیف منسٹر گوپی ناتھ باردولی پلان کی مخالفت پر
قائم رہے اور انہوں نے آسام اور بنگال کو ایک گروپ میں

کو منظور کرنے پر آمادہ نہیں تھی در حقیقت جواہر لال نے لارڈ ویول سے کہہ بھی دیا کہ مزید گفتگو کے لئے لندن جانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا. تقریباً سارے ہی مسائل پر بار بار گفتگو ہوچکی ہے اور اب ان کو پھر اٹھانے سے فائدے کے بجائے نقصان پہنچے گا.

لارڈ ویول جواہر لال سے متفق نہیں تھے اور انہوں نے مجھ سے اور تفصیلی گفتگو کی انہوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ کا موجودہ رویہ قائم رہا تو اس کا اثر صرف انتظامی امور ہی پر نہیں پڑے گا بلکہ ہندوستان کے مسائل کا پُر امن حل روز بروز مشکل ہوتا جائے گا. لندن میں گفتگو سے ایک یہ فائدہ بھی ہوگا کہ وہاں لیڈروں کو حقیقتوں کو سامنے رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ملے گا. نہ ان پر مقامی دباؤ پڑے گا اور نہ ان کے حامی بیچ بیچ میں دخل دے سکیں گے. لارڈ ویول نے یہ بھی کہا مسٹر ایٹلی ہندوستان کے دوست ہیں اور گفتگو میں ان کی شرکت مفید ہوسکتی ہے.

میں لارڈ ویول کی دلیلوں سے متاثر ہوا اور میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنا نظریہ بدلنے پر آمادہ کرلیا. تب یہ طے پایا کہ جواہر لال کانگریس کی نمائندگی کریں. مسٹر جناح اور لیاقت علی لیگ کے نمائندے تھے اور سردار بلدیو سنگھ سکھوں کے نمائندے بن کر گئے. ۳ دسمبر سے ٦ دسمبر تک گفتگو ہوتی رہی لیکن اس سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا.

بڑے اختلافات اُن شقوں کی تشریح کے بارے میں تھے جو

آچکا ہے ۔ ۱۰ اگست کی قرار داد میں ہم نے واضح کردیا تھا کہ اگرچہ اس پلان کی بعض تجاویز سے ہم مطمئن نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں پوری اسکیم منظور ہے ۔ مسٹر جناح کے لئے یہ بھی کافی نہیں تھا ۔ دلائل کے علاوہ ، جن کا ذکر آچکا ہے ، ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ورکنگ کمیٹی نے صاف الفاظ میں اس بات کو نہیں تسلیم کیا ہے کہ صوبے اسی گروپ میں شامل ہوں گے جس میں شامل ہونا پلان میں مد نظر تھا ۔ برطانوی حکومت اور لارڈ ویول دونوں اس معاملے میں لیگ کے ہم خیال تھے

میں برابر کوشش کرتا رہا کہ تبادلہ خیالات کے ذریعے جتنے اختلافات مٹائے جاسکیں مٹائے جائیں ۔ لارڈ ویول نے اس سلسلے میں میری پوری مدد کی اسی وجہ سے وہ مسلم لیگ کو اِنٹرم حکومت میں شریک کرنا چاہتے تھے ۔ انہوں نے میرے اعلان کو بہت پسند کیا ۔ انہیں دل سے اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کے مسائل کا کیبنٹ مشن کے پلان سے بہتر حل ناممکن ہے ۔ وہ مجھے بار بار کہتے تھے کہ مسلم لیگ کے زاویۂ نگاہ سے بھی اس سے بہتر حل ناممکن ہے ۔ چونکہ کیبنٹ مشن کا پلان زیادہ تر میرے ۱۵ اپریل کے بیان پر مبنی تھا اس لئے ظاہر ہے میں نے ان سے اتفاق کیا ۔

مسٹر ایٹلی ہندوستان کی سیاسی سرگذشت میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے ۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ ء کو انہوں نے لارڈ ویول اور کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کو لندن بلایا تاکہ گتھی کو سلجھانے کی ایک اور کوشش کی جائے ، شروع میں تو کانگریس اس دعوت

۶ دسمبر کو کیبنٹ مشن نے ایک اور بیان جاری کیا جس میں گروپ بندی سے متعلق لیگ کے نظریئے کو صحیح ٹھہرایا، لیکن اس سے لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلاف کم نہیں ہوا۔

۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز کی پہلی نشست ہوئی۔ سوال اٹھا کہ مجلس کا صدر کون ہو۔ جواہر لال اور پٹیل چاہتے تھے کہ کسی ایسے آدمی کو صدر بنایا جائے جو وزارت میں نہ ہو۔ ان دونوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں اس عہدے کو قبول کر لوں لیکن میں اس پر راضی نہیں تھا۔ اور کئی نام تجویز ہوئے لیکن کسی پر اتفاق رائے نہ ہوسکا آخرکار ڈاکٹر راجندر پرشاد کو منتخب کیا گیا اگرچہ یہ حکومت کے رکن تھے یہ بہت مناسب انتخاب ثابت ہوا کہ کیونکہ انہوں نے بہت امتیاز کے ساتھ اپنے فرائض انجام دئے اور کئی نازک معاملوں میں بہت قیمتی مشورے دئے

میں ذکر کر چکا ہوں کہ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء میں جب انٹرم حکومت بنی تو گاندھی جی اور میرے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ میں اس میں شریک ہو جاؤں۔ لیکن میرا خیال تھا کہ کانگریس کے لیڈروں میں سے کم از کم ایک پرانے آدمی کو حکومت سے باہر رہنا چاہئے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح میں منصفانہ طریقے سے حالات کا جائزہ لے سکوں گا۔ چنانچہ میں نے آصف علی کو وزارت میں شامل کردیا۔ انٹرم حکومت میں لیگ کی شرکت کے بعد نئی مشکیلات پیدا ہوگئیں اور اب میری شمولیت کا سوال پھر اُٹھا۔

پلان کی مجوزہ گروپ بندی سے متعلق تھیں مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ مجلس دستور ساز کو پلان کے ڈھانچے میں کسی قسم کی تبدیلی کا حق نہیں ہے۔ گروپ بندی پلان کا لازمی حصہ ہے اور اس میں اگر کسی قسم کی تبدیلی ہوئی تو معاہدے کی بنیاد ہی بدل جاتی ہے۔ منصوبے میں اس کی رعایت رکھی گئی تھی کہ جب گروپ ملک کا دستور بنا لیں گے تو کسی بھی صوبے کو اختیار ہوگا کہ اس سے الگ ہوجائے۔ مسٹر جناح کے خیال میں ان صوبوں کے لئے جو اپنے گروپ سے الگ ہونا چاہتے تھے، تحفظ کافی تھا لیکن آسام کے کانگریسی لیڈروں کا یہ نظریہ تھا کہ اگر کوئی صوبہ چاہے تو شروع ہی سے اپنے مجوزہ گروپ سے الگ رہ سکتا ہے بہ الفاظ دیگر مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ پہلے صوبوں کو اپنے اپنے گروپ میں شامل ہونا چاہیے اور بعد میں اگر ان کی خواہش ہو تو وہ الگ ہوسکتے ہیں۔ اس کے برعکس آسام کے لیڈروں کا کہنا تھا کہ صوبے شروع میں الگ رہ سکتے ہیں اور بعد میں اگر وہ چاہیں تو گروپ میں شامل ہوسکیں گے۔ کیبنٹ مشن اس مسئلے میں لیگ کی تشریح کو درست مانتا تھا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ انہوں نے مرکز، صوبوں اور گروپوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی بنیاد پر ہی لیگ کو یہ پلان منظور کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ آسام کے لیڈر اس سے متفق نہیں تھے۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد گاندھی جی بھی اس تشریح کی تائید کرنے لگے جو ان لیڈروں نے کی تھی۔ مجھے اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسٹر جناح کے دعوے میں خاصی صحت تھی۔

ہر کارروائی کی بیخ کنی کر سکتے تھے۔ وزیر مالیات کے اختیارات کی وسعت کو انتہا تک پہنچا دیا گیا تھا اور ہم کو ایک نیا صدمہ اس وقت پہنچا جب لیاقت علی نے اگلے سال کا بجٹ پیش کیا۔

یہ علانیہ کانگریس کی پالیسی تھی کہ معاشی اونچ نیچ کو ختم کیا جائے اور رفتہ رفتہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ ایک سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے۔ کانگریس کے الکشن مینی فیسٹو میں بھی یہی کہا گیا تھا۔ دوران جنگ میں مختلف قسم کے سرمایہ داروں نے جو منافع کمایا تھا اُس کے بارے میں جواہر لال نے اور میں نے بیانات بھی جاری کئے تھے۔ یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ اس رقم کا بہت بڑا حصہ چھپا دیا گیا ہے اور اُس پر انکم ٹیکس نہیں ادا کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت اس بڑی رقم سے محروم ہو گئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ حکومت ہند کو ان ٹیکسوں کو وصول کرنے کے لئے، جو واجب تھے مگر ادا نہیں کئے گئے تھے، سخت کارروائی کرنی چاہئے

لیاقت علی خاں نے ایک ایسا بجٹ مرتب کیا جو بظاہر کانگریس کے اعلانات کے مطابق تھا، لیکن در اصل اُس کا مقصد کانگریس کو بدنام کرنا تھا، اس طرح کہ کانگریس کے مطالبات بالکل ناقابل عمل صورت میں پیش کئے گئے۔ ان کی ٹیکس کی تجاویز نے ملک کے دولت مند طبقے کو مفلس بنا کر، صنعت و حرفت کو ایک مستقل نقصان پہنچایا ہوتا ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو غیر ادا شدہ ٹیکسوں کے بارے میں تحقیقات اور ان کی وصولی کا انتظام کرے۔

گاندھی جی اب پہلے سے بھی زیادہ مُصر تھے۔ انہوں نے کہا میرا ذاتی نظریہ جو بھی ہو، ملک کے مفاد کی خاطر وزارت میں شامل ہونا میرا فرض ہے۔ اُنہوں یہ بھی کہا کہ میرے وزارت میں نہ ہونے سے نقصان پہنچ رہا تھا۔ جواہر لال کا بھی یہی خیال تھا۔

گاندھی جی کی رائے تھی کہ محکمۂ تعلیم میرے لئے نہایت موزوں رہے گا اور ملک کا اصل مفاد بھی اسی میں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ آزاد ہندوستان کا یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ مستقبل میں تعلیم کا نظام کیا ہو۔ چنانچہ ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کو میں نے محکمہ تعلیم کی ذمہ داری سنبھال لی اس وقت تک تعلیم کے ممبر راج گوپال آچاری تھے۔

میں نے تعلیم کے میدان میں جس پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا وہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہوگا۔ ان مسائل پر میرے خیالات یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کئے جا چکے ہیں، اس لئے میں یہاں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا، بلکہ صرف ملک کے تمام سیاسی حالات سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو لیگ اور کانگریس میں نا اتفاقی کی وجہ سے روز بروز نازک تر اور مشکل تر ہوتے جارہے تھے۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ لیگ کے ممبروں کی وجہ سے اگزیکیوٹیو کونسل میں ہمارے لئے قدم قدم پر کتنی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ لوگ حکومت بھی کر رہے تھے۔ اور حکومت کے مخالف بھی تھے اور واقعی صورت کچھ ایسی تھی کہ وہ ہماری

طبقے کو نقصان پہنچے کیونکہ اس کی اکثریت ہندو تھی. راجہ جی نے کابینہ میں علانیہ اس کی مخالفت کی اور یہ بھی اشارتاً کہا کہ اس میں فرقہ واریت کی بو آتی ہے. میں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ تجاویز کانگریس کی اعلان کردہ پالیسی کے مطابق ہیں اس لئے ہم ان کے اصول پر اعتراض نہیں کر سکتے. ہمیں چاہئے کہ ہم ان تجاویز کو الگ الگ جانچیں اور ان میں سے جو ہمارے اصول کے مطابق ہوں ان کی حمایت کریں.

صورت حال بہت نازک تھی. مسلم لیگ نے پہلے کیبنٹ مشن پلان کو منظور اور پھر نامنظور کیا تھا. مجلس دستور ساز کے اجلاس ہو رہے تھے لیکن لیگ نے اس کا بائیکاٹ کردیا تھا، اگرچہ سارا ملک آزادی کے مطالبے پر متفق اور متحد تھا. ایک طرف لوگ آزادی حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے دوسری طرف فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی حل نہیں نظر آرہا تھا اس کا واحد حل کیبنٹ مشن پلان تھا مگر اس کے باوجود ہم ایک دفعہ بات طے کر کے اپنے اختلافات دور نہیں کر پاتے تھے.

برطانیہ کی لیبر حکومت اس شش و پنج میں تھی کہ اسے موجودہ حالات کو قائم رہنے دینا چاہئے یا خود اپنی ذمہ داری پر کوئی قدم اٹھانا چاہئے. مسٹر ایٹلی کا خیال تھا کہ معاملات ایسی منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اب تعطل بہت نقصان دہ ہوگا اور اس لئے ضروری ہے کہ کوئی صاف اور قطعی فیصلہ کر لیا جائے. چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ برطانوی حکومت کے اقتدار سے دست بردار ہونے کی ایک تاریخ مقرر کردی جائے. لارڈ ویول

یہ تو ہم سب چاہتے تھے کہ دولت کی تقسیم میں زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جائے ، اور ان لوگوں سے محاسبہ کیا جائے. جنھوں نے ٹیکس نہیں ادا کئے تھے اس لئے ہم لوگ اصولی طور پر لیاقت علی کے بجٹ کے خلاف نہیں تھے کابینہ کے جلسے میں اس سوال کو اٹھاتے ہوئے -لیاقت علی خاں نے کہا کہ ان کی تجاویز کانگریس کے ذمہ دار لیڈروں کے بیانات پر مبنی ہیں. انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اگر جواہرلال نے بیانات نہ دئے ہوتے تو ان کا ذہن اس طرف جاتا بھی نہیں اس موقعے پر انھوں نے بجٹ کی تفصیلات نہیں بتائیں. جہاں تک عام امور کا تعلق تھا ہم نے ان سے اتفاق ظاہر کیا. اس طرح کابینہ کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے بجٹ ایسی تجاویز کی بنا پر مرتب کرنا شروع کیا جس میں صرف انتہا پسندی ہی نہیں تھی بلکہ قوم کے معاشی نظام کو نقصان پہنچانے کی نیت بھی تھی.

لیاقت علی خاں کی تجاویز سن کر ہمارے کچھ ساتھی حیران رہ گئے. کچھ ایسے تھے جو خفیہ طریقے سے سرمایہ داروں سے ہمدردی رکھتے تھے کچھ ایسے تھے جو ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے کہ لیاقت علی کے بجٹ میں معاشی مسائل نہیں بلکہ سیاسی مقاصد مدنظر ہیں. سردار پٹیل اور راجہ گوپال آچاری تو اس کے بہت ہی شدید مخالف تھے ، کیونکہ ان کے خیال میں لیاقت علی ملک کو فائدہ پہنچانے سے زیادہ سرمایہ داروں اور کاروباری لوگوں کو ستانے کے درپے تھے ، اور ان کی نیت دراصل یہ تھی کہ کاروباری

مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال اس موقع پر جب مولانا نے سنٹرل
انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن دہلی کا سنگ بنیاد رکھا۔

مولانا آزاد پالم کے ہوائی اڈے پر، انگلستان اور دوسرے یوروپی
ممالک کے دورے سے واپسی کے وقت

کو ایسی کسی تاریخ کا اعلان کرنے کی رائے سے اتفاق نہیں
تھا ان کی خواہش تھی کہ کیبنٹ مشن کے پلان پر قائم رہا
جائے کیونکہ وہ صرف اسی کو ہندوستان کے مسائل کا ممکن حل
تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ برطانوی حکومت اپنا
فرض نہیں ادا کرے گی، اگر اس نے فرقہ وارانہ مسائل کے حل
ہونے سے پہلے سیاسی اختیارات منتقل کر دئے۔ ہندوستان میں
جذبات اس حد تک مشتعل ہو چکے تھے کہ ذمہ دار لوگ بھی
ان کی رو میں بہ گئے تھے۔ ایسی فضا میں برطانیہ کی دست برداری
کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے ملک میں بلوے اور فسادات بڑے
پیمانے پر شروع ہو جائیں گے اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ
موجودہ صورت حال برقرار رکھی جائے اور دونوں بڑی پارٹیوں
کے درمیان مفاہمت کی ہر طرح سے کوشش جاری رکھی جائے،
ان کو یقین راسخ تھا کہ اگر انگریز کانگریس اور لیگ میں
مفاہمت کرائے بغیر ہندوستان سے رخصت ہو گئے۔ تو یہ
ہندوستان کے لئے خطرناک اور خود ان کی شان کے خلاف ہوگا۔

مسٹر ایٹلی اس سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر
ایک بار تاریخ مقرر ہو جائے گی تو ذمہ داری ہندوستانیوں کے ہاتھ
میں منتقل ہو جائے گی اور جب تک یہ نہیں کیا جائے گا یہ مسئلہ
کبھی حل نہ ہو سکے گا مسٹر ایٹلی کو اس کا بھی ڈر تھا کہ
موجودہ صورت حال کے برقرار رہنے سے ہندوستانیوں کو برطانیہ
پر اعتبار نہ رہے گا۔ ہندوستان کے حالات ایسے تھے کہ برطانوی
اقتدار خاصی کوشش کے بغیر قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اور

اس کے لئے برطانوی قوم تیار نہیں تھی۔ اب یا تو انگریز سختی کے ساتھ حکومت کرکے ہنگاموں کو دبا سکتے تھے یا پھر اقتدار ہندوستانیوں کو سونپ سکتے تھے ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت برقرار رکھی جا سکتی تھی لیکن اس کے لئے جس اہتمام کی ضرورت تھی اس سے برطانیہ کے تعمیری منصوبوں میں خلل پڑتا، اس لئے چارہ صرف یہ تھا کہ ایک تاریخ مقرر کردی جائے اور پوری پوری ذمہ داری ہندوستانیوں کے کندھوں پر ڈال دی جائے۔

لارڈ ویول اس سے قائل نہیں ہوئے۔ وہ برابر یہ کہتے رہے کہ اگر فرقہ وارانہ مسائل کی وجہ سے تشدد ہوا تو آنے والی نسلیں برطانیہ کو کبھی معاف نہ کریںگی۔ انگریز سو برسوں سے زیادہ سے ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے اور اب اگر ان کے ہٹنے کی وجہ سے کسی قسم کی پیچیدگی، تشدد یا گڑبڑ ہوئی تو اس میں انہیں کا قصور ہوگا۔ لارڈ ویول جب مسٹر ایٹلی کو نہ قائل کرسکے تو انہوں نے اپنا استعفےٰ پیش کردیا

اب دس سال بعد جب میں ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو بھی یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ کس کا خیال درست تھا معاملات اس قدر پیچیدہ تھے اور حالت اتنی نازک تھی کہ کوئی قطعی رائے دینا مشکل ہے۔ مسٹر ایٹلی کے فیصلے کا محرک یہ عزم تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہونے میں مدد کرنی ہے کوئی شخص جس کی ذہنیت ذرا بھی امپیریلسٹ ہوتی وہ ہندوستان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا تھا واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی نااتفاقی سے برطانوی حکومت نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا اور یہی ہندوستان کے

مولانا آزاد، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں، بمبئی جولائی ۱۹۴۶ء

راج کماری امرت کور لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن، آنریبل پمیلا ماؤنٹ بیٹن، مولانا آزاد اور چینی سفیر ڈاکٹر لوچیالوئین، مہاتما گاندھی کی آخری رسم کے موقع پر

تحویز پر عمل کیا گیا ہوتا اور ہندوستان کے مسئلے کا حل
دو سال کے لئے اٹھا رکھا گیا ہوتا تو ممکن ہے کہ مسلم لیگ
مخالفت سے عاجز آکر مصالحت کر لیتی اگر مسلم لیگ تعمیری
طریقہ کار اختیار نہ کرتی تو غالباً خود مسلمان عوام اس کے تخریبی
رویئے سے دل برداشتہ ہو کر اسے رد کر دیتے ہو سکتا
ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا دل فگار حادثہ پیش نہ آتا. ظاہر
ہے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے، لیکن قوموں کی زندگی میں
ایک دو برس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی. غالباً آنے والی نسلیں
یہ کہیں گی کہ لارڈ ویول کی پالیسی پر عمل کرنا زیادہ
صحیح ہوتا.

جب یہ معلوم ہوا کہ لارڈ ویول مستعفی ہو رہے ہیں تو میں
نے ایک بیان شائع کیا جس سے معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ان کے
بارے میں میری رائے کیا تھی میں جانتا تھا کہ جواہر لال اور
میرے دوسرے ساتھی اس بارے میں مجھ سے متفق نہیں ہیں. وہ
لارڈ ویول کو پسند نہیں کرتے تھے. لیکن میں نے یہ اپنا فرض سمجھا
کہ لارڈ ویول کے کام کے بارے میں اپنی رائے عوام کے سامنے
رکھ دوں میں نے اس بیان میں کہا تھا

«ہندوستان کے بارے میں مسٹر ائیلی کے بیان نے میرے دل
میں ملے جلے احساسات پیدا کئے ہیں ایک طرف تو مجھے خوشی
ہے کہ میں نے جون سنہ ۱۹۴۵ء میں حالات کا جو اندازہ کیا
تھا، اُسے واقعات نے صحیح ثابت کیا ہے ساتھ ہی مجھے افسوس
ہے کہ لارڈ ویول جنہوں نے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان

مطالبہ آزادی کے خلاف سب سے زبردست حربہ تھا۔ مسٹر ایٹلی عہد کر چکے تھے کہ لیبر حکومت کوئی بھی ایسی بات نہیں کرے گی جس سے اس پر الزام عائد ہوسکے۔

ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر ان کی نیت صاف نہ ہوتی اور انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھانا چاہا ہوتا تو وہ اٹھا سکتے تھے اور ہماری مخالفت کے باوجود دس سال تک اور حکومت کر سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہنگامے اور تصادم ہوتے رہتے کیونکہ ہندوستانیوں کے جذبات اس حد تک برانگیختہ ہو چکے تھے کہ برطانیہ کا قدم قدم پر مقابلہ کیا جاتا تاہم اگر انگریز چاہتے تو ہمارے اختلافات کی آڑ لیکر ابھی چند سال حکومت کر سکتے تھے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ فرانس برطانیہ سے کمزور ہوتے ہوئے بھی دس سال تک انڈو چائنا پر حکومت کرتا رہا۔ اس لئے ہمیں لیبر حکومت کی نیک نیتی کو تسلیم کرنا چاہئے کیونکہ اس نے ہماری کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہا۔ تاریخ میں اس کے اس فیصلے پر اس کی عزت کی جائیگی اور ہمیں بھی کسی قسم کے تحفظات ذہنی کے بغیر اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔

دوسری طرف یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ لارڈ ویول غلطی پر تھے۔ انہیں مستقبل میں جو خطرات نظر آرہے تھے وہ حقیقی تھے بعد کے واقعات سے ان کی رائے صحیح ثابت ہوئی۔ بہر حال یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شکل ہندوستان کے لئے بہتر تھی جو لارڈ ویول نے تجویز کی تھی یا وہ جو مسٹر ایٹلی نے اختیار کی۔ اگر لارڈ ویول کی

رکھنے کے لئے اپنے پورے اثر سے کام لیا اور آج مجھے اطمینان ہے کہ حالات کا جو تجزیہ میں نے کیا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ شملہ کانفرنس ناکام رہی لیکن اس کے بعد جلد ہی انگلستان میں عام انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی برسراقتدار آئی اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے بارے میں اس نے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ اُس پر عمل کرے گی بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا اعلان خلوص نیت پر مبنی تھا

مجھے نہیں معلوم کہ پچھلے تین ہفتوں میں لارڈ ویول اور حکومت برطانیہ کے درمیان کیا گفت وشنید ہوئی ہے لیکن ظاہر ہے ایسے اختلاف ہوئے ہوں گے جن کی وجہ سے لارڈ ویول کو استعفا دینا پڑا۔ صورت حال کے بارے میں اُن کی جو رائے ہے ہم اُس سے اختلاف کرسکتے ہیں لیکن اُن کے خلوص اور اُن کی ایمانداری پر شبہ نہیں کیا جاسکتا میں یہ بھی نہیں بھول سکتا ہوں کہ آج ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی بدلی ہوئی فضا در اصل اس دلیرانہ قدم کی وجہ سے پیدا ہوئی جو لارڈ ویول نے جون سنہ ۱۹۴۵ء میں اٹھایا تھا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد چرچل کی حکومت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اختتام جنگ تک کے لئے ہندوستان کے مسئلے کو بالائے طاق رکھدیا جائے گا۔ خود ہندوستانیوں کو کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی اور سنہ ۱۹۴۲ء کے واقعات نے تلخی اور بھی بڑھا دی تھی۔ اس بند دروازے کو کھولنے کا سہرا بھی لارڈ ویول ہی کے سر ہے برطانوی وزارت نے اگرچہ شروع میں اس بات کی مخالفت کی تھی تاہم لارڈ ویول

تعلقـات کا ایک نیا باب کھولا، وہ اب میدان سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔

«شملہ کانفرنس کے وقت برطانیہ کی نیت کے بارے میں ہر طرف شبہے اور عدم اعتماد ظاہر کیا جا رہا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں بھی بدظن تھا اور پچھلے تین برسوں کے واقعات کی تلخی کا اثر میرے دل میں باقی تھا اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ میں شملہ کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا۔ لیکن لارڈ ویول سے ملنے کے بعد میرے خیالات اچانک بدل گئے میں نے انہیں ایک اَن گھڑ اور بے ریا سپاہی پایا جو بات کو طول دینا نہیں جانتا تھا اور انداز و گفتار میں سیدھا تھا لارڈ ویول میں سیاست دانوں کی پُرکاری نہیں تھی وہ فوراً معاملے پر آجاتے تھے اور اُن کا انداز اتنا بےلاگ تھا کہ دل پر ان کے خلوص کا نقش بیٹھ جاتا تھا چنانچہ میں نے ملک کو یہ مشورہ دینا اپنا فرض سمجھا کہ اپنے سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تعمیر پسندانہ رویہ اختیار کرنا چاہئے اس وقت سے آج تک شبہات اور اختلافات کی فضا کے باوجود میں اُس راہ سے نہیں ہٹا ہوں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شملہ کانفرنس کے بعد سے کم از کم چار بار خارجی اور اندرونی دباؤ ڈال کر یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کوئی سیـاسی تحریک شروع کرنے پر مجبور ہو جائے اور عملی احتجاج کا طریقہ اختیار کرے۔ لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ برطانوی حکومت کے مصالحتی رویئے کے پیش نظریہ راستہ غلط ہوگا۔

«میں نے کانگریس کو استقلال کے ساتھ ایک راہ پر چلتے

کہ اس مسئلے پر میرا استعفا دینا صحیح تھا یا نہیں بہرحال میری آپ سے درخواست ہے کہ عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو تعاون کیا ہے اس کا میں شکرگزار ہوں »

یہ کہہ کر لارڈ ویول نے اپنے کاغذات سنبھالے اور اُٹھ کر چلے گئے۔ ہمیں جواب میں کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ دوسرے ہی روز وہ دلی سے روانہ ہوگئے۔

نے اسے ہندوستان کے سامنے ایک نئی پیش کش رکھنے پر آمادہ کر لیا اس کا نتیجہ شملہ کانفرنس تھی یہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے آج تک جو کچھ ہوا وہ اسی دلیرانہ اقدام کا منطقی نتیجہ ہے

« مجھے یقین ہے کہ ہندوستان لارڈ ویول کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہ کرے گا. اور جب اس کا وقت آئے گا کہ آزاد ہندوستان کا مورخ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کا جائزہ لے گا تو وہ لارڈ ویول کو اس بنا پر تعریف کا مستحق سمجھے گا کہ انہوں نے ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات میں ایک نیا باب کھولا. »

اس شام کو لارڈ ویول سے رخصت ہونے کے لئے اکزیکیوٹیو کونسل کے ممبروں کی کھانے پر دعوت تھی کہ یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے اُس بیان کا لارڈ ویول پر بہت اثر ہوا ہے انہوں نے ایک دوست سے کہا « مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان میں کم از کم ایک ایسا آدمی تو ہے جس نے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے. »

روانگی سے ایک روز پہلے انہوں نے کابینہ کے جلسے کی آخری مرتبہ صدارت کی. کارروائی ختم ہونے پر انہوں نے ایک مختصر سا بیان دیا جس سے میں بہت متاثر ہوا لارڈ ویول نے کہا «میں ایک بہت ہی مشکل وقت میں وائسرائے بنا میں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی اِمکانی کوشش کی. اب ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ مجھے مستعفی ہونا پڑا ہے تاریخ بتلائے گی

مسئلے کو حل کرنے کی آخری فیصلہ کن کوشش ہونی چاہیے۔ انہیں اس معاملے میں مجھ سے پورا اتفاق تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافی مسائل کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے کیبنٹ مشن کے پلان میں آسام اور بنگال ایک گروپ میں رکھے گئے تھے۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ کسی صوبے کو بھی کسی گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے اور ہر صوبہ ووٹ کے ذریعے یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ کسی گروپ میں شامل ہوگا یا نہیں۔ لیگ کا کہنا تھا کہ اس نے کیبنٹ مشن کے پلان کو اس بنا پر تسلیم کیا ہے کہ گروپ بحیثیت مجموعی ووٹ دے گا اور کوئی صوبہ گروپ کا دستور بن جانے کے بعد ہی اس سے الگ ہوسکتا ہے۔ لیگ کا یہ بھی کہنا تھا کہ پلان کی تجاویز میں کسی قسم کی تبدیلی سے پورا معاہدہ منسوخ ہوجائے گا اور اس کی رائے میں کانگریس کے عمل نے واقعی معاہدے کو منسوخ کردیا ہے۔ اس بنا پر لیگ نے کیبنٹ مشن کے پلان کو نامنظور کردیا تھا۔

یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ لیگ نے آسام کے مسئلے پر اتنا زور کیوں دیا جب کہ آسام مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ بھی نہیں تھا خود لیگ کے نظریئے کے مطابق آسام کو بنگال کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بہرحال وجہ جو بھی رہی ہو، قاعدے کے لحاظ سے مسلم لیگ حق بجانب تھی اگرچہ اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے اس کا دعویٰ کمزور تھا۔ میں نے کئی موقعوں پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا۔ میرا خیال تھا کہ کانگریس اور لیگ

ماؤنٹ بیٹن مشن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلے پہل دوراں جنگ میں شہرت حاصل ہوئی. وہ کچھ مہینے ہندوستان میں رہے پھر ان کا ہڈ کوارٹر سیلون منتقل ہوگیا جنگ کے ختم ہونے پر وہ برطانیہ لوٹ گئے لیکن لارڈ ویول کے مستعفی ہونے کے بعد انہیں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا ہندوستان آنے سے قبل لیبر وزارت نے انہیں تمام مسائل میں اپنی رائے اور خواہش سے مطلع کیا اور مسٹر ایٹلی نے انہیں ہدایت دی کہ ۳۰ جون سنہ ۱۹۴۸ ء سے پہلے اقتدار منتقل ہوجائے

۲۲ مارچ کو وہ دلی پہنچے اور ۲۴ مارچ کو انہوں نے وائسرائے اور گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا حلف اٹھانے کے بعد انہوں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں انہوں نے اس ضرورت پر زور دیا کہ اگلے چند مہینوں کے اندر مسائل کا کوئی حل نکالا جائے

اس کے بعد جلد ہی میں پہلی بار ان سے ملا. پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ برطانوی حکومت اقتدار منتقل کرنے کا قطعی ارادہ کرچکی تھی. لیکن اس سے قبل فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی حل نکالنا ضروری ہے ، اور ان کی خواہش ہے کہ اس

تھے۔ یہ لوگ اعلانیہ کہتے تھے کہ اب انتظامی امور کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں اس کی وجہ سے لوگوں میں اور بھی بے چینی اور بے اطمینانی پھیل رہی تھی اور لوگوں کو حکومت پر اعتماد نہیں رہا تھا

اکزیکیوٹیو کونسل میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان عدم تعاون کی وجہ سے حالات اور بھی خراب ہو رہے تھے مرکزی حکومت کے ارکان ہر وقت ایک دوسرے کو اس طرح زک دینے کی فکر میں رہتے تھے کہ حکومت بالکل مفلوج ہوگئی تھی۔ لیگ کے پاس مالیات کا محکمہ تھا جس پر حکومت کی بنیاد ہوتی ہے یاد رہے کہ اس کی تمام تر ذمہ داری سردار پٹیل پر تھی جنہوں نے اُمور داخلہ کو اپنے پاس رکھنے کی فکر میں مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کو پیش کردیا تھا اتفاق سے محکمۂ مالیات میں کئی بہت قابل سینئر مسلمان افسر موجود تھے جنہوں نے لیاقت علی خاں کی ہر ممکن طریقے سے مدد کی۔ ان کے مشورے سے لیاقت علی خاں ہر اس تجویز کو رد کرنے یا التوا میں ڈالنے میں کامیاب ہوتے جو کونسل کے کانگریسی ارکان کی طرف سے پیش ہوتی سردار پٹیل نے دیکھا کہ وہ وزیر داخلہ ہوتے ہوئے بھی اتنے مجبور ہیں کہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے بغیر ایک چپراسی کا عہدہ تک قائم نہیں کرسکتے غرض کہ کانگریسی ممبروں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں

کانگریس نے لیگ کو مالیات کا محکمہ دے کر جو غلطی کی تھی اس کی وجہ سے واقعی ایک افسوسناک صورت حال پیدا

کے اختلافات اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں کسی تیسرے کی وساطت کے بغیر مصالحت ناممکن ہے۔ میری رائے تھی کہ ہمیں اس معاملے کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کانگریس اور لیگ دونوں کو چاہیے کہ معاملہ ان کے سپرد کردیں اور ان کے فیصلے کو تسلیم کرلیں لیکن سردار پٹیل اور جواہر لال دونوں میری تجویز سے متفق نہیں تھے۔ یہ دونوں معاملات کو کسی ثالث پر چھوڑنے کے خلاف تھے چنانچہ میں نے بھی اس بات پر اصرار نہیں کیا۔

اس اثنا میں صورت حال بگڑتی جا رہی تھی۔ کلکتے کے فسادات کے بعد نواکھالی اور بہار میں فساد شروع ہوگئے۔ اس کے بعد بمبئی میں گڑ بڑ ہوئی۔ پنجاب اب تک خاموش تھا لیکن وہاں بھی بے چینی اور تناؤ کے آثار نمایاں تھے۔ ملک خضر حیات خاں نے ۲ مارچ کو چیف منسٹر کے عہدے سے استعفا دے دیا تھا۔ ٤ مارچ کو لاہور میں پاکستان کے خلاف مظاہروں میں تیرہ آدمی ہلاک اور بہت سے زخمی ہوچکے تھے۔ آہستہ آہستہ فسادات کی آگ صوبے کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ امرتسر، راولپنڈی اور ٹیکسیلا میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔

ایک طرف فرقہ وارانہ جذبات تیز ہو رہے تھے، دوسری طرف حکومت کا انتظام ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ یوروپین سرکاری ملازموں کا اب کام میں جی بھی نہیں لگ رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جلد ہی اقتدار ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہوجائے گا۔ جس کی وجہ سے انہیں کام میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب وہ صرف وقت گذار رہے

ساتھیوں کے دل کا حال معلوم کرلیتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ سردار پٹیل ان کا نظریہ قبول کرنے پر آمادہ ہیں تو انھوں نے سردار پٹیل کو مٹھی میں کرنے کے لئے اپنی شخصیت کی ساری دلبری اور طاقت صرف کردی۔ نجی گفتگو میں وہ اکثر سردار پٹیل کو آخروٹ سے تشبیہ دیتے تھے جس کا چھلکا بہت سخت ہوتا ہے لیکن ایک مرتبہ توڑ دیجئے تو اندر سے نرم گودا نکلتا ہے۔

سردار پٹیل کی تسخیر کے بعد ماؤنٹ بیٹن جواہر لال کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے تو جواہر لال تقسیم کی بات نہیں سننا چاہتے تھے اور اس کا ردِ عمل بہت شدید ہوا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن لگے رہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جواہر لال کی مخالفت کا زور ٹوٹ گیا ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آنے کے ایک ماہ کے اندر وہی جواہر لال جو تقسیم کے اتنے سخت مخالف تھے اگر پوری طور پر اس کے حامی نہیں بن گئے تو کم از کم اس خیال کو گوارا کرنے پر تیار ہوگئے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ جواہر لال کو ماؤنٹ بیٹن نے کیوں کر اپنی طرف کرلیا۔ جواہر لال با اُصول آدمی ہیں مگر ساتھ ہی جذباتی بھی ہیں اور اشخاص کا اثر قبول کرتے ہیں۔ ان پر سردار پٹیل کی دلیلوں کا کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا لیکن یہ فیصلہ کن نہ ہوسکتا تھا۔ جواہر لال ماؤنٹ بیٹن سے بہت متاثر تھے اور شاید ان سے بھی زیادہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے۔ یہ خاتون نہایت ذہین تھیں اور اس کے علاوہ ان کی طبیعت اور انداز میں

ہوگئی تھی ۔ اسی عدم مفاہمت کی وجہ سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ملک کی تقسیم کے لئے رفتہ رفتہ زمین ہموار کرنے کا موقع ملا۔ سیاسی مسائل کا رخ بدلنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کانگریس کے ممبروں پر یہ اثر ڈالنا شروع کیا تقسیم ناگزیر ہے ، اور اس طرح رفتہ رفتہ انہوں نے ایکزیکیوٹیو کونسل کے ممبروں کے ذہن میں تقسیم کا خیال ڈال دیا۔

یہ ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کے دام خیال میں سب سے پہلے سردار پٹیل گرفتار ہوئے۔ تقسیم بالکل آخر تک، مسٹر جناح کے لئے سودا کرنے کے لئے ایک مال تھا۔ لیکن پاکستان کا مطالبہ کرکے یہ حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ ایکزیکیوٹیو کونسل میں جو کیفیت تھی اس سے سردار پٹیل اس قدر تنگ آگئے تھے کہ اب وہ تقسیم کے حامی ہوگئے خود سردار پٹیل ہی کی وجہ سے مالیات کا محکمہ لیگ کو ملا تھا اس لئے انہیں لیاقت علی خاں کے سامنے اپنی مجبوری پر اور بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ ان حالات میں جب ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کیا کہ تقسیم اس مسئلے کو حل کرسکتی ہے تو انہوں نے سردار پٹیل کو ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ پایا۔ سردار پٹیل کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ کام نہیں کرسکتے ہیں۔ وہ کھلم کھلا کہتے تھے کہ وہ مسلم لیگ کو ہندوستان کا ایک حصہ دے دینے پر تیار ہیں اگر اس طرح انہیں اس سے نجات مل جائے۔

ماؤنٹ بیٹن بہت ہی ذہین آدمی تھے اور اپنے تمام ہندوستانی

کی جا سکتی تھی. جن صوبوں میں ان کی اکثریت تھی، وہاں انہیں اندرونی معاملات میں پوری خود مختاری ملتی تھی اور مرکز میں بھی تناسب سے زیادہ نمائندگی مل رہی تھی. جب تک فرقہ وارانہ رقابتیں اور شبہات قائم رہے اس وقت تک کے لئے ان کے حقوق کے تحفظ کا کافی انتظام تھا. مجھے اس کا بڑی یقین تھا کہ اگر اسی بنیاد پر ہندوستان کا دستور تیار ہوا اور ایمانداری سے اس پر عمل درآمد ہوا تو شبہات بہت جلد دور ہوجائیں گے کیونکہ ملک کے اصل مسئلے معاشی تھے، فرقہ واری نہیں تھے، اور اختلافات حقیقتاً جماعتوں کے درمیان نہیں بلکہ طبقوں کے درمیان تھے ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہندو مسلمان اور سکھ اپنے اصل مسائل کو سمجھنے لگتے اور فرقہ وارانہ اختلافات دور ہوجاتے.

میں نے بہت کوشش کی کہ میرے ساتھی اس سلسلے میں آخری قدم نہ اُٹھائیں لیکن میں نے دیکھا کہ سردار پٹیل اس حد تک تقسیم پر تلے ہوئے ہیں کہ اور کوئی رائے سننے پر تیار نہیں ہیں. میں نے تقریباً دو گھنٹے ان سے بحث کی. میں نے کہا کہ تقسیم کو مان کر ہم ایک مستقل دشواری پیدا کردیںگے. تقسیم سے فرقہ واری مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ ملک کی ایک دائمی خصوصیت بن جائے گا. جناح نے دو قوموں کا نعرہ بلند کیا ہے. تقسیم پر راضی ہوجانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس نظریے کو صحیح مانتے ہیں. میں نے کہا کہ کانگریس ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے پر کیسے رضامند ہوسکتی ہے؟ تقسیم سے

بڑی دلکشی اور ہمدردی تھی۔ یہ اپنے شوہر کی بہت مداح تھیں اور اکثر ان لوگوں کے لئے اپنے شوہر کے خیالات کی ترجمانی کرتی تھیں جو شروع میں ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے

اس مسئلے میں جواہر لال جس دوسرے شخص سے متاثر ہوئے وہ کرشنا مینن تھے۔ کرشنا مینن اپنے آپ کو جواہر لال کا بڑا مداح ظاہر کرتے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ جواہر لال اکثر ان کے مشورے پر چلتے تھے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ کرشنا مینن اکثر غلط مشورے دیتے ہیں سردار پٹیل میں اور مجھ میں ہمیشہ اتفاق رائے نہ ہوتا، لیکن اس بات پر ہم دونوں ایک رائے کے تھے۔ خیر اس مسئلے پر تفصیلی بحث میں اپنی سوانح حیات کی تیسری جلد میں کروں گا

جب مجھے معلوم ہوا کہ ماؤنٹ بیٹن کا خیال ہندوستان کو تقسیم کرنے کی طرف جارہا ہے اور انہوں نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو راضی کرلیا ہے تو میں بہت ہی پریشان ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ملک کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا ہو رہا ہے کیونکہ تقسیم میں صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں، سارے ملک کے لئے بڑا نقصان ہے۔ میں پہلے بھی یہی سمجھتا تھا اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ کیبنٹ مشن کا پلان ہر اعتبار سے سے ہمارے مسائل کا بہترین حل تھا۔ اس سے ہندوستان کا اتحاد بھی قائم رہتا تھا اور ہر فرقے کو آزادی اور عزت سے زندگی گذارنے کا موقع ملتا تھا۔ صرف مسلمانوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بھی اس سے بہتر صورت کی توقع نہیں

سے مایوس کر دیا تھا۔ کانگریس اور لیگ دونوں میں کسی بات پر بھی اتفاق رائے نہ ہوسکا تھا اور آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ جواہر لال نے کامل ناامیدی کے انداز میں مجھ سے سوال کیا کہ ایسی صورت میں تقسیم کے علاوہ کیا چارہ ہے؟

جواہر لال رنجیدہ تھے لیکن مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں رہا کہ ان کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ انھیں تقسیم کے خیال سے سخت نفرت تھی لیکن اس کے باوجود اب وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کے سوا کوئی تدبیر ممکن نہیں۔ وہ تقسیم کو بہت برا سمجھتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ حالات ہمیں مجبور کر کے اُسی کی طرف لئے جارہے ہیں۔

کچھ دنوں بعد جواہر لال میرے پاس آئے، کافی لمبی تمہید میں پہلے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اب خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے بجائے حقیقت کو دیکھنا چاہئے۔ پھر وہ اصل مطلب پر آئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے تقسیم کی مخالفت ترک کر دینا چاہئے۔ ان کے خیال میں تقسیم ناگریز تھی اور عقلمندی کا تقاضا یہ تھا کہ ہونے والی بات کی مخالفت نہ کی جائے اس مسئلے میں میرا ماؤنٹ بیٹن کی مخالفت کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔

میں نے جواب دیا کہ میرے لئے ان کی بات کو تسلیم کرنا بالکل ممکن نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یکے بعد دیگرے ہم غلط قدم اٹھا رہے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی غلطیوں کا تدارک کریں، ہم اپنے آپ کو ان کے نتائج میں اور زیادہ

ایک دوسرے کا خوف دور نہ ہوگا بلکہ یہ فرقہ واری نفرت کی وجہ سے دو ریاستوں کو وجود میں لاکر خوف کی کیفیت کو ہمیشہ کے لئے قائم کردے گی، جب ایک مرتبہ نفرت کے سبب سے الگ ریاستیں بنا دی گئیں تو پھر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا۔

سردار پٹیل کا جواب سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور تکلیف بھی کہ چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہندوستان میں دو قومیں ہیں اب انھیں یقین ہوگیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرکے ایک قوم نہیں بنایا جاسکتا اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا اس طرح ختم کیا جاسکتا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ اگر دو بھائی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو انھیں الگ ہوجانا چاہئے جب الگ ہونے پر انھیں اپنا اپنا حصہ مل جائیگا تو یہ پھر ایک دوسرے کے دوست ہوجائیںگے۔ اس کے برخلاف اگر انھیں ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑنے پر آمادہ رہیں گے۔ آئے دن کی تو تو میں میں سے تو بہتر ہے کہ ایک مرتبہ جی کھول کر لڑلیا جائے اور پھر علیحدگی اختیار کی جائے۔

اب میں جواہر لال کی طرف رجوع ہوا۔ انھوں نے اس طرح تقسیم کے حق میں باتیں نہیں کیں جیسے پٹیل نے، بلکہ انھوں نے کہا کہ تقسیم فی نفسہ غلط ہے لیکن مرکزی حکومت میں لیگ کے ممبروں کے رویے نے ان کو بھی اشتراک عمل کی طرف

خطرہ بن گئی ہے۔ ولبھ بھائی اور جواہر لال نے تو شاید ہتھیار ڈال دئیے ہیں تمھارا کیا ارادہ ہے۔ تم بھی بدل گئے ہو یا تم میرا ساتھ دوگے۔»

میں نے جواب دیا «میں ہمیشہ تقسیم کے خلاف تھا اور اب بھی ہوں میں تو کہوں گا کہ تقسیم کا جتنا سخت مخالف میں آج ہوں اتنا پہلے کبھی نہیں تھا مگر میں اس بات سے بے حد پریشان ہوں کہ جواہرلال اور سردار پٹیل نے ہار مان لی ہے یا جیسا آپ نے فرمایا، ہتھیار ڈال دئیے ہیں۔ اب مجھے جو امید ہے وہ آپ سے ہے۔ اگر آپ نے استقلال کے ساتھ تقسیم کی مخالفت کی تو ہم اب بھی بچ سکتے ہیں، لیکن آپ بھی دب گئے تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان تباہ ہو جائے گا»

گاندھی جی نے کہا «یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اگر کانگریس تقسیم کو تسلیم کریگی تو وہ صرف میری لاش کو روند کر کرے گی جب تک کہ میرے جسم میں جان ہے میں تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوں گا اور اگر میرا بس چلا تو کانگریس کو بھی راضی نہیں ہونے دوں گا۔»

اسی روز بعد میں گاندھی جی ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔ دوسرے دن ان کی پھر ملاقات ہوئی ۲ اپریل کو وہ ایک بار پھر ملے۔ پہلی ملاقات سے واپسی کے فوراً بعد پٹیل گاندھی جی کے پاس آئے اور دو گھنٹے سے زیادہ تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے۔ مجھے کچھ علم نہیں ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں لیکن میں جب اس کے بعد گاندھی جی سے ملا تو مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ

الجھاتے جا رہے ہیں۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کے منصوبے کو منظور کرلیا تھا اور ہندوستان کے مسائل کا ایک اطمینان بخش حل نظر میں تھا۔ بدقسمتی سے صورت حال کچھ ایسی بدلی کہ مسٹر جناح کو اپنی منظوری واپس لینے کا موقع مل گیا۔

میں نے کہا کہ دوسری غلطی اس وقت ہوئی جب لارڈ ویول نے یہ تجویز کیا کہ داخلی امور کا محکمہ لیگ کو دیدیا جائے۔ اس سے ہمارے لئے مشکلوں کا کوئی پہاڑ نہ کھڑا ہو جاتا لیکن چونکہ سردار پٹیل اس محکمے کو اپنے قبضے میں رکھنے پر مُصر تھے اس لئے ہمیں مالیات کا محکمہ لیگ کو دینا پڑا۔ ہماری موجودہ مشکلات کا اصل سبب یہی ہے۔ میں نے جواہر لال کو آگاہ کیا کہ اگر ہم ملک کی تقسیم پر راضی ہوگئے تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریںگی۔ اور یہ کہا جائیگا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی ذمہ داری جتنی لیگ پر تھی اتنی ہی کانگریس پر بھی تھی

اب جبکہ جواہر لال اور سردار پٹیل دونوں تقسیم کے موافق ہوگئے تھے، میری آس گاندھی جی پر لگی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہ پٹنہ میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے کچھ مہینے انہوں نے نواکھالی میں گذارے تھے جہاں کے مقامی مسلمان ان سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کی ایک نئی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دلّی آئیں گے۔ وہ ۳۱ مارچ کو دلّی آ بھی گئے۔ میں فوراً ان سے ملنے گیا۔ پہلا جملہ جو انہوں نے مجھ سے کہا وہ یہ تھا «تقسیم اب واقعی ایک

کیا کہ وہ اپنی تحویر واپس لے لیں۔

گاندھی جی نے اس بات کو یاد دلاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ اب صورت ایسی ہے کہ تقسیم تو ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ طے صرف یہ کرنا ہے کہ اس کی شکل کیا ہو، یہ مسئلہ تھا جس پر گاندھی جی کی جائے قیام پر رات دن بحث ہونے لگی تھی۔

میں نے ان سارے مسائل پر بہت غور کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ گاندھی جی نے اپنی رائے اتنی جلدی کیسے بدل دی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سردار پٹیل کے اثر کا نتیجہ تھا۔ پٹیل علانیہ کہتے تھے کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تجربے سے ثابت ہوگیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہے سردار پٹیل نے غالباً ایک اور بات کو بھی اہمیت دی ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہتے تھے کہ کانگریس مرکزی حکومت کو کمزور رکھنے پر صرف لیگ کے اعتراض کا جواب دینے کے لئے رضامند ہوئی تھی، اسی وجہ سے صوبوں کو اندرونی معاملات میں مکمل حق خود اختیاری دیا گیا تھا۔ مگر ایک ایسے ملک میں جہاں زبان، مذہب اور تہذیب کے ایسے اختلافات تھے، مرکزی کمزوری، اتحاد دشمن رجحانات کو تقویت پہنچائے گی۔ مسلم لیگ سے واسطہ نہ رہنے کے بعد ایک مضبوط مرکزی حکومت کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور ایسا دستور مرتب ہوسکتا ہے جو ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے مفید مطلب ہو۔ ماؤنٹ بیٹن نے مشورہ دیا کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے کچھ چھوٹے ٹکڑوں کو دے کر بقیہ ہندوستان کو ایک مضبوط

پہنچا. میں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی بدل گئے ہیں. ابھی وہ کھلم کھلا تقسیم کی موافقت تو نہیں کر رہے تھے لیکن ان کی مخالفت میں پہلی جیسی شدّت نہیں تھی. اس سے بھی زیادہ حیرانی اور دکھ مجھ کو اس بات سے ہوا کہ اب وہ بھی وہی دلیلیں پیش کرنے لگے تھے جو میں سردار پٹیل کی زبانی سن چکا تھا تقریباً دو گھنٹے تک میں ان کی منت سماجت کرتا رہا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا.

آخر ناامید ہو کر میں نے کہا «اگر آپ کا یہی نظریہ ہے تو مجھے ہندوستان کو عذاب سے بچانے کی کوئی امید نظر نہیں آتی» گاندھی جی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن انہوں نے یہ کہا کہ میں یہ تجویز کر چکا ہوں کہ مسٹر جناح کو وزارت بنانے اور کابینہ کے ممبروں کو نامزد کرنے کی دعوت دی جائے. انہوں نے کہا کہ وہ یہ بات لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی کہہ چکے ہیں اور ماؤنٹ بیٹن اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں.

مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہوا ہے. گاندھی جی کی اس ملاقات کے دوسرے روز جب میں ماؤنٹ بیٹن سے ملا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر کانگریس گاندھی جی کی تجویز کو مان لے تو تقسیم سے اب بھی بچنا ممکن ہے. لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سے متفق تھے کہ کانگریس کی طرف سے ایسی پیش کش مسلم لیگ کو مطمئن کردے گی اور شاید مسٹر جناح کو اعتماد بھی ہوجائے گا. بدقسمتی سے یہ بات آگے نہیں بڑھ سکی. جواہر لال اور پٹیل دونوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی بلکہ گاندھی جی کو مجبور

تقسیم ہونا چاہئے لیکن کانگریس کے لیڈروں کو انہوں نے مشورہ دیا کہ فی الحال یہ سوال نہ اٹھائیں اور انہیں یقین دلایا کہ آگے چل کر کسی مناسب موقع پر وہ خود اس مسئلے کو اٹھائیں گے۔

گاندھی جی کی پٹنہ کے لئے روانگی سے پہلے میں نے ان سے پھر ایک آخری اپیل کی میں نے درخواست کی کہ حالات کی موجودہ شکل کو دو سال تک یونہی رہنے دیا جائے۔ عملاً اقتدار اس وقت بھی ہندوستانی ہاتھوں میں ہے اگر قانونی منتقلی کو دو تین سال تک ملتوی رکھا جائے تو ممکن ہے کہ لیگ ان اسباب کی بنا پر جن کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں مصالحت پر آمادہ ہوجائے گاندھی جی نے خود کچھ مہینے پہلے یہی تجویز کیا تھا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ قوموں کی زندگی میں دو تین سال کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہوا کرتی۔ اگر ہم دو تین سال انتظار کرلیں تو مسلم لیگ مصالحت پر مجبور ہوجائے گی۔ میں جانتا تھا کہ اگر فیصلہ اس وقت کیا گیا تو تقسیم ناگزیر ہوگی۔ دو تین سال بعد کسی بہتر حل کی توقع کی جاسکتی ہے گاندھی جی نے میری تجویز کو رد نہیں کیا لیکن انہوں نے کچھ بہت دلچسپی بھی نہیں لی۔

اس اثنا میں ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم سے متعلق اپنی تجویز مرتب کرلی تھی۔ اب انہوں نے برطانوی حکومت سے گفتگو کرنے اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لئے لندن جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اپنے منصوبے کے لئے کنزرویٹو پارٹی کی تائید بھی حاصل کرلیں گے۔ کنزرویٹو پارٹی نے کیبنٹ

اور مستحکم ریاست بنایا جائے سردار پٹیل پر اس دلیل کا بہت
اثر ہوا کہ مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک کرنے سے ہندوستان
کا اتحاد اور استحکام خطرے میں پڑ جائے گا میرا خیال ہے کہ
صرف سردار پٹیل ہی نہیں، جواہر لال بھی ان دلیلوں سے متاثر
تھے انھیں دلیلوں کو جب سردار پٹیل اور ماؤنٹ بیٹن نے دہرایا
تو گاندھی جی تقسیم کی مخالفت کرنے میں کمزور پڑ گئے۔

شروع سے آخر تک میری کوشش یہ رہی کہ میں ماؤنٹ بیٹن
کو اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کو غور
اور بحث کی بنیاد بنانے پر قائم رہیں جب تک گاندھی جی کا بھی یہی
خیال تھا اس وقت تک میں مایوس نہیں ہوا تھا، اب جو گاندھی جی
کا نظریہ بدل گیا تو میں سمجھ گیا کہ ماؤنٹ بیٹن میری تجویز
سے اتفاق نہیں کریںگے۔ ممکن ہے ماؤنٹ بیٹن کو کیبنٹ مشن
پلان سے زیادہ لگاؤ اس لئے نہ رہا ہو کہ وہ ان کے دماغ کی
تخلیق نہیں تھا اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جوں
ہی انھوں نے دیکھا کہ لوگ کیبنٹ پلان کے سختی سے خلاف
ہیں وہ تقسیم کے پلان کو جو ان کے خیالات کے مطابق تھا
اس کی جگہ پیش کرنے پر آمادہ ہوگئے۔

اب چونکہ لوگ عام طور سے تقسیم پر راضی معلوم ہوتے
تھے، بنگال اور پنجاب کے مسئلے کو ایک نئی اہمیت حاصل ہوگئی
ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ چونکہ تقسیم کی بنیاد مسلمان اکثریت کے
علاقے تھے اور چونکہ پنجاب اور بنگال کے کچھ حصوں میں بھی
مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس لئے ان دونوں صوبوں کو بھی

اگر ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس سے اتفاق کیا اور احتیاط سے کام لینے پر زور دیا تو کابینہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اب تک کانگریس اس پر اصرار کر رہی تھی کہ ہندوستان کو فوراً آزاد کیا جائے۔ اب خود کانگریس ہی یہ چاہتی تھی کہ سیاسی مسئلے کا حل دو ایک سال کے لئے ملتوی رکھا جائے۔ ظاہر ہے اگر برطانیہ کانگریس کی اس فرمائش پر عمل کرے تو اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ میں نے ماؤنٹ بیٹن کو معاملے کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلائی، وہ یہ کہ اگر اب برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے میں عجلت کی تو غیر جانب دار لوگ یہی نتیجہ نکالیں گے کہ برطانیہ ہندوستان کو ایسے حالات میں آزاد کرنا چاہتا تھا جب وہ اس سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ہندوستان کی خواہش کے خلاف تقسیم پر اصرار کرنے سے شبہ ہوگا کہ برطانیہ کی نیت صاف نہیں ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے یقین دلایا کہ وہ برطانوی کابینہ کے سامنے اصل اور صحیح حال پیش کریں گے اور وہ سب کچھ بیان کردیں گے جو پچھلے دو مہینوں میں انہوں نے دیکھا یا سنا ہے۔ وہ کابینہ کو اس سے بھی مطلع کریں گے کہ کانگریس کا ایک اہم طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اس مسئلے کو دو ایک سال کے لئے ملتوی رکھا جائے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مسٹر ایٹلی اور سر اسٹیفرڈ کرپس کو بتا دیں گے اس معاملے میں میری رائے کیا ہے۔ کسی قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لئے برطانوی حکومت کے پاس یہ سارا مواد موجود ہوگا۔

پلان کی اس بنا پر مخالفت کی تھی کہ اس سے مسلم لیگ کا تقسیم کا مطالبہ پورا نہ ہوتا تھا اب جب کہ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کی بنیاد ہی تقسیم پر تھی تو ظاہر ہے کہ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ مسٹر چرچل اس کی حمایت کریں گے

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ٤ مئی کے جلسے کے بعد میں شملہ چلا گیا۔ چند روز بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی وہیں آگئے۔ وہ لندن کے لئے روانہ ہونے سے پہلے چند روز آرام کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ۱۵ مئی کو دلی واپس جائیں اور ۱۸ مئی کو لندن کے لئے روانہ ہوجائیں میں نے سوچا کہ کیبنٹ مشن پلان کو بچانے کی آخری کوشش کر لوں۔ چنانچہ ١٤ مئی کی رات کو میں ان سے ملا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک گفتگو جاری رہی میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کو دفن نہ کریں میں نے کہا کہ ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے کیونکہ اس پلان کو کامیاب بنانے کی امید اب بھی باقی ہے۔ اگر ہم نے عجلت سے تقسیم کو تسلیم کرلیا تو اس سے ہندوستان کو ایک مستقل نقصان پہنچے گا۔ ایک بار ملک تقسیم ہوگیا تو پھر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اور تقسیم کو مسترد کرنے کا بھی امکان نہ ہوگا۔

میں نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا کہ غالباً مسٹر ایٹلی اور ان کے ساتھی کیبنٹ مشن پلان کو آسانی سے ترک نہیں کریں گے کیونکہ اسے ان لوگوں نے خود بڑی کاوش کے بعد تیار کیا تھا۔

کابینہ کو تقسیم منظور کرنے پر آمادہ کریں.

ساری دنیا جانتی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بہادرانہ اعلان کا نتیجہ کیا نکلا تقسیم کے وقت ملک کے مختلف حصوں میں خون کی ندیاں بہیں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا. ہندوستانی فوج تقسیم کردی گئی تھی اور بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل کو روکنے کی کوئی کار آمد تدبیر نہیں کی جاسکی اسی لئے میں نے اس سے پہلے باب میں یہ کہا تھا کہ غالباً لارڈ ویول نے جو بات کہی تھی وہ ٹھیک تھی.

میں نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا کہ وہ تقسیم کے ممکن نتائج کو بھی ذہن میں رکھیں۔ تقسیم کے بغیر ہی کلکتے، نواکھالی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہوئے ہیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملے کئے ہیں۔ اس فضا میں اگر ملک تقسیم ہوا تو خون کی ندیاں بہیں گی اور اس خون خرابہ کی ذمہ داری انگریزوں پر ہوگی۔

بغیر کسی تامل کے ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا «میں اس ایک معاملے میں تو آپ کو پورا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فسادات اور خون ریزی بالکل نہیں ہونے دوں گا میں سپاہی ہوں۔ ایک بار جب تقسیم اصولاً مان لی جائے گی تو میں احکامات جاری کردوں گا۔ کہ ملک میں کہیں فرقہ وارانہ فساد نہ ہونے پائیں اور اگر اس قسم کی کوئی تحریک ہوئی تو میں سختی سے سخت قدم اٹھاؤں گا اور ابتدا ہی میں فساد کو دبا دوں گا۔ اس کام کے لئے میں فوجی پولیس پر بھی بھروسہ نہیں کروں گا بلکہ میں بلا واسطہ فوج اور ہوائی بیڑے سے کام لوں گا اور ٹینک اور ہوائی جہازوں کے ذریعے شرارت کرنے والوں کو کچل ڈالوں گا۔»

لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفتگو کا میرے اوپر یہ اثر ہوا کہ وہ ذہن میں تقسیم کا کوئی صاف نقشہ لے کر لندن نہیں جا رہے ہیں اور انہوں نے کیبنٹ پلان کو بالائے طاق نہیں رکھ دیا ہے بعد کے واقعات نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا۔ جس طریقے سے انہوں نے بعد کو عمل کیا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فیصلہ کرچکے تھے اور لندن اس نیت سے جارہے تھے کہ برطانوی

پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ میرے بڑے سے بڑے اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ آزادی کی قیمت، ملک کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنا طے پائی تھی۔

اس بیان کے شائع ہونے کے ساتھ، ہندوستان کو برقرار رکھنے کی ساری اُمیدیں ختم ہو گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کیبنٹ مشن کے پلان کو بالائے طاق رکھ کر تقسیم کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ جب میں نے برطانیہ کے نئے رویے کی تشریح کرنی چاہی تو میں اس ناخوشگوار نتیجہ پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے اس فیصلے میں ہندوستان سے زیادہ برطانیہ کے مفاد کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ لیبر پارٹی نے ہمیشہ کانگریس اور اُس کے لیڈروں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا تھا اور کئی بار کھلم کھلا یہ اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ اب اُسی مسلم لیگ کے مطالبات کے آگے سر جھکانے کا مطلب میری رائے میں لیگ کو خوش کرنے سے زیادہ خود برطانوی مفاد کا تحفظ تھا اگر ہندوستان کیبنٹ مشن پلان کے مطابق آزاد ہوتا تو برطانیہ کے لئے ہندوستان کی صنعتی اور معاشی زندگی میں پہلے جیسا دخل رکھنے کا امکان کم ہو جاتا۔ اس کے برخلاف ہندوستان کی تقسیم اور مسلمان اکثریت کے صوبوں کی الگ ریاست بن جانے سے برطانیہ کو ہندوستان میں پاؤں ٹیکنے کی ایک جگہ ملتی تھی۔ ایک ایسی ریاست، جس میں مسلم لیگ برسراقتدار ہو، مستقل طور پر برطانیہ کے حلقۂ اثر میں رکھی جاسکتی تھی۔ اس کا اثر ہندوستان کے رویے پر بھی پڑ سکتا تھا۔ ہندوستان کو یہ دیکھ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا!

میرے دل میں ذرا سی اُمید اب بھی باقی تھی کہ برطانیہ کی لیبر کابینہ آسانی سے کیبنٹ مشن پلان کو نا منظور نہ ہونے دے گی۔ اس پلان کی تشکیل کابینہ کے ایسے تین ارکین نے کی تھی جو لیبر تحریک میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس وقت تک لارڈ پیتھک لارنس سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو چکے تھے لیکن سراسٹفرڈ کرپس اور مسٹر الگزانڈر اب بھی کابینہ کے رکن تھے مجھے قوی اُمید تھی کہ یہ دونوں اس پلان کو بچانے کی آخری کوشش کرینگے۔ لارڈماؤنٹ بیٹن کے لندن پہنچنے کے کچھ عرصے بعد جب میں نے سنا کہ برطانوی کابینہ نے ان کی مجوزہ اسکیم منظور کرلی ہے تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پلان کی تفصیلات ابھی شائع نہیں ہوئی تھیں لیکن میرا قیاس تھا کہ اس میں ہندوستان کی تقسیم تجویز کی گئی ہوگی۔ ۳۰ مئی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن دلی واپس آئے۔ ۲ جون کو انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے گفتگو کی۔ ۳ جون کو ایک وھائٹ پیپر شائع ہوا جس میں اس پلان کی پوری تفصیل دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے جو بیان شائع کیا وہ ضمیمے میں درج ہے۔ یہاں

کی تجویز زیادہ قابل قبول معلوم ہوئی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی حمایت کی۔ لیبر حکومت نے غالباً مسئلے کے اس پہلو کا بھی لحاظ رکھا ہوگا کہ کنزرویٹیو پارٹی کی تائید سے ہندوستان کی آزادی کا بل زیادہ آسانی سے منظور کرایا جا سکے گا۔

نئی صورت حال پر غور کرنے کے لئے ۳ جون کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ سب سے پہلے جو مسئلہ زیر بحث آیا وہ صوبہ سرحد کا مستقبل تھا۔ ماؤنٹ بیٹن پلان نے صوبہ سرحد کو ایک عجیب سی مشکل میں ڈال دیا تھا عبدالغفار خاں اور ان کی پارٹی نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور لیگ کی مخالفت کی تھی مسلم لیگ خان بھائیوں کو اپنا جانی دشمن تصور کرتی تھی۔ لیگ کی مخالفت کے باوجود صوبہ سرحد میں خان بھائیوں نے کانگریسی حکومت بنانے میں کامیابی حاصل کی تھی اور یہ حکومت اب تک برسراقتدار تھی۔ تقسیم کی وجہ سے خان بھائیوں اور کانگریس دونوں کے لئے تکلیف دہ صورت پیدا ہو گئی تھی۔ دراصل تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ خان بھائیوں اور ان کی پارٹی یعنی خدائی خدمت گاروں کو لیگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ گاندھی جی کے ماؤنٹ بیٹن پلان کو قبول کر لینے پر مجھے تعجب اور افسوس ہوا تھا۔ اب انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں تقسیم کی موافقت میں تقریر کی۔ لیکن چونکہ مجھے پہلے ہی ان کے خیالات کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے ان

کر کہ پاکستان میں برطانیہ کا اڈا ہے، برطانوی مفاد کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ شاید اور کسی صورت میں وہ اتنا لحاظ نہ کرتا۔

یہ سوال ایک عرصے سے زیر بحث تھا کہ آزاد ہونے کے بعد ہندوستان کامن ویلتھ کا رکن رہے گا یا نہیں۔ کیبنٹ مشن پلان کے مطابق یہ فیصلہ آزاد ہندوستان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا میں نے اُس وقت سراسٹیفرڈ کرپس سے کہا تھا کہ ممکن ہے خود ہندوستان آزادانہ طور پر کامن ویلتھ میں رہنا ہی پسند کرے لیکن ہندوستان کی تقسیم سے جو صورت حال پیدا ہو رہی تھی وہ برطانیہ کے لئے زیادہ موافق تھی مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق اگر نئی ریاست بنتی تو اس کا کامن ویلتھ میں رہنا یقینی تھا ایسی صورت میں ہندوستان کو بھی مجبوراً وہی کرنا پڑتا جو پاکستان کرتا برطانیہ کی لیبر حکومت پر ان باتوں کا بھی کافی اثر پڑا ہوگا اس نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا عہد کیا تھا وہ یہ بھی نہیں بھول سکتی تھی کہ سیاسی کشمکش کے دوران میں کانگریس نے ہمیشہ برطانیہ کی مخالفت اور لیگ نے اس کی موافقت کی تھی۔ چنانچہ جب ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم اور لیگ کے مطالبے کے مطابق نئی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تو اُنہوں نے لیبر کابینہ کے بہت سے ارکان کو اپنا ہم خیال پایا۔

میرا خیال ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کنزرویٹو پارٹی سے سے ملاقات کے وقت اسی پہلو پر زور دیا ہوگا۔ مسٹر چرچل کبھی بھی کیبنٹ مشن پلان کے موافق نہیں تھے۔ انہیں ماؤنٹ بیٹن

کانگریس کا ساتھ دیا تھا، ان کی طرف سے وہ کیسے منہ موڑ سکتے تھے؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں مسٹر جناح سے گفتگو کریں گے چنانچہ انہوں نے گفتگو کی جس کے بعد مسٹر جناح نے خان عبدالغفار خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن گفتگو بے نتیجہ رہی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی جب کانگریس نے تقسیم کو تسلیم کرلیا تو خان عبدالغفار خان اور ان کی پارٹی کا مستقبل کیا ہو سکتا تھا! ماؤنٹ بیٹن پلان کی بنیاد ہی یہ تھی کہ مسلمان اکثریت کے صوبوں کی الگ ریاست بنے گی۔ صوبہ سرحد میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت تھی، اسے بہر حال پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی صوبہ سرحد مجوزہ پاکستان کی حدود کے اندر آتا تھا اس کی اور ہندوستان کی سرحدیں کہیں بھی نہیں ملتی تھیں۔

ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ صوبوں کو دونوں ریاستوں میں سے کسی میں بھی شامل ہونے کا حق ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ صوبہ سرحد کو بھی حق خود مختاری کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کیا کہ اس بارے میں صوبہ سرحد کی رائے معلوم کرنے کے لئے وہاں استصواب رائے کیا جائے کہ صوبے کے لوگ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں۔ اب ڈاکٹر خان عبدالغفار صاحب بھی آکر ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ وہ اب تک صوبہ سرحد کے

کی تقریر میرے لئے زیادہ غیر متوقع نہیں تھی لیکن ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عبدالغفار خاں پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا ایسا لگتا تھا کہ ان کے ہوش و حواس بالکل گم ہو گئے ہیں چند منٹ تک ان کے منھ سے ایک بول نہ نکلا. پھر انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور اسے یاد دلایا کہ انہوں نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا ہے اور اب اگر کانگریس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو سرحد پر اس کا بہت خراب ردِّ عمل ہوگا ان کے دشمن ان پر ہنسیں گے اور ان کے دوست بھی کہیں گے کہ جب تک کانگریس کو صوبہ سرحد کی ضرورت تھی، ان خدائی خدمت گاروں کی حمایت کی مگر جب لیگ سے مصالحت کرنے کی خواہش ہوئی تو اس نے سرحد اور اس کے لیڈروں سے مشورہ بھی نہیں کیا اور تقسیم کی مخالفت کرنا چھوڑ دیا خاں عبدالغفار خاں نے کئی بار دہرایا کہ اگر کانگریس نے خدائی خدمت گاروں کو بھی بھیڑیوں کے سامنے نوچنے کے لئے ڈال دیا تو یہ صوبہ سرحد کے ساتھ غداری ہو گی۔

گاندھی جی کے دل پر عبدالغفار خاں کی اپیل کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے کہا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن سے اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ وہ وائسرائے سے ملے اور اس مسئلے کو اُٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ اس وقت تک ملک کو تقسیم کرنے کی تجویز کی موافقت نہیں کریں گے جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں ہو جائیگا کہ مسلم لیگ خدائی خدمت گاروں کے ساتھ انصاف سے پیش آئیں گی۔ جن لوگوں نے مشکلوں اور مصیبتوں کے زمانے میں

حلد ار حلد اپنے پلاں کو عمل میں لانا چاہتے تھے اس لئے پحتونستان کے مسلئے پر تفصیلی بحث بھی بہیں کی گئی

کانگریس کی کارروائیوں میں یہ حاں بھائیوں کی آحری شرکت تھی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر مختصراً بیاں کر دوں کہ تقسیم سے فوراً قبل اوز بعد ان پر کیا گدری حب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس نے تقسیم کو تسلیم کر لیا ہے تو ان کی سمجھ میں بہیں آیا کہ کیا کریں رائے شماری سے انکار ناممکں تھا کیونکہ انکار کا مطلب اس کا اعتراف تھا کہ انہیں اپنے لوگوں کا اعتماد حاصل بہیں تھا یہ دونوں پیشاور لوٹ گئے اور انہوں نے اپنے دوستوں کے مشورے سے سرحد کی آرادی کا نعرہ بلند کیا

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے سرحد کی کانگریس کے فیصلے کی تصدیق کردی تھی حس کے روسے عبدالغفار حاں کو پورا احتیار دیا گیا تھا کہ صوبے کی صورت حال کے پیش نظر حو قدم مناسب سمجھیں اٹھائیں اب سرحد کی کانگریس نے پٹھانوں کی ایک ایسی آراد ریاست کا مطالبہ کیا حس کا دستور اسلامی حمہوریت مساوات اور سماحی انصاف پر مبنی ہو. اپنے مطالبے کی وضاحت کرتے ہوئے حاں عبدالغفار حاں نے کہا کہ سرحد کے پٹھانوں کی اپنی ایک نمایاں تاریخ اور تہذیب ہے حس کا تحفظ صرف اسی طرح ممکں ہے کہ انہیں اپنے معاشرتی نظام کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کی پوری پوری آرادی ہو. چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ استصواب رائے صرف ہندوستاں یا پاکستاں میں شمولیت کے متعلق نہ ہونا چاہئے بلکہ ان کے علاوہ آراد پحتونستاں

چیف منسٹر تھے. لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان سے اپنے پلان کے بارے
میں گفتگو کر چکے تھے اور پوچھ چکے تھے کہ اُنہیں استصواب
رائے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے ڈاکٹر خان صاحب صوبہ کے
چیف منسٹر تھے، اس لئے ان کا دعویٰ تھا کہ اکثریت ان کی
تائید کرتی ہے. وہ استصواب رائے کی تجویز سے اختلاف نہیں
کر سکتے تھے. لیکن انہوں نے ایک اور سوال اٹھایا انہوں نے کہا
کہ اگر استصواب رائے ہو تو پٹھانوں کو یہ حق بھی ہونا چاہئے
کہ وہ اپنی الگ ریاست پختونستان کے لئے بھی رائے دے سکیں

حقیقت یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں خان بھائیوں کی طاقت
اتنی نہیں تھی جتنی کہ کانگریس سمجھتی تھی. تقسیم کی تحریک
کے بعد ان کا زور اور بھی گھٹ گیا تھا. اب چونکہ پاکستان
کی منزل قریب نظر آرہی تھی اور مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں
سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں ایک الگ ریاست بننے کا موقع دیا
جائے گا اس لئے سرحد میں ایک جذباتی انقلاب کی لہر دوڑ گئی تھی.
پاکستان کی تحریک کو برطانوی افسروں سے بہت تقویت پہنچی
یہ لوگ علانیہ پاکستان کی حمایت کرتے تھے اور انہوں نے بیشتر
قبائلی سرداروں کو مسلم لیگ کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا. ڈاکٹر
خان صاحب نے دیکھا کہ صوبہ سرحد اپنی قیادت کو پختونستان
کا مطالبہ پیش کرکے ہی برقرار رکھ سکتے ہیں. پٹھانوں کو
چونکہ پنجاب سے خطرہ تھا اس لئے وہ چھوٹی ہی سہی لیکن اپنی
الگ ریاست بنانے کو کسی دوسری چیز پر ترجیح دیتے. لیکن
ماؤنٹ بیٹن کسی نئے مطالبے کو سننے پر آمادہ نہیں تھے. وہ چونکہ

میں برآمد ہوا اور برطانوی حکومت نے اسے فوراً تسلیم کرلیا۔

تقسیم کے بعد خان بھائیوں نے حالات کے مطابق اپنے رویے میں تبدیلی کرلی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ آزاد پختونستان کے مطالبے سے ان کی مراد ایک الگ ریاست کا قیام نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کو پاکستان کے ایک رکن کی حیثیت سے مکمل خود مختاری حاصل ہو۔ انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ پاکستان کا دستور صحیح معنوں میں وفاقی ہو جس میں ان صوبوں کو جو اس کے رکن ہوں پوری صوبجاتی خود مختاری دیجائے۔ اس طرح پٹھانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا تحفظ ہوجائے گا۔ ایسے تحفظ کے بغیر سارے پاکستان پر پنجابیوں کا غلبہ ہوجائے گا اور ممکن ہے کہ وہ پٹھانوں اور دوسری اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کردیں۔

خان بھائیوں کا مطالبہ یقیناً جائز تھا اور مسلم لیگ کے لاہور رزولیوشن سے ہم آہنگ تھا جسے خود لیگ نے منظور کیا تھا اور جس میں بعد کو کوئی ترمیم نہیں ہوئی تھی بہر حال مسٹر جناح کو خان بھائیوں پر یہ الزام لگانے کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ پاکستان سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں خان عبدالغفار خان نے اس سلسلے میں مسٹر جناح سے کئی ملاقاتیں کیں اور ایک موقع پر تو ایسا لگتا تھا کہ دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی شکل نکل آئے گی۔ بعض واقف کار لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ مسٹر جناح خان عبدالغفار خان کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے

کے حق میں بھی رائے دینے کا موقع ہونا چاہئے۔ صرف اسی طرح استصواب رائے صحیح ہوگا اور عوام کی خواہش کی عکاسی کر سکے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو رائے شماری بے معنی ہوگی کیونکہ پختون، پاکستان کے دوسرے عناصر میں مدغم ہو جائینگے۔ بعض اسباب کی بنا پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ اگر رائے شماری میں آزاد پختونستان کا مطالبہ بھی شامل کر لیا گیا ہوتا تو سرحد کے بہت سے لوگوں نے اس کے حق میں رائے دی ہوتی۔ یہ خطرہ انہیں تھا ہی کہ پنجاب انہیں ہضم کر لے گا۔ ممکن تھا کہ صرف اسی ایک بات سے متاثر ہو کر لوگوں نے پاکستان کے خلاف رائے دی ہوتی۔

اس مطالبے کو تسلیم کرنے پر نہ ماؤنٹ بیٹن تیار تھے اور نہ مسٹر جناح ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات واضح کردی کہ صوبہ سرحد ایک الگ خود مختار ریاست نہیں بنایا جاسکتا۔ اسے یا تو پاکستان میں شامل ہونا پڑے گا یا ہندوستان میں۔ اس کے بعد خان بھائیوں نے اعلان کیا کہ ان کی پارٹی رائے شماری میں شریک نہ ہوگی۔ انہوں نے پٹھانوں سے اپیل کی کہ رائے شماری میں حصہ نہ لیں، لیکن ان کی مخالفت سے کچھ نہ ہوا۔ استصواب رائے کیا گیا اور آبادی کے خاصے بڑے حصے نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ اگر خان بھائیوں نے استصواب رائے کو بائیکاٹ نہ کیا ہوتا اور ان کے ساتھیوں نے خلوص اور تندہی سے کام کیا ہوتا تو یہ اندازہ کیا جا سکتا کہ پٹھانوں میں سے کتنے پاکستان کے خلاف تھے۔ لیکن رائے شماری کا نتیجہ مسلم لیگ کے حق

وہی کانگریس حس نے ہمیشہ ملک کی آزادی اور اتحاد کے لئے حاں کھپائی تھی اب ملک کی تقسیم کے بارے میں حود اپنی ایک تحویز پر عور کرنے حارہی تھی. پنڈت گوبند بلبھ پنت نے تحویز پیش کی اور حب سردار پٹیل اور حواہر لال تقریر کرچکے تب حود گاندھی جی کو مداحلت کرنی پڑی.

کانگریس اپنے آپ کو اس طرح گرا کر ہتھیار ڈال دے، میرے لئے یہ ناقابل برداشت تھا. میں نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہا کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ واقعات کے ایک بہت ہی افسوسناک سلسلے کا نتیجہ ہے ہندوستان کا تقسیم ہوحانا ایک حاں کاہ حادثہ ہے اور ہم اپنی معذرت کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس سے بچنے کی امکانی کوشش کی لیکن ناکام رہے. پھر بھی ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ قوم ایک متحد قوم ہے اور اس کی تہذیب مشترک تہذیب کا نمونہ ہے اور رہے گی. چونکہ سیاسی اعتبار سے ہم ناکام رہے ہیں اس لئے ملک کو تقسیم کر رہے ہیں. ہمیں تسلیم کرلینا چاہئے کہ ہم نے شکست کھائی ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری معاشرت اور تہذیب تقسیم نہ ہونے پائے. پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے لیکن پانی حوں کا توں رہتا ہے اور چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم بھی غائب ہوحاتی ہے.

سردار پٹیل کو میری تقریر پسند نہیں آئی اور وہ اپنی تقریر میں بیشتر میری ہر بات کی تردید کرتے رہے. انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز کسی کمزوری یا مجبوری کی

ہیں اور ان سے اور ان کی پارٹی کے لوگوں سے ملنے خود پیشاور جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں اور خان بھائیوں کے دشمنوں نے بہت جلد مسٹر جناح کا دل ان دونوں کی طرف سے پھیر دیا خان عبدالقیوم خاں، جنھوں نے سرحد میں نئی وزارت بنائی تھی، ظاہر ہے یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ مسٹر جناح اور خان بھائیوں کے درمیان مصالحت ہوجائے۔ انھوں نے شروع ہی سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ مفاہمت اور مصالحت کی گنجائش نہ رہے ان کی حکومت نے خان بھائیوں کے ساتھ نہایت غیر مہذب اور غیر منصفانہ برتاؤ کیا اور خدائی خد متگاروں کو ہر طرح کے ناجائز اور غیر قانونی طریقوں سے ستانا شروع کیا۔ جمہوریت کو پامال کیا گیا اور استبداد کی عملداری ہوگئی ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے لیڈر جیل میں بند کر دئیے گئے، ان پر نہ الزام لگایا گیا نہ انھیں عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور وہ چھ سال تک قید میں پڑے گھلتے رہے خان عبدالقیوم خاں کی کینہ پروری نے اتنی شدت اختیار کی کہ خود مسلم لیگ کا ایک حصہ بیزار ہوکر یہ مطالبہ کرنے لگا کہ یا توخان بھائیوں کو رہا کر دیا جائے یا ان پر مقدمہ چلایا جائے بہرحال ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور قانون کا نام لے کر قانون اور انصاف کا خون کیا جاتا رہا

۱۴ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ میں اس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شرکت کرچکا ہوں مگر اب تک ایسے عجیب و غریب جلسے میں شرکت کی نوبت نہیں آئی تھی۔

طرح سے اُن تمام باتوں کی تردید بھی جو کانگریس اپنی ابتدا سے اتنک کہتی چلی آئی تھی۔ اس لئے اب گاندھی جی کو بحث میں شریک ہونا ضروری ہوگیا۔ انھوں نے ممبروں سے اپیل کی کہ ورکنگ کمیٹی کی تائید کریں انھوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ تقسیم کے مخالف رہے ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اب ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے سیاسی حقیقت شناسی کا تقاضا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن پلان کو تسلیم کرلیا جائے انھوں نے ممبروں سے اپیل کی کہ پنڈت پنت کی پیش کردہ تجویز کو منظور کرلیں۔

جب تجویز پر رائے لی گئی تو انتیس ممبروں نے اس کے حق میں اور پندرہ نے اس کے خلاف ووٹ دیا گاندھی جی کی اپیل بھی اس سے زیادہ لوگوں کو تقسیم کے حق میں رائے دینے پر آمادہ نہ کرسکی۔

تجویز تو منظور ہوگئی، لیکن لوگوں کا حال کیا تھا؟ تقسیم کے خیال ہی سے دل غمگین ہو رہے تھے۔ شاید ہی ایسا کوئی شخص ہوگا جس نے تحفظات ذہنی کے بغیر اِسے تسلیم کیا ہو۔ جن لوگوں نے تقسیم کو منظور کیا تھا خود ان کے جذبات اس کے خلاف تھے۔ اس سے بدتر وہ فتنہ انگیز فرقہ وارانہ پروپگنڈا تھا جس کا ہر طرف چرچا ہورہا تھا بعض حلقوں میں علانیہ یہ بات کہی جارہی تھی کہ پاکستان کے ہندوؤں کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہیں۔ اگر پاکستان کے ہندوؤں پر کسی طرح کا ظلم ہوا تو اس کا خمیازہ

کی وجہ سے پیش نہیں کی جارہی ہے بلکہ ملک کے موجودہ حالات میں مسائل کا صرف یہی ایک صحیح اور مفید حل ہے۔

اس عظیم الشان حادثے کی غمگین فضا بھی ہنسی کی باتوں سے بالکل خالی نہیں تھی۔ کانگریس میں برابر کچھ ایسے لوگ رہے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو قوم پرست ظاہر کیا ہے لیکن حقیقت میں ان کا نقطۂ نظر خالص فرقہ وارانہ ہے انھوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ ہندوستان کی کوئی مشترک تہذیب نہیں ہے اور کانگریس جو بھی کہے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ وہی ممبران جو اس طرح کے خیالات رکھتے تھے، دفعتاً متحد ہندوستان کے سب سے بڑے علم بردار بن کر پلیٹ فارم پر آئے۔

انھوں نے تجویز کی شدید مخالفت کی اور وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان کی قومی اور تہذیبی زندگی ناقابلِ تقسیم ہے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا اور مجھے اس میں ذرا بھر بھی شک نہیں تھا کہ جو کچھ وہ اب کہہ رہے تھے وہ سچ ہے لیکن میں یہ کیسے بھول جاتا کہ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے عمر بھر اس نظرئیے کی مخالفت کی تھی۔ تعجب کی بات تھی کہ اس آخری وقت میں انھیں لوگوں نے متحد اور ناقابل تقسیم ہندوستان کا نعرہ بلند کیا۔

پہلے روز کے مباحثے کے بعد لوگوں کا میلان ورکنگ کمیٹی کی تجویز کے سخت خلاف تھا لوگوں کو تجویز کو منظور کرنے پر نہ پنڈت پنت کا دل نشیں انداز آمادہ کرسکا اور نہ سردار پٹیل کی خطابت۔ وہ آمادہ ہوتے بھی کیسے جب کہ تجویز میں ایک

کانگریس کے صدر تھے انہوں نے ان سے بھی گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ یہ نظریہ بہت خطرناک ہے اور اگر اس نظریے کو بڑھنے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان میں ہندوؤں پر اور ہندوستان میں مسلمانوں پر سخت مظالم ہوں گے لیکن کرن شنکر رائے کی بات کسی نے بھی نہیں سنی بلکہ بہتوں نے ان کا مذاق اڑایا ان لوگوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ضمانت کا یہ نظریہ بھی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن ہے۔ کرن شنکر رائے مطمئن نہیں ہوئے اور میرے پاس آئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے انہوں نے ان کانگریسی لیڈروں کی یقین دہانیوں کو کوئی وقعت نہیں دی اور اپنی زندگی میں اپنے بدترین خدشات کو حقیقت بنتے دیکھ لیا

شروع میں برطانوی حکومت نے پندرہ مہینے کی مدّت مقرر کی تھی جس کے اندر اقتدار منتقل کرنے کی کارروائی مکمل ہونی تھی۔ ۲۰ فروری کو مسٹر ایٹلی نے واضح طور پر یہ بات کہی تھی کہ برطانوی حکومت کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ جون سنہ ۱۹۴۸ء تک ذمہ دار ہندوستانی ہاتھوں کو اقتدار سونپ دیا جائے۔ ۲۰ فروری اور ۳ جون کے درمیان بہت سے واقعات رونما ہوچکے تھے چونکہ تقسیم کا پلان منظور کیا جاچکا تھا اس لئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ اسے جلد از جلد عمل میں لے آنا چاہئے۔ ان کی اس خواہش میں کئی باتیں شامل تھیں۔ اول تو وہ چاہتے تھے کہ ذمہ داری جلد از جلد ہندوستانیوں کو سونپ

ہندوستان کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا.

آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں سندھ کے ممبروں نے اس تجویز کی بہت شدت سے مخالفت کی تھی انہیں ہر طریقے سے اطمینان دلایا گیا اور اگرچہ علانیہ یہ بات نہیں کہی گئی لیکن خانگی گفتگو میں ان سے یہاں تک کہا گیا کہ اگر پاکستان میں ان کے لئے کسی طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں یا انہیں ذلیل کیا گیا تو اس کا بدلہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیا جائے گا.

جب یہ باتیں پہلے پہل سے میں آئیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا. میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ ایک نہایت خطرناک جذبہ ہے جس کے نتائج بہت نقصان دہ ہوں گے اور نقصان کا سلسلہ دور تک جائے گا اس جذبے کی پشت پر یہ خیال تھا کہ ملک کی تقسیم اس شرط کے ساتھ تسلیم کی جارہی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اپنی اپنی طرف اقلیت کو یرغمال کے طور پر رکھیں گے، تاکہ ایک اقلیت دوسری اقلیت کی ضامن ٹھہرائی جاسکے مجھے اقلیتوں کے تحفظ کو انتقام پر منحصر کرنے کا یہ نظریہ بہت وحشیانہ معلوم ہوا بعد کے واقعات نے میرے اندیشوں کو حق بجانب ثابت کیا. تقسیم کے بعد نئی سرحد کے دونوں طرف خون کی جو ندیاں بہیں وہ یرغمال رکھنے اور انتقام لینے کے جذبے کا نتیجہ تھیں

کانگریس کے کچھ ارکان محسوس کرتے تھے کہ ایسے نظرئے کتنے خطرناک ہیں. بنگال کے ایک کانگریسی لیڈر، کرن شنکر رائے نے پہلی بار مجھے اس طرف توجہ دلائی. ان دنوں اچاریہ کرپلانی

ہوئے۔ پہلے صرف لاہور کے علاقے تک محدود تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ بڑھتے رہے اور راولپنڈی اور اس کے اطراف میں خون خرابہ ہونے لگا دراصل لاہور وہ میدان تھا جسے جیتنے کے لئے فرقہ پرست ہندو اور مسلمان لڑ رہے تھے ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں نے کانگریس کو اس کا قائل کرنا چاہا کہ لاہور کو ہندوستان میں رہنا چاہئے۔ ان کا کہنا تھا کہ پنجاب کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا مرکز لاہور ہے اور اگر یہ پاکستان میں چلا گیا تو پنجاب بے دست وپا ہو جائے گا. اس لئے بہت سے لوگوں نے کہا کہ لاہور کے معاملے کو بنیادی حیثیت دینا چاہئے۔ کانگریس نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ اس مسئلے کو وہاں کے باشندوں کی خواہش کے مطابق طے ہونا چاہئے۔

کچھ مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کا خیال تھا کہ لاہور کا مسئلہ تشدد کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ لاہور اور گرد ونواح میں جائدادوں کے مالک زیادہ تر ہندو تھے۔ کچھ مسلمانوں نے سمجھا کہ ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ ان کی ملکیت کو تباہ کیا جائے اور ان سے اقتصادی محاذ پر جنگ کی جائے چنانچہ وہ بغیر کسی امتیاز کے ہندوؤں کے کارخانوں کو جلانے اور مکانوں کو لوٹنے لگے۔ ہندوؤں کے ایک حصے نے اس کے جواب میں مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کردیا۔ ان کے پاس دولت تھی اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں کو لاہور سے بھگادینگے اور وہاں ہندوؤں کی اکثریت یقینی ہو جائے گی۔ یہ بات علانیہ کہی جاتی

دی جائے۔ دوسری طرف غالباً ان کو یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر اس کارروائی میں دیر ہوئی تو نئی رکاوٹیں پیدا ہوجائیں گی وہ کیبنٹ مشن کے پلان کا حشر دیکھ چکے تھے جس کی تعمیل میں دیر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دوبارہ سوچنے کا موقع مل گیا اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ پلان نامنظور ہوگیا۔

ماؤنٹ بیٹن نے اپنے واسطے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے کام کے لئے تین مہینے کی مدّت مقرر کی۔ کام آسان نہیں تھا میں نے کھلم کھلا اس پر شبہ ظاہر کیا کہ اتنی کم مدت میں اتنے پیچیدہ پلان کو پائہ تکمیل تک پہنچایا جاسکے گا۔ مجھے یہاں اس کارپردازی اور قابلیت کو خراج تحسین ادا کرنا چاہیے جس کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن نے اس کام کو سرانجام دیا انہیں تفصیلات پر اتنا عبور حاصل تھا اور معاملات پر اتنی جلد قابو پا لیتے تھے کہ تین ماہ کے اندر سارے مسئلے حل ہوگئے اور ١٤ اگست سنہ ١٩٤٧ء کو ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔

میں ایک دو مثالیں دے کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن نے کس پھرتی اور اعتماد کے ساتھ ان پیچیدہ مسائل کو حل کیا جو دو ریاستوں کو قائم کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوئے۔ جیسے ہی یہ بات طے پائی کہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے، ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مطالبات بڑھا چڑھا کر پیش کرنے شروع کئے ملک میں مختلف مقامات پر فسادات ہونے لگے۔ سنہ ١٩٤٦ء کے کلکتے کے قتل عام کے بعد، نواکھالی اور پھر بہار میں فساد ہوا پنجاب میں مارچ کے مہینے میں بلوے شروع

پیمائش کا کام ناممکن ہوگا اس کو اگر حولائی میں شروع کیا حائے تو صرف تین حار ہفتوں کی دیر ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حواب دیا کہ وہ ایک دن کے توقف پر بھی راضی نہیں ہیں اس لئے تین حار ہفتے کے التوا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہ ماؤنٹ بیٹن کی مستعدی اور کار پرداری کی ایک مثال ہے۔

ماؤنٹ بیٹن کے سامنے دوسرا مسئلہ حکومت ہند کے دفاتر اور اثاثہ کی تقسیم کا تھا حن صوبوں نے حوں کا توں کسی ریاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا، ان سے متعلق بھی دشواریاں تھیں مثلاً پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں سے متعلق کاغذات اور دستاویزات کا علیحدہ کرکے پاکستان بھیجنا تھا حو صوبے تقسیم ہوئے تھے ان کا مسئلہ اور بھی گنجلک تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بیشتر انتظامات اپنی نگرانی میں کرائے اور ایک کمیٹی حو اس مقصد کے لئے مقرر ہوئی تھی ہر معاملے کو حو بحث طلب ہوتا اُسی وقت طے کردیتی۔

مالیات اور فوح کی تقسیم کا معاملہ اور بھی مشکل تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن کی حوش تدبیری اور قوت عمل کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائی اور مالیات کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل بھی معینہ مدت کے اندر طے پا گئے۔

یہ بات طے پا چکی تھی کہ فوج کا تین چوتھائی حصہ ہندوستان کو اور ایک چوتھائی حصہ پاکستان کو ملے گا لیکن سوال یہ تھا کہ فوج کو بھی فوراً تقسیم کیا حائے یا اسے دو تین سال تک ایک ملی جلی کمان کے تحت رکھا جائے۔ فوج کے کمانڈروں

تھی کہ اس فرقہ وارانہ جنگ میں جہاں ایک فریق کا حملہ مال پر اور دوسرے کا جان پر تھا، طرفین کے فرقہ پرست لیڈر بالواسطہ یا بلا واسطہ شریک ہیں۔ چنانچہ یہ عام طور پر کہا اور صحیح مانا جاتا تھا کہ مرکزی اور صوبائی لیگ کے لیڈر ہندوؤں پر حملے کرنے کا انتظام کر رہے ہوئے اسی طرح ہندو مہا سبھا کے لیڈروں پر یہ الزام تھا کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسا رہے ہیں

بالکل ایسی ہی صورت حال کلکتے میں پیدا ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ کے حامی اصرار کر رہے تھے کہ کلکتے کو پاکستان میں شامل کیا جائے اور لیگ کے مخالفوں کو فکر تھی کہ ہندوستان میں رہے

یہ صورت حال تھی جب ماؤنٹ بیٹن بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی طرف متوجہ ہوئے یہ بات طے پا چکی تھی کہ صوبائی اسمبلی اس بات کا فیصلہ کریگی کہ صوبہ تقسیم کیا جائے یا جوں کا توں کسی ایک ریاست میں شامل رہے۔ پنجاب اور بنگال دونوں کی اسمبلیوں نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا اس لئے صوبوں کی نئی سرحدوں کا تعین ضروری ہو گیا اس کام کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک حدبندی کمیشن مقرر کیا اور مسٹر ریڈکلیف سے اس خدمت کو انجام دینے کے لئے کہا۔ مسٹر ریڈکلیف اس وقت شملہ میں تھے۔ انہوں نے اپنے تقرر کو منظور تو کرلیا لیکن ساتھ ہی تجویز کیا کہ پیمائش کا کام شروع جولائی سے کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ جون کی گرمی میں زمین کے معائنے اور

سے فوج فرقوں کی بنیاد پر تقسیم ہوگئی۔ مسلمان حصے پاکستان کو چلے گئے اور ہندو اور سکھ سب کے سب ہندوستان کو ملے نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ پسندی کا زہر فوج میں بھی پھیل گیا جو اب تک اس سے محفوظ تھی ۱۵ اگست کے بعد جب سرحدوں کے دونوں طرف بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون بہایا جانے لگا تو فوج کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ یہی نہیں، کچھ موقعوں پر تو فوج کے آدمی بھی اس لڑائی میں شریک ہوگئے

ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے غصے سے زیادہ غم کے لہجے میں کہا کہ فوج کے ہندوستانی سپاہی اور افسر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو قتل کرنے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ لیکن برطانوی افسروں نے بڑی مشکل سے انہیں روکے رکھا۔ یہ بیان ماؤنٹ بیٹن کا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ برطانوی فوج کے بارے میں ان کی روایت کسی حد تک درست تھی مگر یہ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سابقہ غیر تقسیم شدہ ہندوستانی فوج کے کچھ لوگوں نے پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو اور ہندوستان میں مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس طرح ہندوستانی فوج کی شاندار روایت کی خلاف ورزی ہوئی اور اس کے قابل فخر ریکارڈ پر پر ایک دھبہ لگ گیا۔

میری رائے تھی کہ ملازموں کو بھی فرقہ واری بنیاد پر نہ تقسیم کیا جائے۔ سیاسی حالات نے ہمیں تقسیم کو ماننے پر مجبور کیا تھا۔ سرکاری افسروں کو ان کے علاقوں سے ہٹانے کی کوئی وجہ نہیں تھی میری رائے تھی کہ ہر صوبے کے ملازمین

کا یہ مشورہ تھا کہ فی الحال جنرل اسٹاف مشترک رہے۔ میں ان کی دلیلوں سے متاثر ہوا اور میں نے ان کی حمایت کی۔ ماؤنٹ بیٹن کی دلیلوں کے علاوہ میری سمجھ میں کچھ اور باتیں بھی آئی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تقسیم کے ساتھ فسادات بھی شروع ہوں گے اور ایسی صورت میں ایک مشترکہ فوج ہندوستان کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہم تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں فوج کو فرقہ وارانہ نہج پر تقسیم نہ کرنا چاہئیے اب تک فوج میں کبھی فرقہ وارانہ جذبات نمودار نہیں ہوئے تھے اور اگر اسے سیاست سے دور رکھا جاتا تو اس کی ڈسپلین اور غیر جانب داری پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے مشترکہ کمان کے قیام پر زور دیا اور میں اس بات کو ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن نے میری پوری حمایت کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فوج ایک مشترکہ کمان کے تحت رہی ہوتی تو آزادی کے بعد خون کی جو ندیاں بہیں وہ ہرگز نہ بہتیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرے ساتھی مجھ سے متفق نہیں تھے اور انہوں نے میری مخالفت کی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت ڈاکٹر راجندر پرشاد کی مخالفت پر ہوئی۔ وہ ایک امن پسند آدمی تھے۔ جن کا مسلک عدم تشدد تھا۔ مگر اب انہیں کو فوج کی تقسیم پر سب سے زیادہ اصرار تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک دن کے لئے بھی فوج کو مشترکہ کمان کے تحت نہ رکھنا چاہئیے، نہ اسے رکھا جا سکے گا۔

میرے خیال میں یہ بہت نقصان دہ فیصلہ تھا۔ اس کی وجہ

چاہیں وہ انھیں واپس لینے کی ذمہ دار ہوں گی. افسوس ہے کہ اس وعدے کے باوجود عام طور پر دونوں ریاستوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ جنھوں نے عارضی انتخاب کیا تھا، منصفانہ سلوک نہیں کیا.

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں مسلم لیگ نے نادانی اور کوتہ اندیشی سے کام لیا. اس نے سارے مسلمان افسروں کو ہندوستان چھوڑنے اور پاکستان کو منتخب کرنے پر اکسایا. اس وقت مرکزی محکموں کے بہت سے اہم عہدوں پر مسلمان مامور تھے لیگ نے ان سب پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دیں جو اس پر رضامند نہیں ہوئے انھیں اس کے متعلق افواہیں پھیلا کر ڈرایا گیا کہ جب کانگریس پورے طور پر برسرِ اقتدار آجائے گی تو ان کا کیا حشر ہوگا. ان افواہوں سے مسلمان سرکاری ملازموں میں کسی قدر بے چینی پیدا ہو رہی تھی، اس لئے میں نے حکومت ہند پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس بارے میں ایک اعلان کے ذریعے اپنا رویہ واضح کردے. لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نے میری پورے طور پر تائید کی اور ایک اعلان جاری ہو ہی گیا جس میں مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے سرکاری ملازموں کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ہندوستان میں رہے تو انھیں نہ صرف ان کے حقوق ملیں گے بلکہ ان کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا جائے گا.

اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی افسروں کی ڈھارس بندھ گئی اور انھوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرلیا. جب مسلم لیگ

کو اسی صوبے میں رہنا چاہئے. یعنی مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال کے افسر چاہے جس فرقے کے ہوں، پاکستان میں رہیں اور جو ملازمین ہندوستانی صوبوں میں تھے، بلا امتیاز مذہب ہندوستان میں رہیں. میں سمجھتا تھا کہ اگر ملازمتوں کو ہی فرقہ واریت سے پاک رکھا جائے تو دونوں ریاستوں کی فضا زیادہ بہتر رکھی جا سکے گی حکومت فرقہ پرستی کے زہر سے محفوظ رہے گی اور ریاستوں کی اقلیتیں زیادہ اطمینان محسوس کریںگی. مجھے افسوس ہے کہ میری دلیلیں اور منت سماجت سب ناکام رہیں اور یہ فیصلہ ہوا کہ ہر سرکاری ملازم کو یہ حق دیا جائے کہ ہندوستان پاکستان دونوں میں سے کسی ریاست کی ملازمت پسند کرلے. نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سارے ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان میں اور مسلمانوں نے پاکستان میں جانا پسند کیا.

میں نے اس مسئلے پر ماؤنٹ بیٹن سے تفصیلی گفتگو کی اور انھیں فوج اور ملازمتوں کی تقسیم کے خطرناک اِمکانات کی طرف توجہ دلائی انھیں مجھ سے اتفاق تھا اور انھوں نے حتی‌الامکان میری حمایت کی. فوج کے معاملے میں انھیں بالکل کامیابی نہیں ہوئی. لیکن ملازمتوں کے معاملے میں ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ افسروں کو حق دیا گیا کہ وہ چاہیں تو مستقلاً یا عارضی طورپر کسی ریاست کو منتخب کرلیں. مستقلاً فیصلہ کرنے والوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن عارضی طور پر فیصلہ کرنے والوں کو چھ ماہ کے اندر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا اختیار دیا گیا. دونوں ریاستوں نے وعدہ کیا کہ جو لوگ واپس آنا

نئی ریاست میں مسلمانوں کو ہر طرح کا فائدہ حاصل ہوگا. اگر اسی کے ساتھ کچھ مسلمان ہندوستان کی ملازمت میں رہتے تو اس سے انہیں ذاتی طور پر فائدہ پہنچنے کے علاوہ ان کی جماعت کے لئے بہت سود مند ثابت ہوتا. کچھ صاحب اختیار مسلمانوں کی موجودگی سے ان کی جماعت میں اعتماد پیدا ہوتا اور بہت سے بے بنیاد خدشے دور ہوجاتے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تقسیم پر اصرار کر کے لیگ نے کتنی نادانی کا ثبوت دیا تھا مسلمان افسروں کے بارے میں لیگ کا رویہ اس نادانی کی ایک اور مثال تھی.

یہ طے پایا تھا کہ ہندوستان ایک ڈومینین کی حیثیت سے ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو وجود میں آئے گا. مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کا قیام ایک روز پہلے یعنی ۱۴ اگست کو عمل میں آئے. ان دونوں کے قیام کے سلسلے میں ایک ناخوش گوار واقعہ ہوا. برطانوی کامن ویلتھ میں ایک دستوری رسم ہوگئی تھی کہ ہر ڈومینین خود اپنا گورنر جنرل منتخب کرے اور بعض نے اپنے شہریوں کو اس عہدے پر مامور کیا تھا. ہندوستان بھی چاہتا تو اپنے کسی شہری کو اپنا پہلا گورنر جنرل بناتا. لیکن ہم لوگوں نے طے کیا کہ اچانک تبدیلی کرنا مناسب نہ ہوگا اور اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کو گورنر جنرل منتخب کیا جائے تو اس سے انتظامی امور اور پالیسی میں ایک طرح کا تسلسل رہے گا. ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ شروع میں دونوں ڈومینینوں کا ایک ہی گورنر جنرل ہو اور جو تبدیلی مقصود ہو وہ بعد کو کی جائے.

کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان افسروں کو توڑنے کی مہم شروع کی۔ یہ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں یوں ہی کیا کم ہراساں تھے۔ اب لیگ نے انہیں یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ہندوستان میں رہے تو پاکستان انہیں اپنا دشمن تصور کرے گا اور انہیں ہر ممکن طریقے سے ستائے گا۔

ان افسروں میں بہت سے ان صوبوں کے تھے جو پاکستان میں شامل ہونے والے تھے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مسلم لیگ کے لیڈر پاکستان میں ان کے اعزا اور ان کی ملکیت کو نقصان پہنچا کر بدلہ لیں گے تو وہ بہت پریشان ہوئے خود میری منسٹری میں کئی مسلمان افسر اہم جگہوں پر تھے جنہوں نے میری یقین دہانیوں پر ہندوستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا لیکن جب لیگ نے ڈرانا دھمکانا شروع کیا تو ان میں سے کئی میرے پاس آئے اور آبدیدہ ہوکر کہا کہ اگرچہ ہم نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن مسلم لیگ کی اس دھمکی کے بعد ہمارا یہاں ٹھہرنا ناممکن ہے ہمارے خاندان کے سارے لوگ مغربی پاکستان میں ہیں اور ہم یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ انہیں تکلیف پہنچے۔ اس لئے ہم پاکستان کو منتخب کرنے پر مجبور ہیں۔

مسلم لیگ کا مسلمان افسروں کو ہندوستان سے پاکستان بھگا دینا نادانی کا فعل تھا اور اس سے نقصان ہی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہندوستان کو مجموعی طور پر اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا خود مسلمانوں کو۔ اب جو تقسیم کو منظور کیا جاچکا تھا، پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا تو یہ بات ظاہر تھی کہ اس

تقسیم شدہ ہندوستان

ان اوراق میں جو کہانی میں بیان کرنا چاہتا تھا یہ اس کا آخری
رات ہے ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئی
ریاست پاکستان کا افتتاح کرنے کراچی گئے دوسرے ہی روز صبح
دلی لوٹ آئے اور پندرہ اگست کو بارہ بجے رات کے وقت
ہندوستان کی ڈومینین وجود میں آئی

ملک آزاد ہو گیا تھا لیکن عوام آزادی اور کامیابی کا پورا لطف
نہ اٹھا سکے دوسرے دن جب ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے
دیکھا کہ آزادی کے ساتھ ایک بہت المناک حادثہ واقع ہوا ہے
ہم نے بھی محسوس کیا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے جہاں
ہم ٹھہر کر آرام کرسکیں گے اور آزادی کی نعمتوں سے مستفیض
ہوسکیں گے، ایک لمبا اور سنگلاخ راستہ طے کرنا ہوگا.

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کو تسلیم کیا تھا.
چونکہ کانگریس ساری قوم کی نمائندہ جماعت تھی اور مسلم لیگ
کو کافی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی اس لئے قاعدے کے مطابق
اس کا یہ مطلب ہونا چاہئے تھا کہ سارے ملک نے تقسیم کو مان
لیا ہے. لیکن اصل صورت حال بالکل ہی اور تھی.

جب ہم نے تقیسم کے فوراً قبل اور فوراً بعد سارے ملک پر نگاہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ پاکستان کے فیصلے میں بڑی یہ باتیں ملحوظ ہوں گی.

اس بنا پر ہم نے اعلان کردیا کہ ہم نے گورنر جنرل کے عہدے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو منتخب کیا ہے. اُمید یہ تھی کہ لیگ بھی انہیں کو منتخب کرے گی لیکن عین وقت پر لیگ نے یہ تجویز کرکے کہ مسٹر جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل منتخب کیا جائے، سب کو حیرت میں ڈال دیا. لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب یہ سنا تو انہوں نے ہم سے کہا کہ اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے اور تجویز کیا کہ ہم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور کسی ہندوستانی کو اس عہدے پر مامور کریں لیکن ہمیں اپنا فیصلہ بدلنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آئی اور ہم نے پھر کہہ دیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی ڈومینین کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے

جن لوگوں کے مشتعل جذبات نے انہیں تقسیم کا حامی بنا دیا تھا وہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ ان کے عمل کے نتیجے کیا ہوں گے۔

کانگریس کے لیڈروں میں تقسیم کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل تھے لیکن یہ بھی تقسیم کو ہندوستان کے مسائل کا بہترین حل نہیں تصور کرتے تھے درحقیقت انہوں نے اپنی پوری طاقت سے تقسیم کی حمایت صرف جھنجھلاہٹ اور احساس خودداری کو ٹھیس پہنچنے کی وجہ سے کی تھی انہوں نے دیکھا کہ لیاقت علی خاں بحیثیت وزیر مالیات ان کی ہر تجویز رد کرکے انہیں قدم قدم پر زچ کردیتے ہیں اس لئے انہوں نے تنگ آکر فیصلہ کیا تھا کہ اگر تقسیم کے سوا چارہ نہیں ہے تو ملک کو تقسیم ہو جانا چاہئے انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی نئی ریاست میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہوگی اور وہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکے گی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ پاکستان کو تسلیم کرکے مسلم لیگ کی سخت تادیب کی جا سکے گی پاکستان کی ریاست تھوڑے ہی عرصے میں بیٹھ جائے گی اور جو صوبے ہندوستان سے الگ ہوئے ہونگے اُنہیں بے پناہ مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا

ملک کی تقسیم کے بارے میں عام لوگوں کے رویہ کا اصل امتحان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا جب آزاد پاکستان قائم ہوا۔ اگر عوام نے تقسیم کو قبول کیا ہوتا تو پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال کے ہندو اور سکھ ویسی ہی خوشی مناتے جیسے کہ وہاں کے مسلمان منارہے تھے۔ مگر ان صوبوں سے جو اطلاعات ہم

ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک رزولیوشن اور مسلم لیگ کے رجسٹر میں اس کا اندراج ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے عوام نے تقسیم کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کا دل، ان کی روح اس ظلم پر چلا اٹھی تھی میں نے ابھی کہا ہے مسلم لیگ کو کافی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن مسلمانوں کا ایک کافی بڑا حصہ ایسا تھا جس نے ہمیشہ لیگ کی مخالفت کی تھی ظاہر ہے تقسیم کے فیصلے سے ان لوگوں کو گہرا رحم لگا۔ جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق تھا اُن میں سے ہر ایک تقسیم کے خلاف تھا اور کانگریس کے تقسیم کو مان لینے کے باوجود ان کی مخالفت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا اب جو تقسیم عملی حقیقت بن گئی تو خود مسلم لیگ کے بہت سے حامی اس کے بھیانک نتائج کو دیکھ کر دہشت کھا گئے اور کھلم کھلا یہ کہنے لگے کہ تقسیم سے ان کی مراد یہ نہیں تھی۔

آج دس برس بعد جب میں ان ساری باتوں پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں۔ کہ واقعات نے ہر اس بات کی تصدیق کی ہے۔ جو اس وقت میں نے کہی تھی مجھے اس وقت بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس کے لیڈروں نے تقسیم کو آزادی کے ساتھ اور کھلے دل سے نہیں مانا ہے۔ ان میں سے کچھ تو خالی غصہ میں اور تنگ آکر اور کچھ بالکل مایوس ہو کر اس پر راضی ہو گئے تھے۔ جب دلوں پر غم اور غصہ یا خوف کا جذبہ حاوی ہو جائے تو لوگوں میں حقائق پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔

سے میرے دوستوں اور ساتھیوں نے میری حمایت نہیں کی. حقیقت سے اس عجیب چشم پوشی کا صرف ایک سبب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ غصہ اور مایوسی نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دئے تھے. غالباً ایک خاص تاریخ یعنی ١٥ اگست کے یقین نے ان پر ایسا جادو کیا کہ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کی ہر بات بغیر سوچے سمجھے تسلیم کر لی

حالت ایسی تھی کہ درد بھی ہوتا تھا اور ہنسی بھی آتی. سب سے مضحکہ خیز مسلم لیگ کے ان لیڈروں کی کیفیت تھی جو تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ گئے تھے مسٹر جناح اپنے ساتھیوں کو یہ پیغام دے کر کراچی کے لئے روانہ ہوگئے کہ اب جو ملک تقسیم ہوگیا ہے تو انہیں ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہنا چاہئے اس الوداعی پیغام نے ان کے اندر کمزوری اور مایوسی کا ایک عجیب احساس پیدا کر دیا. ١٤ اگست کے بعد ان میں سے بہت سے لیڈر مجھ سے ملنے آئے. ان کی حالت پر رحم آتا تھا ان میں سے ہر ایک نے سخت افسوس اور غصے کے ساتھ مجھ سے کہا کہ جناح نے انہیں دھوکا دیا ہے اور عین وقت پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا. پہلے پہل میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ جناح نے انہیں دھوکا دیا؟ انہوں نے تو صاف صاف مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا اب پاکستان بن گیا تھا اور مشرق اور مغرب دونوں طرف مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہوگئے تھے. پھر آخر یہ مسلم لیگ

تک پہنچیں ان سے اس دعوے کا کھوکھلاپن ظاہر ہو گیا کہ کانگریس کا تقسیم کو مان لینا قوم کے مان لینے کے برابر ہے۔

۱۴ اگست پاکستان کے مسلمانوں کے لئے جشن کا دن تھا، ہندوؤں اور سکھوں کے لئے سوگ اور ماتم کا۔ یہ کیفیت صرف عام لوگوں کی نہیں تھی بلکہ کانگریس کے اہم لیڈر بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ ان دنوں آچاریہ کرپلانی کانگریس کے صدر تھے۔ یہ سندھ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے ۱۴ اگست کو ایک بیان شائع کیا کہ آج کا دن ہندوستان کے لئے تباہی اور ماتم کا دن ہے۔ پاکستان کے ہندوؤں اور سکھوں نے کھلے بندوں اس جذبے کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ ہماری قومی جماعت نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا تھا لیکن سارا ملک اس کی وجہ سے دکھی ہو گیا تھا

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں میں تقسیم کے خیال سے غصہ اور غم کے ایسے جذبات پیدا ہوئے تھے تو انہوں نے اسے کیوں منظور کیا؟ انہوں نے اور زیادہ سختی سے اس کی مخالفت کیوں نہیں کی؟ انہیں کیا جلدی تھی کہ ایسا فیصلہ کرلیا جسے تقریباً ہر شخص غلط سمجھتا تھا؟ مانا کہ ۱۵ اگست تک ہندوستان کے مسائل کا کوئی مناسب حل نہیں نکل سکا تھا لیکن اس کی وجہ سے ایک غلط فیصلہ کر لینے اور پھر ہائے ہائے کرنے کے کیا معنی؟ میں برابر کہتا رہا تھا کہ اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب تک کہ کوئی بہتر حل سمجھ میں آئے۔ میرے بس میں جو کچھ تھا میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی

دل میں غصہ اور جلن پیدا کردی تھی۔

مسلم لیگ کے یہ لوگ برابر کہتے رہے کہ اب وہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ بات ایسی بد سی تھی کہ ان واقعات پر وہ جو اظہار غم کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے انہیں وہ بات یاد دلائی جو میں نے کیبنٹ مشن کے زمانے میں کہی تھی۔ ١٥ اپریل کو میں نے ایک بیان دیا تھا جس میں، میں نے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت صاف لفظوں میں آگاہ کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہوا تب ان کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھیں گے کہ اکثریت والے علاقوں کے پاکستان میں شامل ہوجانے کے بعد بھی وہ ہندوستان ہی میں رہیں گے مگر ان کی حیثیت ایک ادنیٰ اور حقیر اقلیت کی سی ہوجائے گی۔

١٥ اگست کو آزادی کی پہلی صبح کا خیر مقدم کرنے کے لئے خاص پروگرام مرتب کیا گیا تھا رات کے بارہ بجے مجلس دستور ساز کا جلسہ ہوا اور اس میں اعلان کیا گیا کہ اب ہندوستان آزاد ہوکر ایک خود مختار ریاست بن گیا ہے نو بجے صبح کو اس مجلس کا دوبارہ جلسہ ہوا جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے افتتاحیہ تقریر کی۔ سارے شہر پر ایک ہنگامہ خیز خوشی طاری تھی تھوڑی دیر کے لئے تو تقسیم کے کرب کا احساس بھی مٹ گیا شہر اور آس پاس کے علاقوں سے لاکھوں آدمی آزادی کو خوش آمدید کہنے کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔ چار بجے شام کو آزاد ہندوستان کا پرچم بلند ہونے والا تھا۔ اگست کی تپتی ہوئی دھوپ کے باوجود لاکھوں آدمی جمع ہوئے بلکہ گھنٹوں پہلے

کے نمائندے کیوں کہہ رہے تھے کہ انہیں دھوکا دیا گیا؟

ان سے گفتگو کرتے وقت مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ذہن میں تقسیم کی ایک ایسی تصویر تھی جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ در اصل یہ لوگ پاکستان سے کے نتائج کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہوجائیں گے تو بقیہ صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ہندوستان میں شامل رہیں گے۔ یو۔ پی اور بہار کے مسلمانوں کو تو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان ہی میں رہنا تھا، اس لئے کہ وہ اقلیت میں تھے۔ یہ بات تو عجیب ہے مگر واقعہ یہی ہے کہ مسلم لیگ کے ان لیڈروں نے حماقت میں اپنے دل میں سمجھ لیا کہ پاکستان بن جانے کے بعد سارے مسلمان چاہے وہ اکثریت کے علاقے کے ہوں، یا اقلیت کے، ایک قوم تصور کئے جائیں گے اور انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہوگا۔ لیکن اب جو مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہوگئے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی ہوگئی اور مسٹر جناح کراچی کے لئے روانہ ہوگئے، تو آخرکار انہیں احساس ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی وجہ سے وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ جناح کا الوداعی پیغام ایک ذرا سی چوٹ تھی جس نے انہیں چت کردیا۔ اب یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ تقسیم کا واحد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اقلیت کی حیثیت سے وہ اور بھی کمزور ہوگئے ہیں اس پر طرہ یہ کہ انہوں نے اپنی نادانی کی حرکت سے ہندوؤں کے

مدد کی امید نہیں کی جاسکتی. ان کا مطالبہ تھا کہ وہاں کے لئے دلّی سے فوج بھیجی جائے.

پہلے دلّی میں فسادات نہیں ہوئے. لیکن جب چاروں طرف ملک میں قاتلانہ شعلے بھڑک رہے تھے، دلّی میں جو تھوڑی بہت ریزرو فوج تھی اس کا وہاں سے ہٹانا مصلحت کے خلاف تھا ہم لوگوں نے طے کیا کہ دوسرے مقامات سے فوج بلائی جائے لیکن فوج کے پہنچنے سے قبل فسادات کی آگ دارالسلطنت تک پہنچ گئی [illegible] کی [illegible] ان کے پیچھے [illegible] آگئے [illegible] کا [illegible] شروع ہوگیا. معلوم ہوا تھا کہ تہرے قاتلوں کا قصہ ہے فسادات صرف ان حصوں تک نہیں محدود رہے جہاں ریفیوجی آباد تھے یا جہاں عام لوگ رہتے تھے بلکہ وہ علاقے بھی لپیٹ میں آگئے تھے جہاں صرف سرکاری ملازم رہتے تھے جب مغربی پنجاب کی خونریزیوں کی خبریں دہلی پہنچیں تو دلّی کے فساد پسند عناصر کی قیادت میں لوگوں کے ہجوم نے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا دلّی میں کچھ سکھوں نے ان قاتلانہ حملوں کی تنظیم میں بہت نمایاں حصہ لیا.

میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں کہ یرغمالوں اور انتقامی کارروائیوں کے خطرناک نظریے کے بارے میں جو غیر ذمہ دارانہ باتیں ہوئی تھیں ان کی وجہ سے میں کس قدر پریشان اور فکرمند ہوگیا تھا. دلی میں ہم نے اس نظریے پر ایک بھیانک طریقے سے عمل درآمد ہوتے ہوئے دیکھا اگر مغربی پنجاب کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں

سے بے پناہ گرمی میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ایسا اژدہام
تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کار سے باہر نہیں نکل پائے اور مجبوراً
اسی کے اندر سے تصویر کرنی پڑی

خوشی سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی یہ حالت
اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ نہ رہی دوسرے ہی روز سے فرقہ وارانہ
فسادات کی خبریں دارالسلطنت پر افسردگی کے بادل بن کر چھا گئیں
یہ خبریں قتل، موت اور ایذا رسانی کی تھیں معلوم ہوا کہ مشرقی
پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملے کیے
ہیں مکان جلا رہے ہیں اور بے گناہ مردوں عورتوں اور بچوں
کو قتل کر رہے ہیں بالکل ایسی ہی خبریں مغربی پنجاب سے
آ رہی تھیں۔ وہاں مسلمان اسی طرح ہندو اور سکھ مرد عورتوں اور
بچوں کو اندھا دھند قتل کر رہے تھے۔ غرضکہ پورا پنجاب اس
قتل و غارت کی وجہ سے قبرستان بنتا جا رہا تھا۔ وارداتیں بہت
تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں۔ پنجاب کے وزیر
دوڑ دوڑ کر دلی آ رہے تھے ان کے پیچھے مقامی کانگریس
کے لیڈر آئے تھے۔ جو غیر سرکاری لوگ تھے یہ سب ان واقعات
سے دہشت زدہ تھے، جو پنجاب میں رونما ہو رہے تھے خون
خرابہ اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا کہ ان کے ہوش و حواس
گم تھے اور مایوسی کے عالم میں وہ کہہ رہے تھے کہ شاید یہ
کسی طرح روکا نہ جا سکے گا ہم نے پوچھا کہ آپ لوگ فوج
سے کیوں نہیں مدد لیتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ پنجاب میں
جو فوج ہے وہ قابل اعتبار نہیں رہی ہے اور اس سے کچھ بہت

دوسرے دن وہ زندہ پلنگ سے اٹھے گا۔

ان قتل و غارت کے دنوں میں، میں نے فوجی افسروں کے ساتھ دلی کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا میں نے دیکھا کہ مسلمان بالکل پست ہوگئے ہیں اور بے بسی کا احساس ان کی طبیعتوں میں سرایت کر گیا ہے۔ بہتوں نے میرے مکان میں پناہ مانگی شہر کے مشہور اور امیر خاندان کے لوگ میرے پاس محتاجی کے اس عالم میں پہنچے کہ تن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا ان میں سے بہت سے تو دن کی روشنی میں نکلتے ڈرتے تھے اور وہ بیچ رات یا صبح تڑکے فوجی پہرے کے ساتھ میرے گھر تک لائے گئے جب میرا مکان بھر گیا تو میں نے اپنی چہار دیواری کے اندر خیمے لگوا دئیے مرد، عورتیں، امیر، غریب، نوجوان اور بوڑھے، غرض کہ ہر قسم کے لوگ موت کے ڈر سے یہاں ہاتھ پاؤں سمیٹ کر جمع ہوگئے تھے۔

یہ بات جلد ہی معلوم ہوگئی کہ امن قائم ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ مختلف علاقوں میں دور دور پھیلے ہوئے مکانوں کی حفاظت ناممکن تھی اگر ہم ایک علاقے میں پہرے کا انتظام کرتے تو کسی دوسرے علاقے میں حملے ہونے لگتے۔ اس لئے یہ طے پایا کہ سارے مسلمانوں کو یکجا کر کے انہیں محفوظ کیمپوں میں رکھ دیا جائے ایسا ایک کیمپ پرانے قلعے میں قائم کیا گیا یہاں اب عمارت کوئی نہیں ہے۔ صرف برجیاں باقی رہ گئی ہیں جلد ہی یہ بھر گئیں بہت سے مسلمان یہاں لائے گئے اور انہوں نے تقریباً پوری سردیاں انہیں برجیوں میں گزار دیں۔

کو قتل کررہے تھے تو دلی کے بے قصور مسلمانوں سے اس کا بدلہ کیوں لیا جائے؟ یرغمالوں اور انتقام کا یہ نظریہ اس قدر ظالمانہ تھا کہ کوئی بھی صحیح دماغ کا اور شائستہ انسان اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہنا پسند نہیں کرے گا.

فوجیوں کا رویہ بھی اب ایک مسئلہ بن گیا تھا تقسیم سے پہلے یہ فرقہ وارانہ منافرت سے پاک تھی. لیکن جب فرقوں کی بنیاد پر ملک تقسیم ہوا تو منافرت کے جراثیم فوج میں بھی داخل ہوگئے. دلی میں جو فوج تھی اس میں زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے. چند ہی روز کے اندر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اگر شہر میں امن قائم رکھنے کے لئے سخت کارروائی کی گئی تو یہ دلی کی فوج کے لئے بہت سخت آزمائش کا باعث ہوسکتی ہے اس لئے ہم نے جنوب سے فوج بلانے کی کارروائی کی اس پر ملک کی تقسیم کا اثر نہیں پڑا تھا اور اس میں سپاہیانہ فرماں برداری کا جذبہ موجود تھا جنوب سے آئے ہوئے ان سپاہیوں نے دار السلطنت کے فسادات کو رفع کرنے اور امن قائم کرنے میں بہت اہم حصہ لیا

خاص شہر کے علاوہ قرول باغ، لودھی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار جیسے علاقے تھے جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی، ان تمام علاقوں میں جان و مال محفوظ نہیں رہے تھے اور جو حالات تھے ان میں فوج کے ذریعے حفاظت کا پورا انتظام نہیں کیا جاسکتا تھا. ایک وقت تو اس کی نوبت آگئی کہ کوئی مسلمان اپنے گھر میں رات کو اس یقین کے ساتھ نہیں سو سکتا تھا کہ

اور مشکل منصوبے کو سر انجام دیا، اس کی طرف میں پہلے
بھی اشارہ کرچکا ہوں. اب انہوں نے ملک میں امن و امان قائم
کرنے میں اور بھی زیادہ مستعدی اور سرگرمی دکھائی ان کی
فوجی تربیت بڑے آڑے وقت کام آئی میرا خیال ہے کہ شاید
ان کی قیادت اور ان کے فوجی تجربے کے بغیر ہم حالات پر اتنی
جلدی اور اتنے موثر طریقے سے قابو نہ پاسکتے تھے. انہوں نے کہا
کہ یہ حالت بالکل جنگ کی سی ہے اور اس میں دوران جنگ کے
طریقوں پر عمل کرنا چاہئے جنگ کے زمانے میں ہنگامی کونسلیں
چوبیس گھنٹے کام کرتی ہیں ہمیں ایک عملی کونسل بنانی چاہئے
جو ہر معاملے کے پیش ہوتے ہی اس کے متعلق فیصلہ کرے اور
یہ بھی دیکھے کہ اس پر عمل درآمد ہوتا ہے. چنانچہ ایک
ہنگامی بورڈ بنایا گیا. جس میں کابینہ کے کچھ ممبر اور کچھ
اونچے درجے کے فوجی اور سول افسر رکھے گئے. روزانہ
ساڑھے نو بجے صبح کو اس بورڈ کا اجلاس کابینہ کے دفتر میں
ہوتا تھا جس کی صدارت خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کرتے تھے پچھلے
چوبیس گھنٹوں میں جو احکام جاری ہوتے اور ان پر جو عمل ہوتا
اس کا جائزہ لیا جاتا جب تک امن پوری طرح دوبارہ قائم نہیں
ہوا. یہ بورڈ بغیر کسی وقفے کے برابر کام کرتا رہا اس کے
سامنے روز صبح کو جو اطلاعات آتیں ان سے صورت حال کی
نزاکت کا اور خطرے کا اندازہ ہوجاتا تھا

ایک اچھے حاکم کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ ذاتی پسند و
ناپسند کو نظر انداز کرکے ہر ایک کی جان و مال کی حفاظت

فسادات کے زمانے میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کئی اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کئے گئے تھے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انتخاب اچھا ثابت نہیں ہوا اور ان میں سے بعض نے اپنے فرض کی ادائیگی میں بڑی کوتاہی کی۔ ایک مجسٹریٹ کے بارے میں تو مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک روز ایک ہندو کانگریسی اس کے پاس مدد کے لئے آیا اس نے بتایا کہ مسلمانوں کے ایک علاقے پر حملے کا اندیشہ ہے اور بعض خاندانوں کے لئے جان کا خطرہ ہے۔ مجسٹریٹ نے ضروری کارروائی کے بجائے اس کانگریسی پر بے حس ہونے کا الزام لگایا اور کہا کہ اسے تعجب ہے کہ کوئی ہندو مسلمانوں کے لئے مدد مانگنے آتا ہے۔

اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف لوگوں پر اس بحران کا کیا اثر ہوا لیکن اگر کچھ اسپیشل مجسٹریٹ اور کانگریسی اپنے منصب کے ناقابل نکلے تو دلی کے زیادہ تر کانگریسیوں نے اس سخت آزمائش کے موقع پر اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا کانگریس کے ہندو اور سکھ ممبر اپنے فرقہ پرست ہم مذہب لوگوں کی طعن و تشنیع کے باوجود ثابت قدم اور اپنے قوم پرست اصولوں پر قائم رہے

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کو عمل میں لانے کے لئے جو کچھ کیا اس پر میں اعتراض کرچکا ہوں لیکن اس بحران کے زمانے میں جس طرح انہوں نے حالات پر قابو حاصل کیا اس پر مجھے ان کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ انہوں نے جس سرگرمی اور مستعدی سے ملک کی تقسیم کے پیچیدہ

کے لئے اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے جی توڑ کوشش کی۔ انہیں اس سے بڑی پریشانی اور تکلیف ہوئی۔ ان کی کوششوں کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جس کی انہیں اُمید تھی اکثر وہ جواہر لال، سردار پٹیل اور مجھ کو بلا بھیجتے اور شہر کا حال دریافت کرتے۔ اُنہیں یہ دیکھ کر اور بھی رنج ہوا کہ خود ہم لوگ اس بارے میں متفق نہیں ہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے

سچ یہ ہے کہ میرا اور جواہر لال کا رویہ سردار پٹیل کے رویے سے مختلف تھا۔ اِس اختلاف کا اثر مقامی حکام پر پڑ رہا تھا اور یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ ان حکام میں بھی دو گروہ بن گئے ہیں۔ بڑا گروہ سردار پٹیل کی نظریں دیکھتا ہے، اس لئے کہ وہ وزیر داخلہ تھے، اور وہ وہی کرنا چاہتا تھا جس سے سردار پٹیل خوش ہوتے۔ دوسرے چھوٹے گروہ کی نظریں میری اور جواہر لال کی طرف اُٹھی تھیں اور یہ جواہر لال کے احکام بجا لانے کی کوشش کرتا تھا ان دنوں دلیؔ کے چیف کمشنر ایک مسلمان، خورشید احمد تھے جو صاحب زادہ آفتاب احمد کے بیٹے تھے۔ بحیثیت افسر یہ مضبوط آدمی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ ڈر بھی تھا کہ اگر انہوں نے سختی کی تو ان پر مسلمانوں کی طرفداری کا الزام لگایا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف نام کے افسر اعلیٰ تھے اور ڈپٹی کمشنر ساری کارروائیاں اپنی صواب دید کے مطابق کرتا تھا یہ افسر سکھ تھا لیکن سکھوں کے رسم و رواج کی بہت سی باتوں پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اُس نے

کا ضامن ہوجائے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک زمانے میں
جواہر لال نے ایک سچے حاکم کی ان صلاحیتوں کا بہت نمایاں
ثبوت دیا۔ جس روز سے انہوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی،
انہوں نے محسوس کرلیا کہ حکومت کو شہریوں کے درمیان کسی
قسم کی تفریق نہیں برتنی چاہئے اور ہر ایک کے ساتھ خواہ وہ
ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی یا بدھ ہو، یکساں برتاؤ
کرنا چاہئے۔ قانون کی نظر میں ہندوستان کے ہر شہری کا حق
برابر ہے

ایک اچھے ناظم کی حیثیت سے ان کی صفات کا پہلا ثبوت
سنہ ۱۹۴۶ء میں ملا کلکتے کے قتل عام کے بعد نواکھالی میں
فسادات شروع ہوگئے، جس میں ہندوؤں کو بہت تکلیف پہنچی
نواکھالی کے ہندوؤں کا انتقام لینے کے لئے بہار کے ہندوؤں نے
مقامی مسلمانوں پر حملے شروع کردئے اور سارے صوبے میں
فسادات ہونے لگے۔ صوبے کی حکومت کے لئے حالات پر قابو
پانا مشکل ہوگیا اور مرکزی حکومت کو سخت کارروائی کرنی
پڑی۔ میں ان دنوں تقریباً دو ہفتے پٹنے میں مقیم رہا۔ جس
سختی اور قوت کے ساتھ جواہر لال نے ان فسادات کی روک تھام
کی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ یوں تو ہم سب ایک ہی مقصد
کے لئے کوشاں تھے لیکن بلا شبہ اس میں سب سے موثر
کار گذاری جواہر لال کی تھی۔

اس پوری مدت میں گاندھی جی ایک شدید ذہنی کرب میں
مبتلا تھے۔ انہوں نے دونوں فرقوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے

دلانے کی کوشش کی کہ جو خبریں ان تک پہنچ رہی ہیں وہ نہایت مبالغہ آمیز ہیں ۔ انھوں نے یہ تک کہا کہ مسلمانوں کو ڈرنے اور شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر جب ہم تینوں گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو جواہر لال نے انتہائی غم کے ساتھ کہا کہ دلی کی صورت حال جس میں مسلمان کتوں اور بلیوں کی طرح مارے جا رہے ہیں ، ان کے لئے بالکل نا قابل برداشت ہوگئی ہے انھیں اپنی بے بسی پر شرم آتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کرسکتے ۔ ان کا ضمیر انھیں ہر وقت ستاتا رہتا ہے اس لئے کہ جب لوگ ان کے پاس بہت ناک وارداتوں کی شکایتیں لے کر آتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا جواب دیں ۔ جواہر لال نے اس بات کو کئی بار دہرایا کہ یہ صورت حال ان کے لئے نا قابل برداشت ہے اور ان کا ضمیر انھیں ایک لمحہ بھی چین سے نہیں رہنے دیتا ۔

اس بات کا سردار پٹیل نے جو جواب دیا اس سے ہم ششدر رہ گئے ایسے زمانے میں جب کہ دلی میں مسلمان دن دھاڑے مارے جا رہے تھے ، سردار پٹیل نے نہایت اطمینان کے ساتھ گاندھی جی سے کہا کہ جواہر لال کی شکایتیں بالکل ان کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ اکا دکا وارداتیں ہوئی ہوں لیکن حکومت مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے ۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا ۔ سردار پٹیل نے اُلٹے اس بات پر ناگواری ظاہر کی کہ جواہر لال

داڑھی منڈا دی تھی اور بال ترشواتا تھا بہت سے سکھ اس کو
بدعتی تصور کرتے تھے وہ تقسیم سے پہلے بھی دلی کا ڈپٹی کمشنر
تھا. ۱۵ اگست سے قبل ایک تجویز تھی کہ اُسے پنجاب واپس
بھیجدیا جائے کیونکہ اُس کی مدت ہو چکی ہے دلی کے بہت سے
سر بر آوردہ شہریوں نے خصوصاً مسلمانوں کے ایک بڑے حصے
نے اس تجویز کے خلاف درخواست دی اُن کا کہنا تھا کہ یہ
ایک غیر جانب دار اور مضبوط افسر ہے اس کٹھن وقت میں اس
کا مناسب بدل ملنا مشکل ہوگا

شہریوں کی خواہش کے مطابق اس افسر کو دلی ہی میں رکھا
گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی فرقہ وارانہ کشمکش کے
کے اثر میں آکر وہ اپنے پچھلے رویے پر قائم نہ رہ سکا. مجھ
تک بہت سی شکایتیں پہنچیں کہ فسادیوں کے خلاف جتنی سخت
کارروائی کی ضرورت تھی وہ نہیں کر رہا تھا. وہی مسلمان جنھوں
سال بھر قبل اس کو دلی میں رکھنے کی کوشش کی تھی، اب
آکر یہ شکایت کرتے تھے کہ وہ دلی کے مسلمان شہریوں کی حفاظت
کا معقول انتظام نہیں کر رہا ہے یہ شکایت سردار پٹیل تک
پہنچی لیکن اب وہ ایسی شکایتوں پر بہت ہی کم توجہ کرتے تھے.

سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے اور اس حیثیت سے دلی کے
انتظامی امور براہ راست ان کے تحت تھے لوٹ مار اور قتل
کی وارداتوں کی فہرست طول کھینچنے لگی تو گاندھی جی نے
سردار پٹیل کو بلاکر دریافت کیا کہ وہ اس کشت و خون کی
روک تھام کے لئے کیا کر رہے ہیں، سردار پٹیل نے انہیں یقین

کے عائب تھے ۔ کچھ لوہے کی سلاخیں جو پرانے مکانات کے جنگلوں سے نکالی گئی تھیں اور کچھ پائپ کے ٹکڑے دیکھے ۔ سردار پٹیل کے خیال میں یہی وہ اسلحے تھے جنھیں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے جمع کیا تھا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان میں سے ایک دو چاقو اٹھا لئے اور مسکرا کر کہا کہ جن لوگوں نے جنگ کا یہ ساماں اس خیال سے جمع کیا تھا کہ اس سے دلی کا شہر فتح کرلیا جائے ، ان کا جنگ کے بارے میں تصور بہت ہی عجیب و غریب ہوگا

میں ذکر کرچکا ہوں کہ دلی کے زیادہ تر مسلمانوں کو پرانے قلعے میں لاکر رکھا گیا تھا اب سردیاں سر پر آگئیں تھیں ۔ ہزاروں لوگ جو کھلے آسماں کے نیچے رہتے تھے انہیں سردی سے سخت تکلیف پہنچتی تھی ان کے لئے کھانے کا معقول انتظام تھا نہ پانی کا ۔ وہاں سے گندگی ہٹانے کا اول تو کوئی انتظام تھا ہی نہیں اور جو تھا بھی وہ بالکل ناکافی تھا ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہنگامی بورڈ کے سامنے شہادت دیتے ہوئے پرانے قلعے میں رہنے والوں کی دل گداز حالت بیان کی ۔ انھوں نے کہا کہ ان غریب مردوں ، عورتوں اور بچوں کو موت کے منھ سے نکال کر زندہ درگور کیا گیا ہے ۔ بورڈ نے مجھے ہدایت کی کہ میں جا کر انتظامات کا معائنہ کروں اور ضروری کارروائیاں تجویز کروں اس کے بعد جلسے میں طے پایا کہ پانی اور صفائی کا فوراً انتظام کیا جائے ۔ ساتھ ہی فوج سے کہا گیا کہ وہ جتنے زیادہ سے زیادہ خیمے دے سکتی ہو فراہم کرے تاکہ لوگوں کو کم سے کم کیمپوں کے

وزیر اعظم ہوتے ہوئے اپنی حکومت کے طرز عمل پر ایسے اعتراض
کررہے تھے

جواہرلال چند لمحے چپ بیٹھے رہے اور پھر نہایت دل شکستہ
انداز میں انہوں نے گاندھی جی کی طرف دیکھ کر کہا کہ اگر
سردار پٹیل کے یہی خیالات ہیں تو پھر انہیں کچھ نہیں کہنا ہے

اس دوران میں ایک واقعہ اور بھی ہوا جس سے اس بات کا
اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سردار پٹیل کا ذہن کس طرح کام کر رہا
تھا. غالباً انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں پر روزانہ جو
حملے ہو رہے تھے ان کا کوئی جواز ہونا چاہئے چنانچہ انہوں
نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کے علاقوں سے اسلحے برآمد
ہوئے ہیں، جو دہلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ
کرنے کے لئے جمع کئے تھے مطلب یہ تھا کہ اگر ہندوؤں اور
سکھوں نے اس معاملے میں پہل نہ کی ہوتی تو مسلمان انہیں
تباہ کر دیتے. پولیس نے سبزی منڈی اور قرول باغ کے علاقوں
سے واقعی کچھ اسلحے برآمد بھی کئے، جو سردار پٹیل کے حکم
سے گورنمنٹ ہاوس میں لاکر ہمارے معائنے کے لئے کیبنٹ روم
سے ملحق کمرے میں سجا دئے گئے صبح کو جب ہم سب اپنے
روزانہ کے جلسے کے لئے جمع ہوئے تو سردار پٹیل نے کہا
کہ پہلے ہمیں پاس کے کمرے میں چل کر برآمد شدہ اسلحوں
کا معائنہ کرنا چاہئے. وہاں پہنچ کر ہم نے ایک میز پر درجنوں
باورچی خانہ کی معمولی زنگ آلود چھریاں، جیبی اور قلم و پنسل
بنانے کے چاقو جن میں سے بعض کے دستے لگے تھے اور بعض

بنائے ہوئے تھے۔ ترک موالات کی تحریک سے پہلے سردار پٹیل گجرات کے وکیلوں میں سے ایک وکیل تھے۔ ملک کی سیاسی زندگی سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ سیاسی دنیا میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے جب گاندھی جی نے احمدآباد کو اپنا مرکز بنایا تو انہوں نے سردار پٹیل کو چن کر نکالا اور رفتہ رفتہ ان کی حیثیت بنائی۔ پٹیل دل و جان سے ان کے ساتھ ہو گئے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، بسا اوقات وہ صرف گاندھی جی کی [illegible] کو [illegible] تھے۔ گاندھی جی نے انہیں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا رکن بنا دیا اور انہیں کی [illegible] سے ۱۹۳۱ء میں کانگریس کے صدر چنے گئے۔ گاندھی جی کو اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ پٹیل اب ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھے جو ان کے ہر اصول اور مقصد کے منافی تھی۔

گاندھی جی نے کہا کہ وہ دلی کے مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب خود ان کے ولبھ بھائی حکومت ہند کے وزیر داخلہ ہیں اور دار السلطنت میں امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں سردار پٹیل صرف مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں قاصر نہیں رہے ہیں بلکہ اس بارے میں ان سے جو شکایتیں کی جاتی ہیں انہیں بے پروائی کے ساتھ ناقابل شنوائی ٹھہرا دیتے ہیں گاندھی جی نے کہا کہ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس وقت تک برت رکھیں جب تک کہ حالت نہ سدھرے۔ چنانچہ ۱۲ جنوری ۱۹٤۸ء سے ان کا برت شروع ہوگیا ایک لحاظ سے گاندھی جی

نیچے پناہ مل سکے۔

اِدھر گاندھی جی کی اذیت روز افزوں تھی۔ پہلے ساری قوم ان کی ادنےٰ سے ادنےٰ خواہش پوری کرنے پر تیار رہتی تھی لیکن اب یہ عالم تھا کہ وہ منت اور التجا کر رہے تھے اور لوگوں کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی بالآخر حالات ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگئے انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ میرے پاس اب اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا ہے کہ اس وقت تک کے لیے برت رکھوں، جب تک دلی میں پھر سے امن و امان قائم ہو جائے۔ یہ خبر سن کر کہ گاندھی جی دلی میں امن قائم ہونے تک برت رکھنے والے ہیں، بہت سے لوگ جو اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے، شرمندہ اور عمل کی طرف مائل ہوئے سب نے محسوس کیا کہ گاندھی جی کو اس عمر میں اور صحت کی اس حالت میں برت رکھنے سے روکنا چاہئیے ان لوگوں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ ایسا ارادہ ترک کردیں۔ لیکن گاندھی جی کا فیصلہ اٹل تھا

سردار پٹیل کا رویہ گاندھی جی کے دل پر سب سے بڑا بوجھ تھا سردار پٹیل ان کے بہت قریب کے لوگوں میں تھے اور انہیں بہت عزیز تھے۔ دراصل سردار پٹیل کی سیاسی حیثیت ہر لحاظ سے گاندھی جی کی مرہون منت تھی کانگریس کے اہم لیڈروں میں بہت سے ایسے تھے جن کی سیاسی زندگی گاندھی جی کے سیاسی میدان میں آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد، دو آدمی ایسے تھے جو بالکل گاندھی جی کے

برت سے ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ حقیقت کو دیکھ سکیں گے »

یہ سن کر سردار پٹیل ایک لفظ نہیں بولے اور جانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں نے انہیں روکا اور کہا کہ انہیں اپنا پروگرام ملتوی کرکے دلی میں رہنا چاہئے کیوں کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ واقعات کیا کروٹ لیں گے۔ انہیں ایسے موقع پر نہیں جانا چاہئے جب گاندھی جی برت رکھ رہے تھے۔

سردار پٹیل نے تقریباً چیخ کر جواب دیا « میرے ٹھہرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ گاندھی جی میری بات نہیں سننا چاہتے وہ تو دنیا میں ہندوؤں کا منہ کالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ان کا رویہ ایسا ہے تو وہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ میں پروگرام نہیں بدل سکتا، مجھے بمبئی جانا ہے »

مجھے ان کے الفاظ سے زیادہ اُن کے لہجے سے صدمہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ گاندھی جی پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ سردار پٹیل سے اور کچھ کہنا فضول ہے اور وہ چلے گئے۔

سردار پٹیل نے گاندھی جی کی طرف سے اپنا دل سخت کرلیا تھا لیکن دلی کے لوگوں نے نہیں کیا تھا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی کہ گاندھی جی نے برت شروع کردیا ہے، دلی شہر ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ دلی پر تو بالکل بجلی کا سا اثر ہوا۔ بہت سے گروپ جنہوں نے اب تک گاندھی جی کی مخالفت کی تھی اب سامنے آئے اور کہا کہ گاندھی جی کی بیش بہا زندگی بچانے کے لئے وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہیں۔

کا برت سردار پٹیل کے رویے کے خلاف احتجاج تھا اور سردار پٹیل خود بھی یہی سمجھتے تھے۔

ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ گاندھی جی کو برت رکھنے سے باز رکھا جائے برت کی پہلی شام کو میں، جواہر لال اور سردار پٹیل گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلے روز صبح سردار پٹیل بمبئی جانے والے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے سرکاری انداز میں گفتگو کرتے ہوئے شکایت کی کہ وہ کسی معقول وجہ کے بغیر برت رکھ رہے ہیں در اصل اس وقت برت رکھنے کا مناسب موقع اور محل بھی نہیں ہے ان کے برت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت ہند اور خصوصاً وزیر داخلہ پر الزام لگائے جائیں گے۔ انہوں نے کچھ تلخی کے ساتھ کہا کہ گاندھی جی کا طرز عمل کچھ ایسا ہے گویا وہ انہیں مسلمانوں کے قتل کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

گاندھی جی نے حسب معمول اپنے پُرسکون انداز میں جواب دیا «میں چین میں نہیں دلی میں ہوں۔ میری آنکھیں اور میرے کان ابھی سلامت ہیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر اعتبار نہ کروں اور مجھ سے کہو کہ دلی کے مسلمانوں کو شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے، تو نہ میں تم کو قائل کرسکتا ہوں اور نہ تم مجھے۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں وہ میرے جسم کا حصہ ہیں۔ اگر اس وقت وہ طیش کی وجہ سے اندھے ہوگئے ہیں تو میں ان پر الزام نہیں لگاؤں گا۔ لیکن خود مجھے تکلیف اٹھاکر کفارہ ادا کرنا چاہیئے، مجھے امید ہے کہ میرے

مکانوں میں آباد ہوگئے تھے. اگر صرف سیکڑوں کی بات ہوتی تو گاندھی جی کی خواہش پوری بھی کی جاسکتی لیکن یہاں مسئلہ لاکھوں آدمیوں کا تھا. ایسی صورت میں گاندھی جی کی شرائط کو پورا کرنے کی کوشش سے نئے مسئلے کھڑے ہوجاتے. ہندو اور سکھ مغربی پاکستان سے آئے تھے اور ایک مرتبہ اُجاڑے جاچکے تھے، اور اب انہوں نے دہلی میں رہنے کی کوئی صورت نکال لی تھی. ان لوگوں سے مکانات خالی کرنے کو کہا بھی جاتا تو یہ جاتے کہاں؟ پھر وہ مسلمان جو دلی سے گئے تھے، پاکستان میں منتشر ہوچکے تھے اب انہیں کیسے واپس لایا جاسکتا تھا غرضیکہ موجودہ صورت میں نہ مسلمانوں کو بلانا ممکن تھا اور نہ ہندوؤں اور سکھوں سے ان مکانات کو خالی کرانا جن میں وہ آباد ہوچکے تھے مسلمانوں کو اس طرح آباد کرنے کی کوشش کا مطلب یہ ہوتا کہ جن مکانوں سے مسلمانوں کو ایک بار نکال کر بے گھر کیا گیا تھا، ان سے اب ہندوؤں اور سکھوں کو نکال کر بے گھر کیا جاتا

میں نے گاندھی جی کا ہاتھ پکڑ کر ان سے التجا کی کہ یہ شرط نہ رکھیں. میں نے کہا کہ اول تو یہ بات نا قابل عمل ہے اور دوسرے ہندو اور سکھ پناہ گزینوں سے یہ مطالبہ کرنا نہ تو ممکن تھا اور نہ اخلاقاً حق بجانب کہ جن مکانوں میں وہ آباد ہوچکے تھے انہیں خالی کرکے پھر مارے مارے پھریں. میں نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ اس شرط پر اصرار نہ کریں بلکہ وہ یہ شرط رکھیں کہ دلی میں کشت و خون اور غارت گری فوراً بند

طرح طرح کے لوگ گاندھی جی کے پاس آئے اور انہیں یقین دلایا کہ وہ سب دلی میں امن قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن گاندھی جی پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دو دن اضطراری دوڑ دھوپ اور مشوروں میں گذر گئے تیسرے روز ایک جلسے کا انتظام اس مقصد سے ہوا کہ صورت حال پر غور کیا جائے اور گاندھی جی کو برت توڑنے پر آمادہ کیا جائے۔

جلسے میں جاتے ہوئے میں گاندھی جی کے پاس گیا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے برت کے توڑنے کی شرطیں بتادیں۔ پھر ہم انہیں لوگوں کے سامنے پیش کریں گے اور کہیں گے کہ گاندھی جی ان معاملوں کے بارے میں مطمئن ہوگئے تو اپنا برت توڑ دیں گے

گاندھی جی نے کہا "ہاں یہ کام کی بات ہے میری پہلی شرط یہ ہے کہ ان سارے مسلمانوں کو جو ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں کی وجہ سے دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں؛ واپس آنے کی دعوت دی جائے اور انہیں خود انہیں کے مکانوں میں پھر سے آباد کیا جائے"

یہ انتہائی شائستگی اور شرافت کی بات تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ تقسیم نے پنجاب کے دونوں حصوں کی زندگی تہ و بالا کردی تھی مغربی پنجاب سے لاکھوں پناہ گزیں ہندوستان آ چکے تھے اور لاکھوں مشرقی پنجاب سے پاکستان جاچکے تھے۔ ہزاروں مسلمان دہلی چھوڑ چکے تھے اور بہت سے پناہ گزیں جو مغربی پنجاب سے آئے تھے، ان کے خالی

وہ فوراً بند کئے جائیں اور ان ہندوؤں اور سکھوں کو جو
اس طرح کے حملوں میں شرکت کررہے ہیں، روکا جائے.
جو مسلمان نظام الدین اولیا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
اور ناصر الدین چراغ دہلی جیسی درگاہوں کے آس پاس رہتے
تھے اور مصیبت کی وجہ سے اپنے مکانات چھوڑ کر چلے گئے
ہیں، انہیں واپس لاکر ان کے مکانوں میں پھر آباد کیا جائے.
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا
تھا، حکومت اس کی مرمت کراسکتی تھی، لیکن گاندھی جی
کو اصرار تھا کہ ہندو سکھ اس کی مرمت اپنے گناہ کا
کفارہ سمجھ کر خود کرائیں.

سب سے اہم ضرورت تالیف قلوب کی تھی دوسری شرائط کا
پورا ہونا اتنا اہم نہیں تھا جتنا اس شرط کا اس لئے ہندو اور
سکھ جماعتوں کے لیڈروں کو گاندھی جی کو اس بارے میں پورے
طور پر مطمئن کرنا چاہئے، تاکہ انہیں ایسے کسی مسئلے کی وجہ
سے دوبارہ برت نہ رکھنا پڑے گاندھی جی نے کہا کہ «میں چاہتا
ہوں کہ یہ میرا آخری برت ہو».

میں نے انہیں یقین دلایا کہ یہ ساری شرطیں پوری ہوسکتی ہیں.
میں دو بجے جلسے میں پہنچا اور گاندھی جی کی شرطیں حاضرین
کے سامنے رکھ دیں میں نے کہا کہ ہم گاندھی جی کو مطمئن
کرنے اور ان سے التجا کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ وہ اپنا
برت توڑ دیں. میں نے یہ بھی کہا کہ صرف قرارداد منظور کرنے
کا گاندھی جی پر کوئی اثر نہ ہوگا دلیؔ کے لوگ اگر واقعی

ہو. وہ یہ مطالبہ بھی کرسکتے تھے کہ جو مسلمان اب بھی ہندوستان میں ہیں انہیں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے دیا جائے اور تمام فرقوں کے درمیان دوستانہ تعلقات دوبارہ قائم ہو جائیں گاندھی جی پہلے تو راضی نہیں ہوئے اور اپنی شرائط پر اڑے رہے لیکن آخر کار وہ میرے اصرار پر کچھ نرم پڑے اور مجھ سے کہا کہ اگر میں خود ان شرطوں سے مطمئن ہوں جو میں نے تجویز کی ہیں، تو وہ بھی انہیں مان لیں گے. میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میرے خیالات کا اتنا لحاظ کیا اور ساتھ ہی ان سے یہ بھی التجا کی کہ وہ میری تجویزوں کو قبول کرائیں.

گاندھی جی نے تجویز کیا کہ مسلمانوں کی زیارت گاہیں اور مسجدیں جنہیں نقصان پہنچا ہے یا جن کی توہین کی گئی ہے، انہیں واپس کی جائیں اور ان کی مرمت کی جائے ان عمارتوں پر غیر مسلموں کا قبضہ مسلمانوں کے لئے رنج اور خوف کا باعث تھا گاندھی جی اس بات کی بھی ضمانت چاہتے تھے کہ اب پھر کسی فرقے کی عبادت گاہ پر حملے نہیں ہوں گے اس کے بعد گاندھی جی نے برت توڑنے کی شرطیں لکھوائیں وہ یہ تھیں

۱ ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملے کرنا فوراً بند کریں اور انہیں یقین دلائیں کہ آئندہ وہ سب بھائیوں کی طرح ساتھ رہیں گے.

۲ ہندو اور سکھ ہر طرح اس بات کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان بھی جان و مال کے ڈر سے ہندوستان نہ چھوڑے.

۳ چلتی گاڑیوں میں مسلمانوں پر جو حملے کئے جارہے ہیں

جلسہ کیا ہم نے طے کیا کہ یہ سب خود برلا ہاؤس جاکر گاندھی جی کو شخصی طور پر اطمینان دلائیں. میں گاندھی جی کے پاس دس بجے پہنچا اور ان سے کہا کہ اب مجھے پورا اطمینان ہے کہ ان کا مقصد حاصل ہو گیا ہے. ان کے برت نے ہزاروں لوگوں کے دل پھیر دئے ہیں اور ان میں انصاف اور انسانیت کا جذبہ پھر سے بیدار کردیا ہے ہزاروں آدمیوں نے یہ عہد کیا ہے کہ فرقوں کے درمیاں خوشگوار تعلقات پیدا کرنا ان کا اولیں مقصد ہوگا میں نے گاندھی جی سے استدعا کی وہ ان یقیں دہانیوں پر اعتبار کریں اور اپنا برت توڑ دیں

گاندھی جی بظاہر بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے میری التجا قبول نہیں کی سارا دن بحث مباحثے اور مت سماحت میں گذر گیا ان کا وزن کافی گھٹ گیا تھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتے تھے برلا ہاؤس میں اپنے بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے اور جو وفد آتے ان کی باتیں سن کر یہ جانچنے کی کوشش کرتے کہ ان کے جذبہ میں واقعی کتنی تبدیلی ہوئی ہے آخر میں انہوں نے کہا کہ وہ دوسرے روز صبح کو جواب دینگے.

دوسرے روز صبح ہم سب ان کے کمرے میں جمع ہوئے. جواہرلال وہاں پہلے سے موجود تھے اور لوگوں کے علاوہ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین بھی تھے جنھوں نے گاندھی جی سے ملنے کی اجازت چاہی تھی. گاندھی جی نے انہیں بلا لیا اور وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ اس مجمع میں شامل ہوگئے. جس میں سردار پٹیل کے علاوہ کیبنٹ کے سارے ممبر موجود تھے. گاندھی جی نے

گاندھی جی کی جان بچانا چاہتے ہیں تو جو شرطیں انہوں نے رکھی ہیں ان کو پورا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ دلیؔ کے لوگ گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کا وعدہ کریں گے یا نہیں۔

اس جلسے میں تقریباً پچاس ہزار آدمی تھے۔ ان سب نے ایک آواز ہوکر نعرہ لگایا کہ "ہم سب گاندھی جی کی خواہش کو حرف بحرف پورا کریں گے۔ ہم اپنے دل اور اپنی جان کی بازی لگادیں گے اور کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے گاندھی جی کو دکھ پہنچے"

ابھی میری تقریر جاری تھی کہ کچھ لوگوں نے شرطوں کی نقل کرنا اور حاضرین کے دستخط لینا شروع کر دیا جلسہ ختم ہونے سے قبل شرائط نامہ پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوچکے تھے۔ اُدھر دلیؔ کے ڈپٹی کمشنر نے کچھ ہندوؤں اور سکھوں کو اپنے ساتھ لیا اور خواجہ قطب الدین کی درگاہ کی مرمت کے لئے چل دئیے ساتھ ہی دلیؔ کی کئی سو سوسائٹیوں نے برسر عام یہ عہد کیا کہ اپنے اپنے حلقوں میں گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گی۔ انہوں نے اعلان کیا وہ سب ان باتوں کو عمل میں لانے کی ذمہ داری لیتی ہیں شام ہوتے ہوتے میرے پاس دلی کے ہر علاقے سے ہر گروہ اور جماعت کے وفد آئے اور مجھے یقین دلایا کہ ان سب کو گاندھی جی کی شرطیں منظور ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں گاندھی سے برت توڑنے کی درخواست کروں۔

دوسرے روز صبح میں نے دلیؔ کے نمائندہ لیڈروں کا ایک

ملنے آئے۔ میں اس وقت گاندھی جی کے پاس موجود تھا۔ گاندھی جی کی عظمت کا بہترین مظاہرہ ایسے ہی موقعوں پر ہوتا تھا۔ وہ بہت شفقت اور محبت کے ساتھ سردار پٹیل سے ملے۔ ان کے چہرے پر اور ان کے انداز میں غصے اور شکایت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ سردار پٹیل کچھ پریشان جیسے تھے اور ان کے انداز میں روکھاپن اور تکلف تھا۔ وہ گاندھی جی سے خوش نہیں تھے اور انہیں وہ باتیں پسند نہیں آئی تھیں جو گاندھی جی نے مسلمانوں کے دل سے خوف اور خطرے کا احساس دور کرنے کے لئے کی تھیں

گاندھی جی کے برت کے بارے میں یہ خیال رکھنے والے اکیلے سردار پٹیل ہی نہیں تھے جس زور سے انھوں نے اس کی خاطر یہ تدبیریں اختیار کی تھی، ہندوؤں کی ایک جماعت میں ان سے بغض پیدا ہوگیا تھا جو دن بدن بڑھتا رہا تھا۔ یہ لوگ کھلے بندوں گاندھی جی کی مذمت یہ کہہ کر کرتے تھے کہ انھوں نے ہندوؤں کے جائز حقوق قربان کردئیے ہیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی۔ اسے سارا ملک جانتا تھا۔ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سنگھ کی قیادت میں ہندوؤں کا ایک طبقہ آزادی کے ساتھ یہ کہتا پھرتا تھا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا کی بھی مخالفت شروع کردی تھی کیونکہ اس میں ہندو شاستروں کے اشلوکوں کے ساتھ، قرآن اور انجیل کی آئتیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ کچھ لوگوں نے تو ان پرارتھنا سبھاؤں کے خلاف باقاعدہ ایجی ٹیشن شروع کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ وہ قرآن

اشارے سے کہا کہ جو لوگ اپنے عہد کا اعادہ کرنا چاہیں وہ کریں دلی کے تقریباً پچیس لیڈر جن میں ہر سیاسی خیال کے لوگ تھے ، ایک ایک کرکے ان کے پاس آئے اور عہد کیا کہ وہ ایمانداری سے گاندھی جی کی شرطیں پوری کرینگے . اس کے بعد گاندھی جی کے اشارے پر ان کے حلقے کی عورتوں نے رام دھن شروع کی. ان کی پرپوتی ایک گلاس میں سنگترے کا رس لائی گاندھی جی نے اشارہ کیا کہ وہ گلاس مجھے دیدے . میں نے گلاس لے کر گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگایا اور انھوں نے برت توڑ دیا

گاندھی جی کا برت شروع ہونے کے بعد اسٹیٹسمین کے ایک سابق ایڈیٹر مسٹر آرتھر مور نے بھی امپیریل ہوٹل میں برت شروع کر دیا تھا. ہندو مسلم فسادات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا تھا انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر فسادات ختم نہ ہوئے تو وہ بھی مرن برت رکھیں گے . وہ برسوں سے ہندوستان میں تھے اور اس کواپنا وطن بنا لیا تھا. ایک ہندوستانی کی حیثیت سے وہ اس انسانی اذیت اور ذلت کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے . انھوں نے کہا کہ ہندوستان پر بہت مصیبت آئی ہے ، اسے دیکھتے رہنے سے مرجانا بہتر تھا اب میں نے ان کے پاس کہلا بھیجا کہ گاندھی جی نے برت توڑ دیا تھا اور انھیں بھی اپنا برت توڑ دینا چاہئے .

برت توڑنے کے بعد بھی گاندھی جی کی طاقت کئی دن میں رفتہ رفتہ بحال ہوئی. سردار پٹیل بمبئی سے واپسی پر ان سے

تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔

کچھ روز اور گذرے گاندھی جی کی طاقت رفتہ رفتہ بحال ہوئی اور پرارتھنا کے بعد انہوں نے حاضرین سے خطاب کرنا شروع کر دیا ان جلسوں میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے۔ اور گاندھی جی کا خیال تھا کہ یہ جلسے ان کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کا سب سے موثر ذریعہ ہیں۔

۳۰ جنوری سنہ ١٩٤٨ء کو ڈھائی بجے میں گاندھی جی سے ملنے گیا۔ اِن سے کئی اہم مسائل پر گفتگو کرنی تھی اور میں ایک گھنٹے سے زیادہ ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا مگر ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھ کو یاد آیا کہ کچھ ضروری باتوں کے بارے میں ان کی رائے لینا بھول گیا ہوں۔ چنانچہ میں پھر برلا ہاؤس گیا۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے دروازے بند پائے تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ہزاروں آدمی لان پر کھڑے تھے اور مجمع بڑھتے بڑھتے سڑک تک پہونچ چکا تھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ معاملہ کیا تھا مجمع نے میری گاڑی دیکھ کر اندر جانے کا راستہ دے دیا میں پھاٹک پر گاڑی سے اتر پڑا اور پیدل اندر گیا۔ مکان کے سارے دروازے بند تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے کسی نے مجھ کو دیکھ لیا اور مجھے اندر لے جانے کے لئے آیا۔ میں اندر داخل ہوا تو کسی نے روتے ہوئے مجھ سے کہا کہ گاندھی جی کو گولی مار دی گئی ہے اور وہ بے ہوش پڑے ہیں۔

یہ خبر ایسی اچانک ملی اور اس سے دل پر ایسی چوٹ لگی

اور انجیل کی آئتیں نہیں پڑھنے دیںگے۔ اسی مقصد سے پمفلٹ اور ہینڈ بل شایع اور تقسیم کئے گئے۔ گاندھی جی کو ہندوؤں کا دشمن ٹھہرا کر لوگوں کو ان کے خلاف اکسایا گیا ایک پمفلٹ میں تو یہ تک کہہ دیا گیا کہ اگر گاندھی جی نے اپنا طور و طریق نہ بدلا تو انھیں بے اثر کردینے کی تدبیریں کی جائیںگی

گاندھی جی کے برت نے اس جماعت کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور اس نے ان کے خلاف عملی قدم اٹھانے کی ٹھان لی جوں ہی انھوں نے اپنی پرارتھنا سبھاؤں کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا، اُن پر ایک بم پھینکا گیا خوش قسمتی سے کوئی زخمی نہیں ہوا لیکن اس خیال سے سارے ملک کو شدید صدمہ پہنچا کہ کوئی شخص گاندھی جی پر ہاتھ اُٹھا سکتا تھا پولیس نے تفتیش شروع کی لیکن تعجب ہے کہ نہ اس کا سراغ ملا کہ بم کس نے چھپا کر رکھا، نہ اس کا کہ بم رکھنے والے برلا ہاؤس کے باغ میں داخل کیونکر ہوئے یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ اس واقعے کے بعد بھی گاندھی جی کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں کیا گیا اس واقعے سے کم از کم یہ بات تو واضح ہو ہی گئی تھی کہ ملک میں ایک ایسا گروہ ہے جو تعداد میں بہت کم سہی، مگر گاندھی جی کی جان لینے کی فکر میں ہے ایسی صورت میں قدرتاً یہ امید کی جا سکتی تھی کہ دلی کی سی۔ آئی ڈی۔ پولیس گاندھی جی کی حفاظت کے لئے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کریگی مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے لئے ہمیشہ یہ شرم اور رنج کی بات رہے گی کہ اس آگاہی کے بعد بھی معمولی سے معمولی احتیاطی

حرفِ آحر

گاندھی حی کی شہادت کے ساتھ تاریح کا ایک دور حتم ہو گیا میں آح تک نہیں بھولا ہوں کہ ہم حدید ہندوستاں کے سب سے حلیل القدر فرزند کے تحفظ میں کس بری طرح ناکام ثابت ہوئے ان پر بم پھینکنے کے واقعے کے بعد یہ توقع کرنا قدرتی بات بھی کہ دلی کی سی. آئی ڈی پولیس ان کی حفاظت کے لئے حاص تدبیریں کریگی کسی معمولی شحص کو بھی اس طرح قتل کرنے کی کوشش کے بعد پولیس اس کی حفاظت کا حاص اہتمام کرتی ہے. یہ اس صورت میں بھی کیا حاتا ہے حب کسی کو حطوط یا پمفلٹ کے ذریعے اس قسم کی دھمکی دی حاتی ہے. گاندھی حی کو حطوط اور پمفلٹ کے ذریعے اور کھلے بندوں اس قسم کی صرف دھمکیاں ہی نہیں دی گئیں بلکہ ان پر بم پھینکا گیا معاملہ تھا دور حاضر کی عظیم تریں شحصیت کے تحفظ کا اور پھر بھی کوئی موثر کارروائی نہیں کی گئی. ایسا نہیں ہے کہ احتیاطی تدابیر میں کوئی حاص دشواری رہی ہو گاندھی حی کی پرارتھنا کسی کھلے میداں میں نہیں بلکہ برلا ہاؤس کے لان پر چاردیواری کے اندر منعقد ہوا کرتی تھی. حہاں صرف پھاٹک سے داخلہ ممکن تھا. پولیس کے لئے آنے حانے والوں پر نگاہ

کہ کچھ دیر میں سمجھ نہ سکا کہ کیا کہا جا رہا ہے. میرا سر چکرا رہا تھا اور میں لڑکھڑاتا ہوا گاندھی جی کے کمرے میں گیا. وہ فرش پر لیٹے تھے. ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں بند تھیں. ان کے دونوں پوتے ان کے پاؤں پکڑے بیٹھے رو رہے تھے. مجھے معلوم ہوا کہ جیسے خواب میں کوئی کہہ رہا ہے « گاندھی جی مر گئے ».

حفاظت کے لئے خاص اہتمام نہیں کیا گیا؟

پرفلا چندر گھوش نے بھی یہی سوال اٹھایا انہوں نے پوری حکومت ہند کو مورد الزام ٹھہرایا کہ گاندھی جی کی حفاظت کرنے میں ناکام ثابت ہوئی تھی انہوں نے کہا کہ سردار پٹیل ایک مستعد اور کار پرداز وزیر داخلہ کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہیں، پھر آخر یہ بات کیسے سمجھائی جائے کہ گاندھی جی کی جان سلامت رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی

سردار پٹیل نے اپنے مخصوص انداز میں ان الزامات کی تردید کی. بلا شبہ انہیں اس سانحے سے بہت شدید صدمہ پہنچا تھا لیکن لوگ جس طرح کھلے بندوں ان پر الزام لگا رہے تھے، وہ بھی انہیں برا لگا کانگریس پارلی منٹری پارٹی کا جلسہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ کانگریس کے دشمن ان کے خلاف الزامات تراش کر جماعت میں نفاق ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں. گاندھی جی کے ساتھ وفاداری کا اعادہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پارٹی کو ایسی باتوں سے اثر نہ لینا چاہئے بلکہ گاندھی جی کے انتقال سے جو خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے اندر اور زیادہ استحکام اور یک جہتی پیدا کرنا چاہئے. سردار پٹیل کی یہ اپیل بے اثر نہیں رہی کانگریس کے بہت سے ممبروں نے انہیں یقین دلایا کے وہ ثابت قدمی سے ان کا ساتھ دینگے.

ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً جو وارداتیں ہو رہی تھیں، ان سے یہ بات ظاہر تھی کہ فرقہ پرستی کا زہر کتنی دور

رکھنا بہت آسان تھا۔

اس الم ناک حادثے کے بعد لوگوں کی عینی شہادت نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ قاتل نہایت مشتبہ انداز سے داخل ہوا تھا۔ اس کا طرز عمل اور انداز گفتگو اتنا مشکوک تھا کہ خفیہ پولیس کو اس پر نگاہ رکھنی چاہئے تھی اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو اس کی نیت کا اندازہ کرکے اس سے پستول چھینی جا سکتی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ پستول لے کر بے روک ٹوک اندر داخل ہوگیا اور جوں ہی گاندھی جی وہاں پہنچے، وہ اٹھا اور یہ کہہ کر کہ «آج آپ کو دیر ہوگئی» اس نے گاندھی جی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ گاندھی جی نے جواب دیا «ہاں» اور قبل اس کے کہ دوسرا لفظ ان کی زبان سے نکلے، پستول کی تین گولیوں نے اس بیش بہا زندگی کا خاتمہ کردیا

اس سانحے کے بعد ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے تو کھلم کھلا سردار پٹیل پر نا اہلیت کا الزام لگایا۔ خصوصاً جے پرکاش نے اس مسئلے کو اٹھانے میں بڑی جراءت دکھائی۔ دلی کے ماتمی جلسے میں جو گاندھی جی کے انتقال پر رنج و غم کے اظہار کے لئے منعقد ہوا تھا، جے پرکاش نے صاف صاف یہ بات کہی کہ حکومت ہند کے وزیر داخلہ اس الزام سے بچ نہیں سکتے کہ ان پر قتل کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے سردار پٹیل سے جواب طلب کیا کہ جب کھلے بندوں پروپگنڈے کے ذریعے لوگوں کو گاندھی جی کے قتل کی ترغیب دی جارہی تھی اور ان پر ایک بم بھی پھینکا جاچکا تھا، تو آخر کیوں ان کی

لیکن کچھ معزز خاندانوں کی خواتین نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے سوئٹر بن کر بھیجا۔ اس کی رہائی کے لئے ایک تحریک بھی چلائی گئی۔ اس کے طرف داروں نے کھلم کھلا اس کے قتل کو قابل معافی نہیں ثابت کیا بلکہ یوں کہا کہ چونکہ گاندھی جی عدم تشدد پر ایمان رکھتے تھے اس لئے ان کے قاتل کو سزائے موت نہیں دینی چاہئے۔ جواہر لال کے نام اور میرے نام بہت سے تار موصول ہوئے کہ گوڈسے کو پھانسی دینا گاندھی جی کے اصولوں کے منافی ہوگا۔ بہرکیف قانونی کارروائی قاعدے کے مطابق ہوئی اور ہائی کورٹ نے سزائے موت کو برقرار رکھا۔

گاندھی جی کے قتل کو ابھی دو مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ سردار پٹیل پر قلبی دورہ پڑا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی صدمے کا نتیجہ تھا جو حال کے واقعات سے انہیں پہنچا تھا۔ جب تک گاندھی جی زندہ تھے، سردار پٹیل ان سے جدا رہے۔ گاندھی جی کے انتقال کے بعد جب لوگوں نے ان پر غفلت یا نا اہلیت کا الزام لگایا تو انہیں بہت سخت دھکا لگا اور ذلت محسوس ہوئی۔ اس کے علاوہ وہ فراموش نہ کرسکتے تھے کہ ان کی ساری عزت اور حیثیت گاندھی جی ہی کی مرہون منت تھی۔ یہ احساس بھی کم باعث اذیت نہ رہا ہوگا کہ گاندھی جی ہر حال میں ان سے محبت رکھتے تھے اور ان کا لحاظ کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں ان کے دماغ پر اثر انداز ہوتی رہیں اور انہیں پریشان کرتی رہیں یہاں تک کہ وہ قلب کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ اس کے بعد اگرچہ وہ تین سال زندہ رہے لیکن صحت بحال نہ ہوئی۔

تک پھیل چکا ہے۔ مجموعی حیثیت سے سارے ملک پر اس سانحے کا بہت گہرا اثر پڑا۔ لیکن چند شہروں میں جشن منائے گئے اور اور مٹھائی تقسیم کی گئی۔ گوالیار اور اجین میں خاص کر ایسے مظاہرے ہوئے۔ مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا کہ ان شہروں میں کھلم کھلا مٹھائی تقسیم ہوئی اور لوگوں نے اس حد تک جراءت کی کہ برسر عام خوشیاں منائیں۔ لیکن یہ مسرت اور شادمانی صرف وقتی تھی۔ مجموعی حیثیت سے قوم کو اس واقعے سے بہت صدمہ پہنچا تھا اور عوام غصے میں ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے جو گاندھی جی کے دشمن سمجھے جاتے تھے چند ہفتوں تک تو یہ عالم تھا کہ ہندو مہاسبھا اور آر۔ ایس۔ ایس۔ کے لیڈر عوام کو منہ تک نہ دکھا سکتے تھے۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی ان دنوں ہندو مہا سبھا کے صدر اور مرکزی حکومت کے ایک وزیر تھے۔ وہ بھی اپنے مکان سے باہر نکلنے کی جراءت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مہاسبھا سے مستعفی ہوگئے۔ بہر کیف آہستہ آہستہ صورت حال بہتر ہوئی اور لوگ اپنے دھندھوں میں لگ گئے۔

گاندھی جی کے قاتل گوڈسے پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن مقدمے کی تیاری میں بہت دیر لگی۔ پولیس کو تفتیش میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس لئے کہ معلوم ہوتا تھا گاندھی جی کو قتل کرنے کی سازش کا جال بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ گوڈسے کی گرفتاری کا پبلک میں جو ردِ عمل ہوا، اس سے ظاہر تھا کہ بعض ہندوستانیوں میں فرقہ پرستی کا زہر کتنا گہرا اثر کرچکا تھا۔ ملک کی بڑی اکثریت نے تو گوڈسے کو مجرم قرار دیا اور اسے غداری کا نمونہ ٹھہرایا

اور اپنی دولت اور جاہ و اقتدار کو مستحکم کیا جائے۔ دس برس گذر چکے ہیں اور ابھی حال ہی میں دستور مرتب ہو پایا ہے یہ بھی اس کی آخری شکل نہ ہوگی کیوں کہ آئے دن اس میں ترمیم کی تجویزیں پیش ہوتی رہتی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ نئے دستور کے تحت پہلے انتخابات کب عمل میں آئیں گے!

پاکستان کے قیام کا بس ایک نتیجہ یہ نکلا کہ برِ صغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہوگئی ہندوستان کے باقی ماندہ ساڑھے چار کروڑ مسلمان تو کمزور ہو ہی گئے، دوسری طرف خود پاکستان میں اب تک کسی مستحکم اور مستعد حکومت کے قیام کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر صرف مسلمانوں ہی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ پاکستان کا قیام ان کے لئے نہایت نامساعد اور نامبارک قدم ثابت ہوا۔ دراصل جتنا میں غور کرتا ہوں اتنا ہی میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ایک بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے حامیوں کا یہی نظریہ تھا اور تقسیم کے بعد کانگریس کے بہت سے لیڈر اس نظرئے کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ جب بھی جواہر لال یا سردار پٹیل سے میری گفتگو ہوئی، ان دونوں نے اپنے فیصلے کی حمایت میں یہی دلیل پیش کی۔ بہرکیف اس مسئلے پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ صورت حال کا جو انہوں نے تجزیہ کیا،

اس طرح ہندوستان نے آزادی تو حاصل کی لیکن اپنی سالمیت کھودی۔ پاکستان کے نام سے ایک نئی ریاست وجود میں لائی گئی۔ چونکہ پاکستان مسلم لیگ کی تخلیق تھا اس لئے قدرتاً اس نئی ریاست میں مسلم لیگ برسر اقتدار آئی میں بیان کرچکا ہوں کہ ابتدا میں مسلم لیگ کے قیام کی غرض کانگریس کی مخالفت تھی، اس لئے اس کے ممبروں میں شاید ہی کوئی ایسا تھا جس نے جنگ آزادی میں شرکت کی ہو۔ ان لیڈروں نے نہ کسی قسم کی قربانیاں دی تھیں اور نہ ان میں جدوجہد کی بدولت ڈسپلن پیدا ہوئی تھی۔ ان میں یا تو پنشن یافتہ سرکاری ملازم تھے یا پھر وہ لوگ جنھیں انگریزوں کی سرپرستی پبلک زندگی کے میدان میں لے آئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب نئی ریاست کی تشکیل ہوئی تو اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں گیا جن کے طرز عمل میں نہ خدمت خلق تھی اور نہ کسی قسم کی قربانی اس کے حکمرانوں میں بہت سے خود غرض لوگ تھے۔ جنہوں نے صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پبلک کاموں میں حصہ لیا تھا۔

پاکستان کے لیڈروں میں اکثر یو۔ پی۔ بہار اور بمبئی کے لوگ تھے۔ یہ ان علاقوں کی زبان تک نہ بول سکتے تھے جن پر اب پاکستان مشتمل تھا۔ اس طرح نئی ریاست میں حاکموں اور عوام کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ ان خود ساختہ لیڈروں کو خطرہ تھا کہ اگر آزاد انتخابات عمل میں آئے تو ان میں اکثر کے منتخب ہونے کا بہت کم امکان ہے۔ اس لئے ان کی کوشش یہ رہی کہ انتخابات کو جہاں تک ہوسکے عمل میں نہ آنے دیا جائے،

میں چلی گئی اِس کے باوجود ہندوستان کو اپنی فوج پر ہر سال دو سو کروڑ روپئے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح ملک کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ دفاع پر صرف ہوجاتا ہے۔ پاکستان کی حالت شاید اس سے بھی بدتر ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں اس کے پاس زمین اور فوج صرف ایک چوتھائی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی آمدنی میں سے کم از کم سو کروڑ روپیہ دفاع پر خرچ کرتا ہے یہ رقم اس امداد کے علاوہ ہے جو اسے امریکہ سے ملتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ قومی وسائل کا کتنا بے جا صرف ہے! اگر یہی رقم معاشی ارتقا کے کاموں پر خرچ کی جائے تو ملک کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوسکتی ہے۔

مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ جغرافیائی صورت حال ان کے لئے ناموافق ہے۔ مسلمان سارے برِ صغیر میں کچھ اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ ایک سمٹے ہوئے علاقے میں ان کی الگ ریاست بنانا ناممکن تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مشرق اور شمال مغرب میں تھے۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو ایک بہت بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کرسکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، لسانی،

وہ درست نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کیبنٹ مشن کے دوران قیام میں جو اسکیم میں نے مرتب کی تھی اور جسے مشن نے بڑی حد تک منظور بھی کرلیا تھا، وہ ہر حیثیت سے ہمارے مسائل کا بہترین حل تھی۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ اگر ہم ثابت قدم رہتے اور تقسیم منظور کرنے پر رضا مند نہ ہوتے تو سلامتی اور شان و شوکت دونوں کے اعتبار سے ہمارا مستقبل بہتر ہوتا۔

کیا کوئی اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ پاکستان نے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کیا بلکہ اسے اور زیادہ شدید اور ضرر رساں سا دیا ہے؟ تقسیم کی بنیاد ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیاں عداوت پر رکھی گئی تھی۔ پاکستان کی تشکیل نے اس منافرت کو ایک آئینی شکل دے دی جس کا حل اور بھی مشکل ہوگیا۔ اس صورت حال کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ برِ صغیر دو ریاستوں میں تقسیم ہوگیا جو ایک دوسرے کو نفرت اور ہراس کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ پاکستان کو یقین ہے کہ ہندوستان اسے چین سے نہیں رہنے دے گا اور جب بھی موقع ملے گا اسے نیست و نابود کردے گا۔ اِدھر ہندوستان سمجھتا ہے کہ اگر پاکستان کو موقع ملا تو وہ اس پر حملہ کردے گا۔ اس خوف و ہراس نے دونوں ملکوں کو اپنے دفاع کا خرچ بڑھانے پر مجبور کردیا ہے۔ جنگ کے بعد پورے غیر منقسم ہندوستان کے دفاع پر کل سو کروڑ روپئے خرچ ہوتے تھے۔ خود لارڈ ویول کا خیال تھا کہ یہ رقم فوج کی تینوں شاخوں کے لئے کافی ہے پھر تقسیم عمل میں آئی۔ ایک چوتھائی فوج پاکستان کے حصے

ضمیمه

سر اسٹیفرڈ کرپس نے برطانوی حکومت کی طرف سے حسب ذیل اعلان شائع کیا :

ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں وعدوں کے ایفا کے متعلق جو تردد برطانیہ میں اور ہندوستان میں ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے، ہز مجسٹی کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ صاف اور صریح الفاظ میں بیان کردے کہ ہندوستان میں جلد از جلد خود مختار حکومت قائم کرنے کی خاطر وہ کون سے قدم اٹھانا چاہتی ہے مقصد یہ ہے کہ ایک نئی انڈین یونین بنائی جائے، جو حیثیت کے لحاظ سے ایک ڈومینین ہو، جو تاج برطانیہ کی ماتحتی میں برطانیہ اور دوسری ڈومینیوں کے ساتھ شریک ہو، مگر ہر اعتبار سے ان کے برابر درجہ رکھتی ہو اور اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں کسی طرح بھی پابند نہ ہو. اس لئے ہز مجسٹی کی حکومت حسب ذیل اعلان کرتی ہے .

(۱) جنگ ختم ہوتے ہی ایک منتخب شدہ جماعت کو، جس کی ترتیب کا طریقہ بعد میں بیان کیا گیا ہے، بروئے کار لانے کی کارروائی کی جائے گی. اس جماعت کو ہندوستان کے لئے ایک نیا دستور مرتب کرنے کا ذمہ دار بنایا جائے گا.

(۲) دستور ساز جماعت میں ہندوستانی ریاستوں کی شرکت کا

معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو. لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں کو، یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہ کرسکا.

یہ صورت اس وقت تھی اور اب بھی ہے. کون اس کی توقع کرسکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں گے اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بن جائیں گے! خود مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد اپنے اپنے جدا گانہ مقاصد اور مفاد کے لئے کوشاں ہیں. بہرکیف اب تو جو کچھ ہونا تھا ہوچکا. پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے. اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراک عمل سے کام لیں. اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب و آلام کا باعث بن سکتی ہے. کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ اٹل تھا. اس کے برعکس دوسرے لوگوں کو یقین ہے کہ جو کچھ ہوا برا ہوا اور اس سے بچنا ممکن تھا ہم آج نہیں کہہ سکتے کہ دونوں میں کون درست ہے. یہ تو واقعات ہی سے ثابت ہوسکے گا کہ تقسیم کو قبول کرنا عقل اور مصلحت کی بات تھی.

دفعات ہوں گی. لیکن اس معاہدے میں کوئی ایسی شرط نہیں ہوگی جس سے انڈین یونین کے یہ طے کرنے کے اختیار میں کمی ہوجائے کہ وہ آئندہ برطانوی کامن ویلتھ کے دوسرے ارکان سے کیا تعلقات رکھے گا.

ہندوستانی ریاستوں میں سے ہر ایک کے ساتھ، چاہے وہ دستور کے مطابق چلنا پسند کرے یا نہ کرے، گفتگو کر کے اس معاہدے پر نظر ثانی کرنا ضروری ہوگا جو اس کے ساتھ کیا جاچکا ہے، جہاں تک کہ نئی صورت حال اس کی متقاضی ہو.

(٤) اگر ہندوستان کے اہم فرقوں کے لیڈر جنگ کے خاتمہ سے پہلے کسی اور طریقے پر متفق نہ ہوجائیں تو دستور ساز جماعت حسب ذیل صورت کے مطابق مرتب ہوگی.

جیسے ہی ان انتخابات کا نتیجہ معلوم ہوجائے گا، جن کا جنگ کے خاتمہ پر عمل میں آنا ضروری ہے، صوبوں کی قانون ساز مجلسوں کے ایوان زیریں کے جملہ ارکان ایک واحد انتخابی انجمن کی طرح دستور ساز جماعت کا انتخاب تناسب نمائندگی کے اصول پر کریں گے. اس نئی جماعت کے رکن تعداد میں انتخابی انجمن کے $\frac{1}{10}$ ہوں گے.

ہندوستانی ریاستوں کو بھی دعوت دی جائے گی کہ وہ نمائندے مقرر کریں. ان نمائندوں کے تعداد کی ریاستوں کی کل آبادی سے وہی نسبت ہوگی جو کہ مجموعی اعتبار سے برطانوی ہند کے نمائندوں کی اور ان کے اختیارات بھی وہی ہوں گے جو کہ برطانوی

انتظام اس طریقہ پر کیا جائے گا، جو ذیل میں درج ہے

(۳) ہز مجسٹی کی حکومت وعدہ کرتی ہے کہ اس طریقے پر جو دستور مرتب ہوگا اسے فوراً منظور کرکے عمل میں لائے گی، صرف ان شرطوں کے ساتھ کہ

(الف) برطانوی ہند کے ہر اس صوبے کو جو نئے دستور کو منظور کرنے پر راضی نہ ہو اس کا حق ہوگا کہ اپنی موجودہ دستوری حیثیت کو قائم رکھے، مگر دستور میں اس کی گنجائش رکھی جائے گی کہ اگر وہ چاہے تو بعد کو یونین میں شامل ہوجائے۔

ہز مجسٹی کی حکومت اس پر راضی ہوگی کہ ان صوبوں کے ساتھ جو یونین میں شامل نہ ہوں ایک نئے دستور کے مطابق معاملہ کرلے، بشرطیکہ صوبے خود ایسا چاہتے ہوں۔ اس دستور کے مطابق ان کی حیثیت وہی ہوگی جو کہ انڈین یونین کی، اور یہ دستور اسی طریقے پر مرتب ہوگا جو کہ ذیل میں درج ہے۔

(ب) ایک معاہدے پر دستخط ہوں گے جس کی شرطیں ہز مجسٹی کی حکومت اور دستور ساز جماعت کے درمیان گفتگو کے بعد مرتب ہوں گی۔ یہ معاہدہ ان تمام ضروری معاملات پر حاوی ہوگا جو اختیارات کو کلی طور پر انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوں گے۔ ہز مجسٹی کی حکومت نے نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کے جو وعدے کئے ہیں ان کے مطابق اس میں

اس رزولیوشن میں ہم نے مستقبل سے متعلق کئی اہم اور دور رس تجاویز سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ ان تجاویز پر مزید غور و خوض کرنے سے ان کے بارے میں ہمارا خیال اور بھی پختہ ہوگیا ہے اور ہم اس بات کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان تجاویز کو ان کی موجودہ شکل میں قبول نہیں کرسکتے ہیں۔ ان تجاویز پر پورے طور سے غور کرنے کے بعد ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کا اظہار ورکنگ کمیٹی کے اس رزولیوشن سے ہوتا ہے۔

اس رزولیوشن میں صورت حال کی نزاکت پر زور دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ہم جو بھی آخری فیصلہ کریں گے اس کا دار و مدار اُن تبدیلیوں پر ہوگا جو اس وقت عمل میں لائی جائیں گی فی الحال ہم سب کے اور خصوصاً تمام ہندوستانیوں کے لئے جو مسئلہ سب پر حاوی ہے وہ جارحانہ اقدامات اور حملوں کے خلاف ملک کے دفاع کا ہے۔ مستقبل کی اہمیت مسلّم سہی مگر وہ اس پر منحصر ہے کہ اگلے چند مہینوں یا برسوں میں کیا واقعات رونما ہوتے ہیں چنانچہ ہم اس بات پر آمادہ تھے کہ مستقبل کے بارے میں یقین دہانی پر اصرار نہ کریں تاکہ یہ امید کریں کہ ملک کے دفاع کے لئے اپنی قربانیوں کے ذریعے ہم ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کی ٹھوس اور مستحکم بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر ہم نے اپنی تمام تر توجہ حال کی طرف مرکوز کی۔

مجوزہ اعلان کی شق (e) میں حال کے بارے میں آپ کی تجاویز بہت مبہم اور نامکمل تھیں، سوا اس کے یہ بات واضح

ہند کے نمائندوں کے. یہ بات ناگزیر ہے کہ اس نازک صورت حال میں جو کہ ہندوستان کے لئے اس وقت ہے اور اس مدت تک جب کہ ہندوستان کا نیا دستور بن جائے ہز مجسٹی کی حکومت ہندوستان کے دفاع کی ذمہ دار رہے اور عالم گیر جنگی جد و جہد کے ایک حصہ کے طور پر ہندوستان کے دفاع کو اپنے ہاتھ اور اپنے اختیار میں رکھے، مگر ہندوستان کے پورے فوجی، اخلاقی اور مادی وسائل کو بروئے کار لانے کا فرض ہندوستانی قوم کی اعانت کے ساتھ حکومت ہند کے ذمہ ہوگا. ہز مجسٹی کی حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستانی قوم کے اہم فرقوں کے لیڈر فوراً اور موثر طریقے پر اپنے ملک، برطانوی کامن ویلتھ اور متحدہ اقوام کے مشوروں میں شریک ہوں اور وہ انہیں اس کی دعوت بھی دیتی ہے. اس طرح وہ ایک فرض کی انجام دہی میں جو ہندوستان کی آنے والی آزادی کے لئے نہایت اہم اور ناگزیر ہے سرگرمی کے ساتھ اور مفید طریقے پر مدد کرسکیں گے.

سر اسٹیفرڈ کرپس سے خط و کتابت

برلا پارک، نئی دہلی،
۱۰ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

ڈیئر سر اسٹیفرڈ

۲ اپریل کو میں نے آپ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا رزولیوشن بھیجا تھا جس میں کمیٹی نے ان تجاویز پر اظہار خیال کیا ہے جو آپ نے برطانوی حکومت کی طرف سے پیش کی ہیں.

گئی ہو عوامی مدافعت کے لئے قومی پس منظر کا ہونا ضروری ہے سپاہیوں اور شہریوں دونوں کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ وہ اپنے قومی لیڈروں کی سرکردگی میں ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں.

چنانچہ یہ مسئلہ صرف ہماری قومی آرزو ہی پوری کرنے کا نہیں رہا بلکہ در حقیقت جنگی کارروائیوں کو موثر بنانے اور ہندوستان پر حملہ کرنے والے کا آخری دم تک مقابلہ کرنے کا معاملہ بن گیا. عام اصولوں کے مطابق قومی حکومت وزیر دفاع کے ذریعے دفاعی معاملات کو اپنے قابو میں رکھتی ہے اور فوج ایسے کمانڈر انچیف کے تحت ہوتی ہے جسے جنگ سے متعلق عملی کارروائیوں میں مصلحت سے کام لینے کا پورا اختیار ہو. عام دستور کے مطابق ہندوستان کی قومی حکومت کو بھی یوں ہی عمل کرنا چاہئے. ہم نے یہ بات واضح کردی تھی کہ کمانڈر انچیف کو فوج، جنگی کارروائیوں اور اس سے متعلق معاملات پر پورا اختیار ہوگا. صرف مصلحت کی خاطر ہم اس پر تیار تھے کہ وزیر دفاع کے رواجی اختیارات کو بعض اعتبار سے محدود کردیا جائے. ہم یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ دوران جنگ میں موجودہ فوجی انتظامات کو تہ و بالا کردیں. ہم نے یہ بھی منظور کرلیا تھا کہ جنگ سے متعلق اعلیٰ حکمت عملی لندن کی وار کیبنٹ کے اختیار میں رہے اور اس کیبنٹ میں ایک ہندوستانی ممبر ہو. ہمارا فوری مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے دفاع کو زیادہ موثر اور مستحکم بنایا جائے، اس کی بنیاد عوام کے حوصلے اور ارادے پر رکھی جائے.

کردی گئی تھی کہ ملک کے دفاع کی تمام تر ذمہ داری برطانوی سرکار پر ہوگی۔ در اصل اس تجویز میں ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہم آج کی مہموں میں شریک ہوں تاکہ مستقبل میں ملنے والی آزادی کا تعین ہوجائے۔ آزادی آج کے لئے نہیں بلکہ ایک غیر متعین مستقبل کے لئے تھی۔ شق (e) میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں تھا کہ زمانہ حال میں کیا انتظامات کئے جائیں گے اور حکومت کے انتظام میں کس قسم کی تبدیلی عمل میں لائی جائے گی۔ جب اس ابہام کی طرف توجہ دلائی گئی تو آپ نے کہا کہ ایسا عمداً کیا گیا تھا تاکہ آپ دوسروں سے مشورہ کرکے آزادی کے ساتھ ان تبدیلیوں کے بارے میں فیصلہ کرسکیں۔ آپ نے گفتگو میں اس کی وضاحت کی۔ اس سے ہم سمجھے کہ آپ کے ذہن میں ایسی قومی حکومت کا تصور ہے جس کے اختیار میں ہر معاملہ ہوگا۔

دفاع کا معاملہ ہر حال میں اور خاص کر دوران جنگ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اسے چھوڑ دیا جائے تو حکومت کا دائرہ عمل بہت محدود ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ظاہر تھی کہ آپ کی تجاویز اور ہماری گفتگو کا تمام تر مقصد ہندوستان پر حملے کے خطرے سے پیدا شدہ فوری مسائل کا حل تلاش کرنا ہے ایسی صورت میں قومی حکومت کے لئے لازمی ہوجاتا ہے کہ دفاع کے مخصوص انتظامات پر توجہ کرے، جہاں تک ہوسکے دفاع کو ایک عوامی منصوبہ بنائے اور ساتھ ہی پوری قوم میں حملہ آور کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کرے۔ اس کا حق صرف ایسی حکومت ادا کرسکتی ہے جس پر اس کی ذمہ داری ڈالی

تھا جو نتیجہ کے طور پر نکلتی ہیں مگر اہم نہیں ہیں باقی باتوں کو اس وقت کے لئے چھوڑا جاسکتا ہے جب اور انتظامات کئے جائیں گے اور معاملات کو ترتیب دی جائے گی. آپ کو یاد ہوگا کہ فرانس کے ہتھیار ڈالنے سے چند روز قبل برطانیہ کے وزیر اعظم نے برطانیہ اور فرانس کو متحد کرنا تجویز کیا تھا اس سے بڑی اور اس سے اہم بنیادی تبدیلی تصور نہیں کی جاسکتی اور یہ تبدیلی بہت ہی شدید خطرے اور بحران کے وقت میں تجویز کی گئی. جنگ تبدیلیوں میں اور تیزی پیدا کرتی ہے اسے قیام اور سکوت کے تصورات سے کوئی مناسبت نہیں ہے.

آپنے دفاع کا جو فارمولا ہمیں بھیجا تھا اس پر غور کرتے وقت ہم نے وہ ضمیمہ بھی سامنے رکھا جس میں محکمہ دفاع کو منتقل ہونے والے معاملوں یا شعبوں کی فہرست تھی اس فہرست نے ہماری آنکھیں کھول دیں کیونکہ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ وزیر دفاع کو ایسے معاملات میں اختیار ہوگا جو نسبتاً غیر اہم ہیں یہ بات ہمیں بالکل منظور نہیں تھی. چنانچہ اس کی اطلاع آپ کو دیدی گئی.

اس کے بعد دفاع کا ایک نیا فارمولا ہمارے سامنے پیش کیا گیا جس کے ساتھ شعبوں کی کوئی فہرست نہیں تھی. یہ فارمولا ہمیں زیادہ معقول نظرئے پر مبنی معلوم ہوا. ہم نے اس میں کچھ تبدیلیاں تجویز کیں اور ساتھ ہی اس طرف بھی اشارہ کیا کہ شعبوں کی تقسیم بعد ہی ہم کوئی قطعی فیصلہ کر سکیں گے. اس فارمولے پر نظر ثانی کے بعد اسے دوبارہ ہمارے پاس بھیجا گیا

ضابطہ پرستی ، تاخیر اور نا قابلیت کو ہر طرح سے دور کیا جائے . فنی اور عملی معاملات میں ہماری مداخلت کا سوال ہی نہیں تھا . بلا شبہ ایک بات ہمارے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی ، یعنی ہندوستان کا تحفظ اور دفاع اس بنیادی شرط کو تسلیم کرلینے کے بعد کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس بند گلی میں ہم پہنچ گئے ہیں اس سے نکلنے کی ایسی راہ تلاش کرنے میں دشواری ہو جو عوام کی متفقہ خواہش کے مطابق ہو کیونکہ اس خواہش کو پورا کرنے کے معاملے میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے .

دفاع پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا اور آپ نے ۷ اپریل کو ایک خط لکھا جس میں دفاع کے بارے میں ایک فارمولا تھا. آپ نے اس خط میں لکھا تھا کہ « جیسا کہ ورکنگ کمیٹی خود سمجھتی ہے دوران جنگ میں موجودہ دستور میں کسی قسم کی تبدیلی عمل میں لانا ممکن نہیں ہے » . اس بارے میں ورکنگ کمیٹی کے روئیے کو سمجھنے میں فاش غلطی ہوئی ہے اور میں اس بات کو صاف کردینا چاہتا ہوں اگرچہ فوری طور پر یہ زیر بحث نہیں ہے . کمیٹی یہ نہیں مانتی کہ دوران جنگ میں دستور میں تبدیلی کرنا فی نفسہ دشوار ہوگا. ہر وہ کارروائی جس سے جنگ میں مدد مل سکتی ہو کی جاسکتی ہے ، بلکہ اسے ضرور کرنا چاہئے. لڑائی صرف اسی طرح لڑی اور جیتی جاسکتی ہے . پیچیدہ قوانین بنانے کی ضرورت نہیں ہے . آمادگی شرط ہے ورنہ ہندوستان کی آزادی اور اس کے حق خود مختاری کو تسلیم کرکے چند تبدیلیاں عمل میں لانا مشکل نہ

ہیں ۔ لیکن عملاً اس کا کوئی امکان نہیں ہوگا کیونکہ کاموں کی تقسیم ہوچکی ہے ۔ اس طرح گویا اب نئی اور پرانی فہرست کے درمیان کوئی اہم فرق نہیں ہے اور یہ فرق کسی بھی نئی فہرست میں ہوگا جو تیار کی جائے ۔ اگر واقعی ایسا تھا اور ہم کو وہیں واپس آنا تھا جہاں سے ہم نے گفتگو شروع کی تھی تو پھر ہمارے لئے کسی نئے فارمولے کے تلاش کرنے سے کیا فائدہ تھا ۔ اسی پرانی بات کو دوسرے الفاظ میں دہرانے سے کیا فرق پڑتا ہے آپ سے گفتگو کے دوران کئی اور باتیں بھی واضح ہوگئیں جو بدقسمتی سے ہمارے ناموافق ہیں ، آپ نے آج کی گفتگو اور عام بیانات میں ایک نیشنل گورنمنٹ اور وزرا پر مشتمل ایک کابینہ کی طرف اشارہ کیا ۔ یہ الفاظ خاص معانی رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ نئی حکومت کو کابینہ کے پورے اختیار حاصل ہونگے اور وائسرائے ایک دستوری صدر کے فرائض انجام دے گا ۔ لیکن آپ نے جو نئی تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے وہ یہاں کی حکومت کی پرانی تصویر سے زیادہ مختلف نہیں ہے ۔ قماش وہی ہے صرف تفصیل کا فرق ہے اس نئی حکومت کو نیشنل گورنمنٹ کہنا ایک مبہم اور خلاف واقعہ بیان ہوگا اور یہ قومی حکومت کی حیثیت سے کام بھی نہیں کرسکے گی ۔ دراصل اس میں بس وائسرائے ہوگا اور اس کی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل اور اس میں وائسرائے کو اس کے تمام پرانے اختیارات حاصل ہونگے ۔ ہم نے کسی قانونی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن اس بارے میں ہم نے یقین دہانی ضرور چاہی تھی کہ نئی حکومت ایک آزاد حکومت

اور اسی کے ساتھ محکمہ جنگ کے منصب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔

اس فارمولے کو ایسے بسیط اور ہمہ گیر طریقے پر ترتیب دیا گیا تھا کہ ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ محکمہ دفاع اور محکمہ جنگ کے درمیان کاموں کی واقعی تقسیم کیا ہوگی؟ چنانچہ ہم نے استدعا کی کہ ہمیں ان کاموں کی فہرست مثالوں کے ساتھ مہیا کی جائے تاکہ ہم معاملے پر غور کر سکیں۔ ایسی فہرست ہم کو نہیں بھیجی گئی۔

کل آپ سے گفتگو کے دوران میں اس نئے فارمولے پر تبادلۂ خیال ہوا۔ ہم نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں جو باتیں میں نے کہیں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک فارمولے کی عبارت کا سوال ہے، وہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے اور نہ اسے ہم اپنے راستے میں حائل ہونے دینا چاہتے ہیں تا وقتیکہ وہ کسی بنیادی اصول پر اثر انداز نہ ہو۔ لیکن فارمولے کی عبارت کے پس پشت کچھ خیالات تھے اور یہ جان کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ پچھلے چند دنوں میں ہم جن مفروضات کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ غلط تھے۔

جب ہم نے دونوں محکموں کے کاموں کی تفصیلی فہرست طلب کی تو آپ نے محکمہ دفاع کی کاموں کی اس پرانی فہرست کا حوالہ دیا جو آپ ہمیں پہلے بھیج چکے تھے اور جسے ہم منظور نہیں کرسکتے تھے۔ ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ باقی ماندہ ذمہ داریوں میں سے کچھ اور اس فہرست میں شامل کی جاسکتی

کو جلد ہی ختم کردیا جائے گا کیونکہ یہ نئے زمانے میں کھپتا نہیں ہے۔ لیکن اب ہمیں بتلایا جارہا ہے کہ گذشتہ دور کی یہ ناپسندیدہ یادگار بھی باقی رکھی جائیگی۔ غرضیکہ حکومت کا نقشہ جس کے اہم خد و خال سب پرانی ہی تصویر جیسے ہیں کچھ ایسا ہے کہ ہم اس میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں نکال سکتے۔ معمولی حالات میں ہم اس معاملے کو آسانی سے ختم کر دیتے کیونکہ یہ اس منزل سے بہت دور ہے جہاں پہنچنے کی ہم اب تک کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم ہر ایسی تجویز پر پوری طرح غور کرنے کے لئے آمادہ ہیں جس کا نتیجہ ہندوستان کے دفاع کا زیادہ موثر انتظام ہو۔ ہندوستان کو اس وقت جو خطرہ لاحق ہے اس کا اثر ہم پر پڑتا ہے کسی غیر ملکی پر نہیں پڑسکتا اور ہم اپنے بس بھر اس خطرے کا مقابلہ کرنے اور اس پر قابو پانے کے خواہش مند بلکہ آرزو مند ہیں۔ لیکن ہم ذمہ داریاں قبول نہیں کرسکتے۔ جب تک کہ ہمیں ذمہ داریوں کا پورا حق ادا کرنے کی آزادی اور اختیار نہ دیا جائے اور جب تک وہ ماحول برقرار رہے جو قومی جدوجہد کے لئے ایک رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

اگرچہ ہم کو آپ کی پیش کردہ تجاویز منظور نہیں ہیں پھر بھی ہم آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ حقیقی نیشنل گورنمنٹ بنا دی جائے تو ہم ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہیں۔ ہم اس پر بھی آمادہ ہیں کہ فی الحال مستقبل کے بارے میں کوئی سوال نہ اٹھائیں، گو جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کرچکے ہیں کہ مستقبل کے

ہوگی جس کے اراکین دستوری کابینہ کے ممبروں کی طرح کام کریں گے۔ جہاں تک جنگ اور متعلقہ معاملات کا سوال ہے کمانڈر انچیف کو آزادی ہوگی اور وہ وزیر جنگ کی طرح کام کریگا۔

ہمیں یہ جواب دیا گیا کہ فی‌الحال مبہم اور غیر متعین طریقے سے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حکومت اور وائسرائے کو دستوری رسموں کے ماتحت کام کرنا چاہئے اس کا امکان بہر حال ہوگا کہ ایکزیکیوٹیو کے ممبران وائسرائے سے اختلاف کی صورت میں مستعفی ہو جائیں یا استعفے کی دھمکی دیں۔ استعفے کو تدارک یا علاج کے طور پر تو استعمال کیا ہی جاسکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم نئی حکومت کے بارے میں اپنے تصورات کی بنیاد شروع ہی سے اختلاف اور استعفے کے امکان پر رکھیں۔ اس لئے حکومت کا جو نقشہ اب ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ ماہیت کے اعتبار سے پچھلے نقشے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ہمارا اور یقیناً آپ کا بھی مقصد عوام میں ایک نئی ذہنیت پیدا کرنا ہے تاکہ وہ سمجھیں کہ ان کی اپنی قومی حکومت برسر اقتدار آگئی ہے اور وہ اپنی نئی حاصل کردہ آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ عوام کے سامنے اگر پھر وہی پرانے نقشے انہیں پرانی سرخیوں کے ساتھ رکھے گئے تو ہمارا مقصد بالکل فوت ہو جائے گا۔ انڈیا آفس کا قائم رہنا جو ہمارے لئے ظلم کی علامت ہے اس کی تصدیق کرے گا کہ حکومت کا نقشہ بدلا نہیں ہے۔ کچھ عرصے سے یہ ایک تقریباً طے شدہ بات سمجھی جاتی ہے کہ انڈیا آفس

اپنی جانیں دے رہے ہیں۔

آپ کا مخلص
دستخط : ابو الکلام آزاد

۱۱ اپریل کو کرپس نے مجھے حسب ذیل جواب دیا۔
نمبر ۳، کوین وکٹوریا روڈ،
نئی دلی، ۱۱ اپریل سنہ ۱۹٤۲ء
مائی ڈیر مولانا صاحب،

آپ کا ۱۰ اپریل کا خط جس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہز مجسٹی کی حکومت کے اعلان کو نامنظور کیا ہے مجھے ملا اور اسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔

میں ان مسائل پر بحث نہ کروں گا جن کا ورکنگ کمیٹی کے پہلے ریزولیوشن میں، جس کی نقل آپ نے مجھے بھیجی تھی، ذکر آچکا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ آپ کے فیصلے کا سبب یہ مسائل نہیں ہیں۔

میں یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف بحیثیت وزیر جنگ کے درمیان اختیارات اور فرائض کی تقسیم کے بارے میں کچھ کہوں، اگرچہ آپ نے اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس تقسیم میں وزیر دفاع کے سپرد تمام امور کئے گئے تھے سوا ان کے کہ جن کا جنرل ہیڈ کوارٹرز، نیوی ہیڈ کوارٹرز اور ایر ہیڈ کوارٹرز سے تعلق ہے اور جو اس لحاظ سے کمانڈر انچیف کے ماتحت ہیں کہ وہ ہندوستان میں افواج

بارے میں ہمارے کچھ معین تصورات ہیں۔ لیکن اس وقت بھی جو نیشنل گورنمنٹ بنے وہ کابینہ کی حکومت ہونی چاہئے جسے پورے اختیارات حاصل ہوں اور محض وائسرائے کی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کی توسیع نہ ہو۔ دفاع کے بارے میں ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اب اس کی شکل کیا ہونی چاہئے۔ ہمارا خیال ہے کہ نیشنل گورنمنٹ کو موثر بنانے کے لئے کم سے کم یہ انتظام تو ہونا ہی چاہئے۔ اس کے بغیر عوام کے دلوں پر وہ اثر بھی نہ ہوگا جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔

ہم آپ کو اس بات کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو تجاویز ہم نے رکھی ہیں وہ صرف ہماری ہی نہیں ہیں بلکہ انہیں ہندوستان کے عوام کا متفقہ مطالبہ سمجھنا چاہئے اس مسئلے پر مختلف پارٹیوں اور گروہوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے جو کچھ اختلاف ہے وہ بحیثیت مجموعی ہندوستانی عوام اور برطانوی حکومت کے درمیان ہے۔ خود ہندوستانیوں میں جو اختلافات ہیں وہ مستقبل کی دستوری تبدیلیوں کے بارے میں ہیں۔ ہم اس مسئلے کو فی الحال ملتوی رکھنے پر رضامند ہیں تاکہ موجودہ بحران میں ہندوستان کے دفاع کے لئے زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل ممکن ہوسکے۔ اس وقت جب کہ سارا ملک اس بات پر متفق ہے، اگر خود برطانوی حکومت آزاد نیشنل گورنمنٹ کے قیام میں مانع ہوئی تو یہ بہت افسوسناک بات ہوگی اور اس سے صرف ہندوستان ہی کے مقصد کو نہیں بلکہ ان وسیع تر مقاصد کو نقصان پہنچے گا جس کے لئے کروڑوں انسان

اس کے لئے کمانڈر کی وحدت لازمی ہے۔

آپ نے قومی حکومت میں شریک ہونے سے جو انکار کیا ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ حکومت کی جو شکل تجویز کی گئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کی بدولت آپ اپنے حسب منشا ہندوستان کے لوگوں کو یکجا کرسکیں۔

آپ نے دو تجویزیں پیش کی ہیں، پہلی یہ ہے کہ اس وقت دستور بدلا جائے۔ اس سلسلے میں میں یہ کہوں گا کہ آپ نے یہ تجویز پہلی مرتبہ کل رات کو پیش کی جب آپ کے پاس ہماری تجویزوں کو پہنچے ہوئے تین ہفتے ہوچکے تھے، اور اس کے علاوہ میں یہ بھی کہوں گا کہ دوسرے نمائندوں میں سے ہر ایک نے جس سے میں نے اس رائے کے متعلق گفتگو کی یہ مان لیا ہے کہ جنگ کے دوران میں اور ایسے موقعے پر جیسے کہ اس وقت اس طرح کی کوئی قانونی تبدیلی عملاً ناممکن ہوگی۔

آپ کی دوسری تجویز یہ ہے کہ ایک قومی حکومت بنائی جائے جو صحیح معنوں میں قومی ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے اختیارات رکھنے والی کابینی حکومت ہو۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ناممکن ہوگا بغیر اس کے کہ بہت ہی پیچیدہ نوعیت کی دستوری تبدیلیاں بہت بڑے پیمانے پر کی جائیں۔

اگر موجودہ حالات میں ایسا نظام حکومت دستوری رسموں کے ذریعہ عمل میں لایا جائے تو نامرد کردہ کابینہ (جسے غالباً ملک کی بڑی سیاسی پارٹیاں نامرد کریں گی) اپنے سوا کسی کے رو برو ذمہ دار نہ ہوگی۔ اسے برطرف نہ کیا جاسکے گا اور درحقیقت

کا افسر اعلیٰ ہے۔

دفاع کے محدود شعبے کے ان کاموں کے علاوہ باقی تمام معاملے جن کا تعلق اسی شعبے سے ہے ایسے نمائندہ حیثیت رکھنے والے ہندوستانیوں کے سپرد کرنا تجویز کیا گیا تھا جو ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کے ممبر ہوتے۔ مثلاً

ہوم ڈپارٹمنٹ میں اندرونی نظم و نسق، پولیس، ریفیوجی وغیرہ۔

فینانس ڈیپارٹمنٹ میں جنگ سے متعلق تمام مالی مسائل۔

کمیونی کیشنز ڈیپارٹمنٹ میں: ریلیں، سڑکیں، نقل و حمل وغیرہ۔

سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں: تمام افواج کے لئے ضروریات اور گولہ بارود کی فراہمی۔

انفورمیشن اور براڈ کاسٹنگ ڈیپارٹمنٹ۔ پروپگنڈا، اشاعت و اشتہار وغیرہ۔

سول ڈفنس ڈیپارٹمنٹ: اے۔ آر۔ پی۔ اور سول دفاع کی تمام صورتیں۔

لیجسلیٹو ڈپیارٹمنٹ: قاعدے اور احکامات۔

لیبر ڈیپارٹمنٹ: ضروری آدمیوں کی فراہمی۔

ڈفنس ڈیپارٹمنٹ: انتظام اور ہندوستانی ملازم وغیرہ۔

کمانڈر انچیف کے ماتحت ہندوستان کے دفاع کے فوری انتظامات کو خطرے میں ڈالے بغیر منتخب ہندوستانی ممبروں کو دفاعی محکموں میں اس سے زیادہ اختیارات نہیں دئے جاسکتے تھے۔ دفاع کا یہ نظام جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہز مجسٹی کی حکومت کا اعلیٰ فرض اور ذمہ داری ہے اور اتحادی ہندوستان کی جو مدد کررہے ہیں

اگرچه ہمارے حیال میں ہندوستان کے مختلف فرقوں اور حصوں کو صرف انہیں شرطوں کے ماتحت متحد کیا جاسکتا ہے.

آپ کا مخلص

دستخط : سٹیفرڈ کرپس

میرا ارادہ ہے کہ اس حواب کو شائع کر دوں

میں نے اُسی رور حواب لکھا

برلا ہاؤس

البوقرق روڈ۔ نئی دہلی

۱۱ اپریل سنه ۴۲ء

ڈیئر سر اسٹیفرڈ:

آپ کا دس اپریل کا حط مجھے ابھی ملا. اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اسے پڑھ کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہت تعحب ہوا. چونکہ اس کا حواب فوراً دے رہا ہوں اس لئے حو مسائل آپنے اٹھائے ہیں ان میں سے کچھ ہی کے بارے میں مختصراً لکھ سکتا ہوں.

ہمارے اصل رزولیوشن میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ بہت اہم ہیں اور برطانوی تحاویر کے بارے میں کمیٹی کی سوچی سمجھی رائے کی حیثیت رکھتی ہیں. لیکں حیسا ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں چونکہ ہم اس حطرے کے وقت ملک کے دفاع اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے متمنّی ہیں. اس لئے وہ تجاویز جو مستقبل کے بارے میں ہیں فی الحال ملتوی رکھی جا سکتی ہیں. لیکن یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لینے کا سوال تب ہی اٹھتا ہے جب

وہ اکثریت کی غیر محدود آمریت ہو گی۔

اس تجویز کو ہندوستان کی تمام اقلیتیں رد کر دیں گی کیونکہ اس طرح وہ سب کابینہ کی مستقل اور استبدادی اکثریت کے ماتحت ہو جائیں گی ہز مجسٹی کی حکومت نے ان اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے جو وعدے کئے ہیں ان سے بھی یہ تجویز ہم آہنگ نہ ہوگی۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں فرقہ واری اختلافات اب بھی اتنے گہرے ہیں اس طرح کی اکثریت کی غیر ذمہ دار حکومت نہیں ممکن ہے۔

اس کے علاوہ ہز مجسٹی کی حکومت مجبور ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے ان بڑے حصوں کے متعلق جس سے اس نے وعدے کئے ہیں اپنے فرائض کی انجام دہی جاری رکھے جب تک کہ ہندوستان کے لوگ اپنا نیا دستور وضع نہ کرلیں

دستور میں ایسی مکمل تبدیلی کئے بغیر جس کے بارے میں عام طور سے اعتراف کیا جاتا ہے کہ موجودہ حالات میں ناقابل عمل ہو گی ہز مجسٹی کی حکومت نے اپنی تجویروں میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جاسکتا تھا وہ پیش کیا ہے اس طرح اگرچہ میں اور ہز مجسٹی کی حکومت دونوں مانتے ہیں کہ آپ کی ورکنگ کمیٹی دشمن کے خلاف ہر طریقے سے جو اس کے امکان میں ہے جنگ جاری رکھنے کی سخت خواہشمند ہے ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی ورکنگ کمیٹی ان شرطوں پر جو ہم نے خلوص کے ساتھ پیش کی تھیں جنگ کی سرگرمیوں میں شریک ہونے پر آمادہ نہ ہوسکی

سرکار کے اعلیٰ فرائض اور ذمہ داری کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس ذمہ داری سے موثر طریقے سے عہدہ برآ ہونا اس وقت تک نا ممکن ہے جب تک ہندوستانی عوام کو ذمہ داری نہ سونپی جائے اور انہیں یہ محسوس نہ کرایا جائے کہ وہ واقعتاً ذمہ دار ہیں۔ ماضی قریب اس امر کا شاہد ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت ہند یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جنگ صرف جمہوری بنیاد پر ہی لڑی جا سکتی ہے۔

آپ کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ تین ہفتوں بعد اب ہم پہلی بار دستور میں تبدیلی کا سوال اٹھا رہے ہیں۔ دورانِ گفتگو میں ہم نے کئی بار اس طرف اشارہ کیا لیکن یہ درست ہے کہ ہم نے اس پر زور نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نئے مسائل نہیں کھڑے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اپنے خط میں آپ نے واضح طور پر یہ کہا کہ ہم اس پر رضامند ہیں کہ دوران جنگ میں دستور میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، تو آپ کی اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے ہمیں اس کی تردید کرنی پڑی۔

آپ کے خط کا آخری حصہ پڑھ کر ہمیں تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس گفت و شنید کے دوران برطانوی حکومت کا رویہ روز بروز ہمارے خلاف ہوتا جا رہا ہے پہلی گفتگو میں جو کچھ ہم سے کہا گیا تھا، اب اس سے یا تو انکار کیا جارہا ہے یا اس کی تاویلیں کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک نیشنل گورنمنٹ

ذمہ داری اور اقتدار حقیقی ہو۔

جہاں تک وزیر دفاع اور وزیر جنگ کے درمیان کاموں کی تقسیم کا سوال ہے آپ نے وہ فہرست مہیا نہیں کی جس کی ہم نے درخواست کی تھی۔ اس کے بجائے آپ نے وزیر دفاع کے کاموں کی پرانی فہرست کا حوالہ دیا جو آپ جانتے ہیں کہ ہمیں بالکل منظور نہیں ہے۔ اپنے حالیہ خط میں آپ نے کچھ معاملوں کا ذکر کیا ہے جس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ سے تعلق ہے اور جو دوسرے شعبوں کے تحت ہوں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ جہاں تک وزیر جنگ کا تعلق ہے اس کا دائرہ اختیار آپ کی بھیجی ہوئی فہرست کے مطابق ہوگا۔

کمانڈر انچیف کے ان اختیارات پر جو معمول کے مطابق ہیں کسی نے بھی کوئی پابندی عائد کرنا تجویز نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہم نے فراخ دلی سے کام لیا اور اس پر بھی رضامند تھے کہ اسے بحیثیت وزیر جنگ کچھ مزید اختیارات دے دئیے جائیں۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ دفاع سے متعلق ہمارے اور برطانوی حکومت کے نظرئیے میں بڑا اختلاف ہے۔ ہم دفاع کو ایک قومی رنگ دے کر ہندوستان کے ہر مرد اور عورت کو اس میں شرکت کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب اپنے عوام پر بھروسہ کرنا اور اس سعیِ عظیم میں اُن کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ جہاں تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نظریہ ہندوستانی عوام پر عدم اعتماد اور انہیں اصل اقتدار سے محروم رکھنے پر مبنی ہے۔ آپنے دفاع سے متعلق برطانوی

کابینہ کی تشکیل کیسے ہو اور وہ کس طرح کام کرے۔ پہلے یہ بیادی مسئلہ حل ہونا تھا کہ برطانوی حکومت کس حدتک ہندوستانی عوام کو اقتدار سونپنے پر آمادہ ہے۔ اسی لئے ہم نے کبھی اس کا حوالہ نہیں دیا نہ اس پر گفتگو کی۔ اس کے باوجود آپ نے یہ مسئلہ پہلی بار اب اُس خط میں اٹھایا ہے جو غالباً آپ کا آخری خط ہے۔ اس طرح آپ نے اصل اختلافی مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کی ہے جو حق بجانب نہیں ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اپنی پہلی ہی گفتگو کے دوران میں نے کہا تھا کہ اس منزل پر فرقہ وارانہ یا اور اس طرح کے دوسرے مسائل نہیں اُٹھتے جوں ہی برطانوی حکومت اصل اقتدار اور ذمہ داری منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیگی، متعلقہ لوگ باقی مسائل کامیابی کے ساتھ خود حل کرلینگے۔ آپ کے انداز سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ اس نقطہ نظر سے متفق ہیں۔

ہم کو یقین ہے کہ اگر برطانوی حکومت ایسی پالیسی اختیار نہ کرے جس سے تفرقہ بڑھتا ہے تو ہم سب خواہ وہ کسی پارٹی یا گروہ سے متعلق ہوں، مل جل کر ایک مشترکہ لائحہ عمل پر متفق ہو جائینگے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس شدید خطرے کے وقت بھی برطانوی حکومت اپنی تباہ کن پالیسی سے دست کش نہیں ہو پارہی ہے مجبوراً ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ برطانوی حکومت حملے اور جارحانہ کارروائیوں کے خلاف ہندوستان کے موثر دفاع کے مقابلے میں اس بات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے کہ ہندوستان پر امکانی مدت تک اپنی گرفت قائم رکھے اور اسی

قائم کی جائے گی جو کابینہ کی طرح کام کرے گی اور وائسرائے کی اس میں وہی حیثیت ہوگی جو انگلستان کے بادشاہ کی اپنی کابینہ کے روبرو ہے۔ انڈیا آفس کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ آپ کو تعجب تھا کہ کسی نے اس اہم مسئلے کو نہیں اٹھایا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ عملی شکل یہی ہے کہ اسے ڈومینین کے دفتر سے متعلق یا اس میں ضم کردیا جائے۔

یہ ساری تصاویر جو آپ نے ہمارے سامنے کھینچی تھی اسے اب اس گفتگو نے بالکل بگاڑ دیا جو ہماری آخری ملاقات میں آپ سے ہوئی۔

اپنے حالیہ خط میں آپ نے ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جس کا دوراں گفتگو میں کبھی ذکر نہیں آیا۔ آپ نے اکثریت کی کامل آمریت کا حوالہ دیا ہے۔ اس مرحل پر یہ بیان دینا بہت تعجب خیز بات ہے۔ ہنگامی صورت حال کے مقابلے کے لئے جو بھی مخلوط کابینہ بنائی جائیگی اُسے قدرتاً دقت پیش آئیگی لیکن اس سے بچنے کی بہت سی راہیں نکل سکتی ہیں۔ اگر آپ نے یہ مسئلہ پہلے اٹھایا ہوتا تو اس پر گفتگو ہو سکتی تھی اور کوئی اطمینان بخش حل تلاش کیا جاسکتا تھا۔ اب تک اس بارے میں صرف یہ تصور تھا کہ ایک مخلوط کابینہ ہی چاہئے جس کے اراکین کو آپس میں تعاون اور اشتراک عمل سے کام لینا چاہئے ہم نے اِسے منظور کیا۔ ہمیں اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ کانگریس برسر اقتدار آئے لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے ہندوستانی عوام کو آزادی اور اقتدار ملے۔ اس کا فیصلہ بعد میں کیا جاسکتا تھا کہ

ہندوستان سے برطانوی راج کا فوراً ختم کرنا نہ صرف ہندوستان ہی کے لئے بلکہ اقوام متحدہ کی کامیابی کے لئے اشد ضروری ہے اس حکومت کے قیام سے ہندوستان روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اس میں اپنی حفاظت کرسکنے اور دنیا کی آزادی کی جدوجہد میں معاون ہوسکنے کی استعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔

روس اور چین کے محاذ جنگ پر صورت حال کی ابتری سے کمیٹی کو بڑا تردد ہے۔ چینی اور روسی عوام جس بہادری سے اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے لڑ رہے ہیں اس کے لئے کمیٹی انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ اس روز بروز بڑھتے ہوئے خطرے کے پیش نظریہ اشد ضروری ہے کہ وہ لوگ جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اور جو لوگ جارحانہ کارروائیوں کے شکار ہونے والوں سے ہمدردی رکھتے ہیں، وہ اتحادیوں کی اب تک کی پالیسی کا جائزہ لیں۔ جس کی وجہ سے انہیں پے بہ پے اور تباہ کن ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے ان پالیسیوں اور طریقوں پر قائم رہ کر کامیاب ہونا ناممکن ہے کیونکہ یہ بات بالکل ظاہر ہوچکی ہے کہ ناکامی ان کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ پالیسی آزادی سے زیادہ محکوم ملکوں پر اپنا تسلط قائم رکھنے اور شہنشاہیت کی روایات اور طریقوں کو جاری رکھنے پر مبنی ہے۔ مقبوضات حکمراں قوموں کے لئے طاقت اور توانائی کا باعث ہونے کے بجائے، ایک بوجھ اور لعنت بن گئے ہیں۔ ہندوستان جدید سامراجیت کا مثالی نمونہ ہے۔ یہی اب اصل عقدہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان

مقصد کے پیش نظر وہ ملک میں نفاق اور انتشار کو تقویت دے رہی ہے ہمارے لئے اور ہم سب ہندوستانیوں کے لئے ملک کا تحفظ اور دفاع مقدّم ہے اور اسی پیمانے سے ہم چیزوں کو جانچتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ اپنا خط شائع کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔ اگر اب ہم بھی اپنا اصل رزولیوشن اور وہ خطوط شائع کردیں جو آپ نے ہمیں اور ہم نے آپ کو لکھے۔

مخلص ابوالکلام

ہندوستان چھوڑ دو

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء کے رزولیوشن پر بہت توجہ سے غور کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ان واقعات پر غور کیا جو بعد میں رونما ہوئے ہیں مثلاً جنگ کی صورت حال، برطانیہ کے ذمہ دار لوگوں کے بیانات اور وہ تبصرے اور تنقیدیں جو ہندوستان میں اور ہندوستاں کے باہر کئے گئے ہیں۔ کمیٹی اس رزولیوشن کو پسند کرتی ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے۔ کمیٹی کی رائے ہے کہ اس کے بعد سے اب تک رونما ہونے والے واقعات نے اس رزولیوشن کو حق بجانب ثابت کیا ہے اور یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ

اس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی دوبارہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کا پر زور مطالبہ کرتی ہے. ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے بعد ایک عارضی حکومت بن جائے گی اور آزاد ہندوستان اتحادیوں کا حلیف بن کر آزادی کی مشترکہ جدو جہد کی آزمائشوں اور مصیبتوں میں برابر کا شریک بن جائے گا. چونکہ عارضی حکومت ملک کی اہم جماعتوں کے اشتراک اور تعاون ہی سے بن سکتی ہے اس لئے یہ ہندوستان کے سارے فرقوں اور گروہوں کی مخلوط حکومت ہوگی.

اس حکومت کا اولین مقصد یہ ہونا چاہئے، کہ یہ اپنی فوجی طاقت اور اہنسا کی قوت کو بروئے کار لا کر اتحادیوں کے ساتھ ہندوستان کی حفاظت کرے اور کھیتوں، کارخانوں اور دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی فلاح و بہبودی اور ترقی کا انتظام کرے کیونکہ یہ محنت کش ہی اقتدار اور اختیار کے اصل مالک ہیں. عارضی حکومت ایک مجلس دستور ساز کی اسکیم بنائے گی. یہ مجلس حکومت ہند کے لئے ایک ایسا دستور مرتب کرے گی جو ملک کے ہر طبقے کے لئے قابل قبول ہو. کانگریس کا نظریہ یہ ہے کہ اس دستور کو وفاقی ہونا چاہئے جس میں وفاق کی ہر اکائی کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اور یہ اکائیاں ہی بقیہ غیر مندرج اختیارات کی مالک ہوں. جہاں تک ہندوستان اور اتحادی اقوام کے درمیان مستقبل کے تعلقات کا سوال ہے، یہ ممالک باہمی گفت و شنید کے ذریعہ ایسی شکل نکال لیں گے جس میں سب کے لئے بہتری ہو اور جو دفاع کے

کی آزادی وہ کسوٹی ہے جس پر برطانیہ اور اقوام متحدہ کو پرکھا جائے گا اس کی آزادی ایشیائی اور افریقی قوموں کو امید اور ولولوں سے لبریز کر دے گی۔ غرض کہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ایک ایسا بنیادی اور فوری مسئلہ ہے جس پر جنگ کے مستقبل کا اور جمہوریت اور آزادی کی کامیابی کا دارو مدار ہے۔ آزادی کی اس جد و جہد میں آزاد ہندوستان نازیزم، فاشزم اور سامراجیت کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف اپنے عظیم وسائل کو بروئے کار لا کر آزادی کا ضامن بن جائے گا۔ اس کا اثر جنگ کے مادی حالات پر ہی نہیں پڑے گا، بلکہ اس کی وجہ سے اقوام متحدہ کو ساری محکوم اور مظلوم انسانیت کی حمایت حاصل ہو جائے گی اور اس طرح ان اقوام کو جن کے ساتھ ہندوستان بھی ہوگا دنیا کی اخلاقی اور روحانی قیادت مل جائے گی۔ ہندوستان اگر غلام رہا تو برطانوی سامراجیت کی نشانی باقی رہے گی اور اس بدنما دھبے کا اثر اقوام متحدہ کے مستقبل پر پڑے گا۔

چنانچہ موجودہ خطرات کا فوری تقاضہ ہے کہ ہندوستان آزاد کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کو ختم کیا جائے۔ مستقبل کے بارے میں کوئی بھی یقین دہانی یا وعدہ موجودہ صورتِ حال کو نہیں بدل سکتا اور نہ ان خطروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان وعدوں سے عوام کے دماغوں پر وہ نفسیاتی اثر نہیں پڑ سکتا جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ صرف آزادی کی حرارت ہی ان کروڑوں انسانوں کے دلوں کو گرما سکتی ہے اور اُس بے پناہ قوت کو رہا کر سکتی ہے جو فوراً اس جنگ کی ماہیت کو بدل دیگی۔

دنیا میں امن وامان قائم رکھے گی۔ اور جارحانہ کاروائیوں کا سدباب کرے گی۔

آزاد ہندوستان ایسے عالمی وفاق میں بخوشی شریک ہوگا اور بین‌الاقوامی مسائل کے حل کے لئے دوسرے ممالک سے پورا تعاون کریگا۔

اس وفاق میں شامل ہونے کا ہر اُس ملک کو حق ہوگا جو اس کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتا ہو لیکن موجودہ جنگ کے پیش نظر فی‌الحال یہ وفاق صرف اقوام متحدہ پر مشتمل ہونا چاہئیے یہ قدم اگر اس وقت اٹھایا گیا تو نہ صرف جنگ پر بلکہ محوری ملکوں کے عوام اور مستقبل کے امن پر اس کا بہت گہرا اثر پڑیگا۔

بہر حال کمیٹی کو بہت افسوس ہے کہ جنگ کے المناک اور تباہ کن سبق کے بعد بھی اور ان خطرات کے باوجود جو اس وقت دنیا کو درپیش ہیں، چند ملکوں کی حکومتیں اس وقت ایک عالمی وفاق کی طرف یہ ناگزیر قدم اُٹھانے پر تیار ہیں۔ برطانوی حکومت کے تاثرات اور بیرونی ممالک کی غلط تنقیدوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندوستان کی آزادی جیسا صریحی مطالبہ بھی تسلیم کرنے پر لوگ آمادہ نہیں ہیں اگرچہ اس مطالبے کا اولین مقصد ہندوستان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ موجودہ خطرے کا مقابلہ کرسکے، اپنے دفاع کا انتظام کرسکے اور اس آڑے وقت چین اور روس کی مدد کرسکے۔ کمیٹی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی ہے جس سے اقوام متحدہ کی مدافعانہ

مشترکہ کام کو تعاون کے ساتھ انجام دینے میں معاون ثابت ہو.
ہندوستان آزاد ہوا تو وہ زیادہ موثر طریقے سے حملے کی
مدافعت کر سکے گا کیونکہ اس کے پیچھے عوام کی متحدہ قوت
اور خواہش ہوگی.

ہندوستان کی آزادی اُن ایشیائی ملکوں کے لئے آزادی کا
نشان اور پیش خیمہ ہوگی جو دوسرے ممالک کے زیر اقتدار ہیں
برما، ملایا، انڈوچین، ایران اور عراق کو بھی آزادی ملنی چاہئے.
یہ بات بالکل واضح ہو جانی چاہئے کہ وہ ممالک جو اس وقت
جاپانیوں کے قبضے میں ہیں، جنگ کے بعد دوسری سامراجی طاقتوں
کے اقتدار میں نہیں منتقل ہوجائینگے.

اگرچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے ہندوستان کی آزادی
اور اس خطرے کے وقت ملک کا دفاع مقدّم ہے لیکن اس کمیٹی
کی رائے ہے کہ مستقبل کے امن، تحفظ اور دنیا کی منظم ترقی
کے لئے ایک ایسے عالمی وفاق کی ضرورت ہے جس میں ساری
آزاد قومیں شامل ہوں دور جدید کے مسائل کا اس کے علاوہ
کوئی حل نہیں ہے. یہ عالمی وفاق ممبر ملکوں کی آزادی، جارحانہ
کارروائیوں کے دفاع، قومی اقلیتوں کے تحفظ، پس ماندہ ممالک
کی ترقی اور ساری دنیا کے وسائل کو یکجا کرکے سب ملکوں
کے مشترک مفاد کے لئے بروئے کار لانے کا ضامن ہوگا. اس
عالمی وفاق کے قیام کے بعد سارے ممالک میں اسلحہ کی تخفیف
عملاً ممکن ہو جائیگی، فوجوں، سمندری بیڑوں اور ہوائی دستوں
کی کوئی ضرورت نہ رہ جائیگی اور ایک عالمی دفاعی فوج ساری

پر مسلط ہے اور جو اُسے ملک کے اور انسانیت کے مفاد میں عمل پیرا ہونے سے باز رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ کمیٹی ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کے پیدائشی حق کو ثابت کرنے کے لئے عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق وسیع پیمانے پر عوامی جدوجہد شروع کرنے کی اجازت دیتی ہے تاکہ ملک اپنی پچھلی بائیس سال کی پرامن جدوجہد میں حاصل کی ہوئی اہنسا کی قوت کو بروئے کار لاسکے یہ جدوجہد لازمی طور پر گاندھی جی کی قیادت میں ہوگی۔ کمیٹی اُن سے درخواست کرتی ہے کہ وہ قوم کی قیادت کرنا قبول کریں اور اس سلسلے میں مناسب اقدام تجویز کریں۔

کمیٹی ہندوستان کے عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ آنے والے خطروں اور صعوبتوں کا ہمت اور صبر کے ساتھ مقابلہ کریں اور تحریک آزادی کے تربیت یافتہ سپاہیوں کی طرح ہدایات پر عمل کریں انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ اُن کی جدوجہد کی بنیاد عدم تشدد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب ہدایات جاری کرنا یا انھیں عوام تک پہنچانا ممکن نہ ہو، اور کوئی کانگریس کمیٹی کام نہ کرسکتی ہو ایسی صورت میں ہر مرد اور عورت کو جو اس جدوجہد میں شریک ہے، عام ہدایات کے اندر رہ کر اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا چاہئے اس طویل اور دشوار سفر میں جس کے درمیان دم لینا ناممکن ہے اور جو بالآخر ہمیں نجات اور آزادی کی منزل تک پہنچائیگا، ہر ہندوستانی کو خود اپنا رہبر بننا پڑیگا۔

استعداد میں کسی طرح کی کمی واقع ہو یا جس سے چین اور روس کے دفاع میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔ ان ملکوں کی آزادی گراں بہا ہے اور اس کی حفاظت اشد ضروری ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہندوستان اور ان ملکوں کے لئے خطرہ روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ ایک بیرونی حکومت کی اطاعت اور بے عملی کی وجہ سے ہندوستان پست ہوتا جارہا ہے اور اس کی مدافعانہ استعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ اس صورت سے نہ بڑھتے ہوئے خطرات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اقوام متحدہ کے عوام کی خدمت کی جاسکتی ہے۔

اب تک برطانیہ اور اقوام متحدہ پر کمیٹی کی مخلصانہ اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے بلکہ بہت سے بیرونی ممالک میں جو تبصرے ہوئے ہیں ان سے ہندوستان اور دنیا کی ضرورتوں سے ناواقفیت اور ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کی طرف اُس معاندانہ روّیے کا اظہار ہوتا ہے جو نسلی برتری اور بے جا تسلط قائم رکھنے والی ذہنیت کا خاصّہ ہے۔ یہ ذہنیت ایک ایسی قوم کے لئے ناقابل برداشت ہے جو خوددار ہے اور جسے اپنی قوت اور اپنے مطالبے کے حق بجانب ہونے پر پورا اعتماد ہے۔

دنیا کی آزادی کے مفاد کے پیش نظر آل انڈیا کانگریس کمیٹی ایک بار پھر برطانیہ اور اقوام متحدہ سے اپیل کرتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی کمیٹی یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ عوام کو ایک ایسی تحکم پسند اور سامراجی حکومت کے خلاف اپنے عزم اور ارادے کے اظہار سے باز رکھنے کا کوئی جواب نہیں ہے جو اس

کہ اختیار کی منتقلی ہندوستان کے لوگوں کی مرضی کے مطابق ہو، یہ کام بہت آسان ہوجاتا اگر ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے درمیاں اتفاق ہوتا چونکہ ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے اس لئے ہز مجسٹی کی حکومت پر یہ فرض عائد ہوگیا ہے کہ ایسا طریقہ دریافت کرے جس سے ہندوستان کے لوگوں کی خواہش معلوم کی جاسکے۔ ہز مجسٹی کی حکومت نے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے پورے طور پر مشورہ کرنے کے بعد اس پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

«ہز مجسٹی کی حکومت یہ بات صاف کردینا چاہتی ہے کہ اس کا منشا ایسا دستور بنانا نہیں ہے جو آخری اور قطعی حیثیت رکھتا ہو۔ یہ معاملہ ہندوستانیوں کے آپس میں طے کرنے کا ہے اور اس پلان میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو مختلف فرقوں کے درمیان ہندوستان کو متحد رکھنے کے متعلق گفتگو میں مانع ہو»

٤۔ ہز مجسٹی کی حکومت کا یہ منشا نہیں ہے کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی کے کام کو روک دے اب چونکہ مخصوص صوبوں کے متعلق جن کی تفصیل نیچے درج ہے انتظام کیا جا چکا ہے، ہز مجسٹی کی حکومت امید کرتی ہے کہ اس اعلان کے نتیجے کے طور پر ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے جن کے نمائندوں کی اکثریت دستور ساز اسمبلی کے کام میں شریک ہے اب اس کام میں پوری شرکت کریںگے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اسمبلی جو قانون بنائے گی وہ ملک کے ان حصوں میں نافذ نہیں ہوگا جو اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ہز مجسٹی کی حکومت

کمیٹی نے مستقبل کے آزاد ہندوستان کی حکومت کے بارے میں اپنا نظریہ صاف بیان کردیا ہے لیکن وہ یہ بھی واضح کردینا چاہتی ہے کہ اس جدوجہد کے شروع کرنے سے اس کا یہ قطعی مقصد نہیں ہے کہ کانگریس کو اقتدار حاصل ہو۔ اقتدار جب بھی حاصل ہوا، سارے ہندوستان کی ملکیت ہوگا۔

برطانوی حکومت کا ۳ جون کا بیان

۱ ۔ فروری سنہ ۱۹۴۷ء کو ہز مجسٹی کی حکومت نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ جون سنہ ۴۸ء تک برطانوی ہند میں حکومت کا اختیار ہندوستانیوں کو منتقل کردے گی۔ ہز مجسٹی کی حکومت کو امید تھی کہ ملک کی بڑی پارٹیاں کیبنٹ مشن کے ۱٦ مئی سنہ ۴٦ء کے پلین کے مطابق عمل کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرینگی اور ہندوستان کے لئے ایک دستور مرتب ہوجائیگا جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔

۲ ۔ مدراس، بمبئی، یو پی، بہار، سی پی اور برار آسام اوڑیسہ، شمال مغربی سرحدی صوبے کے نمائندوں کی اکثریت اور دہلی اجمیر، میرواڑہ اور کورگ کے نمائندوں نے نیا دستور مرتب کرنے کا کام خاصی مقدار میں کرلیا ہے۔ دوسری طرف مسلم لیگ پارٹی نے جس میں بنگال پنجاب اور سندھ کے اکثر نمائندے اور برطانوی بلوچستان کا نمائندہ شامل ہے، فیصلہ کیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوگی۔

۳ ۔ ہز مجسٹی کی حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے

۷۔ مناسب ہوگا کہ تقسیم کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے ہر حصے کے نمائندوں کو معلوم ہو کہ اگر بعد میں متحد رہنے کا فیصلہ کیا گیا تو صوبہ مجموعی طور پر کس قانون ساز اسمبلی میں شریک ہوگا. اس لئے اگر دونوں میں سے کسی قانون ساز اسمبلی کے ممبر اس کا مطالبہ کریں تو یورپین ممبروں کو چھوڑ کر قانون ساز اسمبلی کے باقی تمام ممبروں کا ایک اجلاس ہوگا جس میں اس معاملے کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا کہ اگر دونوں حصے متحد رہنے کا فیصلہ کریں تو صوبہ مجموعی اعتبار سے کس قانون ساز اسمبلی میں شامل ہوگا.

۸۔ اگر یہ فیصلہ ہوگیا کہ تقسیم کی جائے گی تو قانون ساز اسمبلی کا ہر ایک حصہ ان علاقوں کی طرف سے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے طے کرے گا کہ پیرا نمبر ۴ میں جو دو صورتیں تجویز کی گئی ہیں ان میں سے کس کو اختیار کرے گا.

۹۔ بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر دو حصوں میں جن میں سے ایک مسلم اکثریت کے ضلعوں کی اور دوسرا غیر مسلم اکثریت کے ضلعوں کی نمائندگی کرتا ہوگا، تقسیم کے مسئلے کا فیصلہ کرنے کے فوری مقصد کے لئے اجلاس کریں گے. یہ ایک ابتدائی اور بالکل وقتی کارروائی ہے کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان صوبوں کی آخری اور قطعی تقسیم کے لئے حد بندی کے مسئلوں کی تفصیلی تحقیق ضروری ہوگی اور جیسے ہی تقسیم کے متعلق فیصلہ ہوجائے گا ویسے ہی ان صوبوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک حد بندی کمیشن مقرر کیا جائے گا جس کی رکنیت

کو اطمینان ہے کہ جو طریق کار نیچے درج کیا جارہا ہے۔ وہ ایسے علاقے کے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ ان کا دستور:

(الف) موجودہ دستور ساز اسمبلی میں مرتب کیا جائے گا یا

(ب) ایسی نئی اور جداگانہ دستور ساز اسمبلی میں جو ان علاقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی جنہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہ ہوں گے

جب ایسا کرلیا جائے گا تو یہ تعین کرنے کا امکان ہوجائے گا کہ اختیار کس مقتدر جماعت یا جماعتوں کو منتقل کیا جائے گا

۵ ۔ بنگال اور پنجاب کی صوبجاتی قانون ساز مجلسوں سے جن میں ان کے یورپین اراکین شامل نہ ہوں گے کہا جائے گا کہ وہ اپنے دو حصے کرلیں، ایک وہ جو مسلم اکثریت کے ضلعوں پر مشتمل ہو اور دوسرا جو صوبے کے بقیہ حصے کے نمائندوں پر. ضلعوں کی آبادی کا تعین کرنے کے لئے سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد سند مانے جائیں گے . اس اعلان کے ساتھ ضمیمے کے طور پر ان دونوں صوبوں کے وہ ضلع درج ہیں جہاں مسلم اکثریت ہے.

۶ ۔ دونوں صوبوں میں سے ہر ایک کی قانون ساز مجلس کے دونوں حصوں کے اراکین جن کا اجلاس الگ الگ ہوگا اس بارے میں رائے دینے کے مختار بنائے جائیں گے کہ صوبہ تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے. اگر کسی حصے کی اکثریت تقسیم کے حق میں فیصلہ کرے تو صوبہ تقسیم کیا جائے گا اور اسی کے مطابق انتظام ہوگا.

میں درج کئے ہوئے دونوں طریق کار میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں. استصواب گورنر جنرل کی سرپرستی اور صوبجاتی حکومت کے مشورے سے عمل میں آئے گا.

۱۲ ـ برطانوی بلوچستان نے ایک نمائندے کا انتخاب کیا ہے مگر وہ موجودہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوا ہے. اس کے جغرافیائی مقام کی وجہ سے اس صوبے کو بھی اس کا موقع دینا ہوگا کہ اپنی حیثیت پر دوبارہ غور کرے اور پیراگراف ٤ میں درج کئے ہوئے طریق کار میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے. ہز اکسی لنسی گورنر جنرل غور کررہے ہیں کہ اس کے لئے بہترین صورت کیا ہوگی.

۱۳ ـ اگرچہ آسام بیشتر غیر مسلم صوبہ ہے، سلہٹ کا ضلع جو بنگال سے ملا ہوا ہے بیشتر مسلم آبادی پر مشتمل ہے. اس کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر بنگال تقسیم کیا جائے تو سلہٹ کو بنگال کے مسلم حصے میں شامل کردیا جائے اس لئے اگر یہ طے کیا گیا کہ بنگال تقسیم ہوگا تو سلہٹ ضلع میں گورنر جنرل کی سرپرستی میں اور آسام کی صوبجاتی حکومت کے مشورے سے اس مسئلے کو طے کرنے کے لئے استصواب کیا جائے گا کہ سلہٹ کا ضلع صوبہ آسام میں شامل رہے یا مشرقی بنگال کے نئے صوبے میں ضم کردیا جائے. اس کے بعد ایک حد بندی کمیشن قائم کیا جائے گا جس کے اختیارات اور فرائض ویسے ہی ہوں گے جیسے کہ پنجاب اور بنگال کے حد بندی کمیشن کے، تاکہ وہ سلہٹ ضلع کی مسلم اکثریت کے علاقے اور اس سے متصل ضلعوں کے

اور اختیارات و فرائض متعلق لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد طے کئے جائیں گے۔ اس کمیشن کو ہدایت دی جائے گی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کی حد بندی متصل مسلم اور غیر مسلم اکثریت کی بنیاد پر کردے۔ اسے اس کی ہدایت بھی دی جائیگی کہ وہ معاملے کے دوسرے پہلوؤں کا بھی لحاظ رکھے۔ اسی قسم کی ہدایتیں بنگال کے حد بندی کمیشن کو دی جائے گی۔ جب تک کہ حد بندی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق عمل در آمد نہ ہوجائے گا تب تک وہ حدیں جو ضمیمہ میں بتائی گئیں ہیں وقتی طور پر صحیح سمجھی جائیں گی۔

۱۰۔ سندھ کی قانون ساز اسمبلی جس میں یوروپین ممبر شامل نہ ہوں گے اپنے ایک خاص اجلاس میں طریق کار کی ان دونوں صورتوں کے متعلق فیصلہ کرے گی جو پیرا ۴ میں درج ہیں۔

۱۱۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کی صورت حال سب سے الگ ہے اس صوبے کے ۳ نمائندوں میں سے ۲ موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہیں، لیکن صوبے کی جغرافیائی مقام اور دوسری باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہے کہ اگر پورے پنجاب یا اس کے کسی حصے نے فیصلہ کیا کہ وہ موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہ ہوگا تو اس کی ضرورت ہوگی کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کو اپنی حیثیت کے متعلق غور کرنے کا دوبارہ موقع دیا جائے۔ اس لئے اگر ایسی صورت پیش آئی تو ان لوگوں سے جنہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے کی موجودہ قانون ساز مجلس کا انتخاب کیا ہے استصواب کیا جائے گا کہ پیراگراف ۴

کے سلسلے میں حسب ذیل فریقوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جلد از جلد شروع کرنا ہوگا.

(الف) نمائندوں اور متعلق مقتدر جماعت جو اختیارات کی وارث ہوگی ان تمام امور کے بارے میں، بشمول دفاع، مالیات اور رسل و رسائل، جو اس وقت مرکزی حکومت کے ذمے ہیں.

(ب) مختلف مقتدر جماعتیں جو اختیارات کی وارث ہوں گی ان کے اور ہر مملکت کی حکومت کے درمیاں ایسے مسائل کے متعلق معاہدے کرنے کی غرض سے جو اختیارات کی منتقلی کے سبب سے پیدا ہوں.

(ج) جو صوبے تقسیم ہوں ان میں صوبجاتی نظام حکومت سے متعلق امور کے بارے میں، جیسے کہ اثاثہ اور قرض، پولیس اور دوسری ملازمتیں، ہائی کورٹ، صوبجاتی ادارے وغیرہ.

١٧ - ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے قبیلوں سے وہ مقتدر جماعت معاہدے کرے گی جو موجودہ حکومت کی وارث ہو.

١٨ - ہر مملکت کی حکومت اس بات کو صاف کردینا چاہتی ہے کہ مندرجہ بالا فیصلوں کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہے. اور ہندوستانی ریاستوں کے متعلق اس کی پالیسی جو کیبنٹ مشن کے ١٢ مئی سنہ ٤٦ء کے میمورنڈم میں بیان کی گئی ہے تبدیل نہیں ہوئی ہے

١٩ - یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ کارروائیاں جن کا اوپر ذکر آیا ہے جلد سے جلد مکمل کرلی جائیں تاکہ وہ مقتدر جماعتیں

مسلم اکثریت کے علاقوں کی حدیں مقرر کردے اور حب یہ حدیں مقرر ہوجائیں گی تو پورا علاقہ مشرقی بنگال میں شامل کردیا جائے گا. صوبہ آسام کا باقی حصہ بہرحال موجودہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوتا رہے گا.

۱۴ ۔ اگر یہ طے ہوا کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کردیا جائے تو نئے انتخابات ضروری ہوں گے تاکہ یہ صوبے اپنے نمائندوں کو اس اصول کے مطابق جو کیبنٹ مشن کے ۱۶ مئی سنہ ۴۶ء کے پلین میں درج ہے ہر دس لاکھ پر ایک نمائندہ منتخب کرسکے. ایسا ہی انتخاب سلہٹ میں کرانا ہوگا اگر یہ طے ہوا کہ یہ ضلع مشرقی بنگال کا ایک حصہ بنایا جائے گا. ہر علاقے کو حسب ذیل تفصیل کے مطابق نمائندے منتخب کرنے کا حق ہوگا.

صوبے	عام	مسلم	سکھ	میزان
سلہٹ ضلع	۱	۲	×	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	×	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	×	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

۱۵ ۔ ان مختلف علاقوں کے نمائندے ان ہدایات کے مطابق جو ان کو دی جائے گی یا تو موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے یا ایک نئی دستور ساز اسمبلی بنے گی جو ان نمائندوں پر مشتمل ہوگی.

۱۶ ۔ جس قسم کی بھی تقسیم طے پائے اس کے انتظامی نتائج

عمل کرنے کے طریق کار اور دوسرے مسائل کے متعلق حسب ضرورت اعلانات شائع کرتے رہیں گے۔

پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کے ضلعے سنہ ١٩٤١ء کی مردم شماری کے مطابق حسب ذیل ہیں

١ پنجاب

لاہور ڈیویژن : گوجرانوالہ ، گورداس پور ، لاہور ، شیخو پورہ ، سیالکوٹ۔

راولپنڈی ڈیویژن اٹک ، گجرات ، جہلم ، میانوالی ، راولپنڈی ، شاہ پور

ملتان ڈیویژن : ڈیرہ غازی خاں ، جھنگ ، لائل پور ، مونٹ گومری ، ملتان ، مظفر گڈھ۔

٢ بنگال

چٹاگانگ ڈیویژن چٹاگانگ ، نواکھالی ، پتیرہ۔

ڈھاکہ ڈیویژن : باقر گنج ، ڈھاکہ ، فرید پور ، میمن سنگھ

پریسی ڈنسی ڈیویژن : جیسور ، مرشد آباد ، ندیا

راج شاہی ڈیویژن۔ بوگرا ، دیناج پور ، مالدہ ، پابنہ راجشاہی ، رنگ پور

جو موجودہ حکومت کی وارث ہوں گی اپنے آپ کو اختیارات لے
لینے کے قابل بناسکیں وقت بچانے کے لئے مختلف صوبے یا صوبوں
کے حصے جہاں تک ممکن ہوگا اس پلین کی شرائط پر الگ الگ
عمل کریں گے۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی اور نئی دستور ساز اسمبلی
(اگر وہ بنائی گئی) اپنے متعلق علاقوں کے لئے دستور مرتب کرنا
شروع کردیں گی۔ ظاہر ہے کہ اپنے لئے قاعدے وہ خود بنائیں گی۔

۲۰ ۔ ملک کی بڑی سیاسی پارٹیوں نے بار بار اپنی اس خواہش
کو اصرار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں اختیارات کی
منتقلی جلد سے جلد عمل میں آجانا چاہئے۔ ہز مجسٹی کی حکومت
کو اس خواہش سے پوری ہمدردی ہے اور وہ اس پر رضا مند
ہے کہ جون سنہ ۴۸ ء کی جگہ اس سے پہلے کی کوئی تاریخ
آزاد ہندوستانی حکومت یا حکومتوں کے قیام کے لئے متعین کر کے
اختیارات کی منتقلی عمل میں لے آئے۔ یہ سمجھ کر کہ اس خواہش
کو جلد سے جلد پورا کرنے کا واحد عملی طریقہ یہی ہے ہز مجسٹی
کی حکومت کا ارادہ ہے کہ اسی سشن میں اسی سال ڈومینین
اسٹیٹس کی بنیاد پر ایک یا دو مقتدر جماعتوں کو (جو اس اعلان
کے مطابق فیصلہ کرنے سے قائم ہوں گی) اختیارات منتقل کرنے
کے لئے قانونی تجویز پیش کرے۔ اس کارروائی کا ہندوستان کی
دستور ساز اسمبلیوں کے اس حق پر کوئی اثر نہ ہوگا کہ وہ
مناسب وقت پر طے کریں کہ ہندوستان کا وہ حصہ جس میں انہیں
اختیار ہے برطانوی کامن ولتھ میں شامل رہے یا نہ رہے۔

ہز اکسی لنسی گورنر جنرل وقتاً فوقتاً مندرجہ بالا انتظامات پر

اشاریہ

COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS
NEW DELHI